اردو لسانیات میں مولوی عبدالحق کا مقام

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو

2004ء

مقالہ نگار

قمر عباس

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

سابق صدر شعبہ اقبالیات

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

Reg. No. 90 - PBK - 0070

Roll No. I 8901761

F. No. 1 - 3/95 - AR (Ac - II) فائل نمبر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

اردو لسانیات میں مولوی عبدالحق کا مقام

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو

2004ء

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

سابق صدر شعبہ اقبالیات

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالہ نگار

قمر عباس

سکالر پی ایچ ڈی اردو

Reg. No: 90-PBK-0070

Roll No: I 8901761

لیٹر نمبر **F.NO. 1-3/95-AR(Ac-II)**

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

فہرست

☆☆☆

مقدمہ

اردو کے لیے سرسید احمد خان نے جو خواب دیکھا تھا مولوی عبدالحق کی اردو کے لیے خدمات کی صورت میں اس خواب نے تعبیر پائی۔انہوں نے اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ہر طرف سے منہ موڑ لیا اور اپنی زندگی کو اردو کے لیے وقف کر دیا۔انہوں نے اردو کی بقا کے لیے پُر خار وادی میں قدم رکھا اور پھر اس طرح اردو کے لیے سینہ سپر ہو گئے کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔انہوں نے اردو کے فروغ اور اس کے تحفظ کے لیے جو کوششیں کیں اُن کا عملی ثبوت ان کی تصنیفات و تالیفات سے ملتا ہے۔انہوں نے اردو زبان و ادب کے تقریباً ہر شعبے گراں بہا خدمات سرانجام دیں اور اردو زبان کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی تحقیقات کے ذریعے عملی کوششیں کیں۔خصوصاً اُن کے لسانی نظریات اپنے اندر سوچ کی پختگی اور زبان کی بے لوث خدمت کا انداز رکھتے ہیں۔

اردو لسانیات کے حوالے سے انہوں نے اردو کے آغاز و ارتقاء،اردو لغت نویسی، اردو قواعد نگاری، اردو اصطلاحات سازی، کے سلسلہ میں تحقیقی خدمات سرانجام دیں۔اردو زبان کے آغاز اور نشوونما کے بارے میں ان کے نظریات زیادہ تر ان کے خطبات اور مقدمات میں بیان کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف میں بھی اس حوالے سے اشارے ملتے ہیں۔مولوی عبدالحق سے پہلے کئی محققین نے تحقیق کا موضوع اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کو بنایا ان میں سے زیادہ تر محققین نے علاقائیت کو بنیاد بناتے ہوئے اردو زبان کے آغاز پر بحث کی ہے اور اردو کو اپنے اپنے علاقے کی زبانوں سے ماخوذ قرار دیا ہے۔اس مقالہ میں تمام نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا مولوی عبدالحق کے نظریے سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور پھر اس کی روشنی میں مولوی عبدالحق کے نظریے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کے مزاج پر گہری نظر رکھتے تھے اور انہوں نے اردو زبان کے قواعد مرتب کرنے میں خصوصی دلچسپی لی تاکہ اس زبان کی صحت کو برقرار رکھا جا سکے۔اس حوالے سے اردو زبان کے قواعد ان کی مختلف تصنیفات میں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اردو قواعد کے حوال سے ایک علیحدہ کتاب 'قواعدِ

اردو' مرتب کی جو بعد میں مختلف درجے کے نصابات میں شامل رہی۔ مولوی عبدالحق نے اس قواعدِ اردو کے مقدمہ میں اردو قواعد نگاری کی تاریخ درج کی ہے۔ اس مقالہ میں اس مقدمہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور مولوی عبدالحق کی قواعد نگاری کی خصوصیات کو اردو کی دیگر اہم قواعد کی کتابوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج کیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق سے پہلے اردو لغت نویسی کے حوالے سے کافی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں سے بعض اردو کی با قاعدہ لغات ہیں اور بعض دیگر موضوعات کی کتابوں میں اردو لغت کے حصے شامل کر دیے گئے ہیں۔ ابتداء میں اس حوالے سے زیادہ تر کام مستشرقین نے کیا اور بعد میں اہلِ ہند نے اس کی طرف توجہ دی۔ مولوی عبدالحق نے اردو لغت نویسی کی تاریخ کے بیان کے علاوہ اردو کی ایک معیاری لغت تالیف کرنے کی طرف توجہ دی ۔ اگر چہ اس لغت میں ان کے ساتھ کافی معاونین شامل تھے لیکن اس لغت کی تالیف میں بنیادی کام انہوں نے خود کیا۔ لیکن افسوس یہ لغت مکمل نہ ہو سکی اور اس کا صرف ابتدائی کام شائع ہو سکا۔ اس لغت کی اردو زبان کے حوالے سے کافی اہمیت ہے۔ اس کو اس سے پہلے لکھی جانے والی لغات کو سامنے رکھتے ہوئے تالیف کیا گیا ہے اور ان کی خوبیوں کو سمیٹا اور ان کی خامیوں سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ اس لغت کے حوالے سے انہوں نے اردو لغت نویسی کے لیے رہنما اصول مقرر کیے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کی لغت نویسی کے اثرات اس کے بعد لکھی جانے والی لغات میں واضح طور پر نظر آتے ہیں اور اس لغت کا اردو کی لسانی خدمات میں اہم مقام ہے۔ اس مقالہ میں مولوی عبدالحق کی لغتِ کبیر میں اردو لغت نویسی کی تاریخ کے حوالے سے لکھے گئے مقدمہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور لغتِ کبیر کا اردو کی اہم لغات کے ساتھ تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس لغت کے معیار کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغات کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اُن کی لسانی خدمات کے حوالے سے ان کے خطبات، مقدمات، مکتوبات، تبصروں، تحقیقی مضامین، لغات، کتبِ قواعد اور ان کے فن اور شخصیت پر لکھی گئی کتب اور رسالوں کے خصوصی نمبروں سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان کی لسانی تحقیقات اور اردو زبان کے لیے خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے اردو لسانیات میں مقام اور مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اردو زبان کی خدمت ہی ان کی زندگی کا بنیادی نصب العین تھی اور اردو زبان کو ان کی ذات سے الگ کر کے سمجھنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس مقالے کے بابِ اول میں ان کی شخصیت کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے تاکہ ان کی اردو کے لیے خدمات کو ان کی ذات کے پس منظر میں سمجھا جا سکے۔

کسی تحقیقی کام کے ہر لحاظ سے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔البتہ اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ مولوی عبدالحق کی اردو لسانیات کے حوالے سے خدمات کا تحقیقی جائزہ اس انداز میں پیش کیا جا سکے کہ اردو لسانیات کے حوالے سے اس توانا شخصیت کے عظیم کارناموں کو سامنے لایا جا سکے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر نثار احمد قریشی صدرِ شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی زیرِ سرپرستی مکمل ہو رہا ہے جن کی حوصلہ افزائی تحقیق کے مشکل مراحل کو طے کرنے میں ہمیشہ مدد گار و معاون ثابت ہوئی ہے۔ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی کی رہنمائی اور شفقتوں کا بھی ذکر ضروری ہے جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل کے ہر مرحلہ پر مجھے راہ دکھائی اور ان کی رہنمائی یہ نتیجہ ہے کہ آج یہ مقالہ پیش کرنے کے قابل ہوا ہوں۔اس موقع پر میں اپنے استادِ محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی شفقتوں کا بھی ذکر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے تحقیق کے میدان میں مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔اپنے دوست پروفیسر محمد آصف فاروق شاہ کی محبتوں اور عملی معاونت کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جس کے باعث آج یہ مقالہ اپنی تکمیل کا آخری مرحلہ مکمل کر رہا ہے۔والدین اور تمام اہلِ خانہ کی دعائیں اور تمنائیں بیان کی محتاج نہیں۔

قمر عباس
لیکچرار شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج بھکر
۶ دسمبر ۲۰۰۴ء

مولوی عبدالحق _ حیات اور اردو کے لیے خدمات

مولوی عبدالحق_ حیات اور اُردو کے لیے خدمات

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی شخصیت اور اُردو زبان آپس میں کچھ اس طرح رچی بسی ہوئی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جُدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جب ہم ان کی زندگی کی کہانی پڑھتے ہیں تو ان کی تمام زندگی پر جو چیز چھائی ہوئی نظر آتی ہے وہ اردو زبان کا تحفظ اور اس کی ترقی کی خواہش ہے۔ اسی مقصد کو لے کر وہ آگے بڑھتے ہیں اور اپنا تن من دھن سب کچھ اپنے خواب کی تعبیر پانے کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام ۸ نومبر ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''میری زندگی کا مقصد صرف دنیا میں ایک ہی ہے وہ یہ کہ اُردو کو ترقی ہو اور علمی زبان بن جائے۔''(۱)

مولوی عبدالحق کی تاریخِ پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل ملک (ہاپوڑ) کے مطابق بابائے اردو مولوی عبدالحق کی پیدائش ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو دہلی سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر دور مشہور قصبہ ہاپوڑ میں محلّہ قانون گویاں میں ہوئی۔(۲) ان کے والد کا نام شیخ علی حسین تھا۔(۳) ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تحقیق کے مطابق ان کی پیدائش ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ہوئی۔(۴) مختار الدین احمد اپنی کتاب ''عبدالحق'' میں لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔(۵) ایک بندوق لائسنس کے درخواست فارم کا عکس ماہنامہ 'ہم قلم' کراچی اگست ۱۹۶۲ء کے صفحہ نمبر ۱۵ پر چھپا۔ یہ درخواست فارم مولوی عبدالحق نے خود پُر کیا اور اس میں اپنی تاریخِ پیدائش ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء لکھی۔ چنانچہ یہی تاریخِ پیدائش زیادہ معتبر ہے۔

مختار الدین احمد کے مطابق مولوی عبدالحق سراوہ میں پیدا ہوئے اور ان کا زیادہ تر بچپن بھی وہیں گزرا۔(۶) صوفی عبدالرشید ہاپوڑی جو مولوی عبدالحق کے گھر کے ساتھ رہتے تھے اور ایک طویل عرصہ انہوں نے ان کے ساتھ گزارا، ان کا بیان ہے:

’’ مولوی عبدالحق کی پیدائش ہاپوڑ میں نہیں بلکہ سراوے میں ہوئی جو ہاپوڑ سے ۱۵۔بیس ۲۰ میل دور ایک جگہ تھی۔‘‘ (۷)

جبکہ ان کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن اپنے مضمون ’ابدی بھائی‘ میں اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ میرے دونوں بڑے بھائیوں کی پیدائش ہاپوڑ کی ہے اور جیسا کہ اکثر لکھا گیا ہے کہ بھائی عبدالحق صاحب مرحوم سراوہ جو ہاپوڑ سے ملحق ہے، میں پیدا ہوئے صحیح نہیں۔ یہ بات ہمارے خاندانی رسم ورواج کے خلاف تھی کہ زچگی کا انتظام میکہ میں ہو، اس غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہو کہ والدہ مرحومہ اپنے ماں باپ کی واحد لڑکی اور اپنے بھائیوں کی ایک ہی بہن تھیں۔ ہمارے نانا اور ماموں ان کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے اور ان کا قیام اکثر سراوہ میں رہتا تھا۔ لیکن جہاں تک بھائی صاحب کی پیدائش کا تعلق ہے ان کا مولد ہاپوڑ ہی ہے۔‘‘ (۸)

مذکورہ بالا لائسنس فارم میں خود مولوی عبدالحق نے بھی اپنی جائے پیدائش ہاپوڑ ہی درج کی ہے۔ مولوی عبدالحق کے آباؤ اجداد یہیں رہتے تھے اور ان کے سپرد دورِ مغلیہ میں محکمہ مال کی قانون گوئی کی خدمات تھیں۔ یہ سب ہندو کایستھ برادری سے تعلق رکھتے تھے انہی میں سے ایک صاحب عہد شاہ جہانی میں مشرف بہ اسلام ہوئے (۹) اور شیخ عبدالدائم نام پایا۔ ان کی اولاد شمال مغربی ہند میں، جس کو آج کل اُتر پردیش کہا جاتا ہے، کے تمام اضلاع میں پھیل گئی۔ ان ہی میں سے مولوی عبدالحق کے مورث اعلیٰ شیخ صادق حسین تھے۔ شیخ صادق حسین سے جو سلسلہ چلا اس میں ان کے والد شیخ علی حسن تھے جن کی آٹھ اولادیں ہوئیں، چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔ اولادِ نرینہ میں سب سے بڑے شیخ ضیاالحق تھے اور اس کے بعد مولوی عبدالحق۔ مولوی عبدالحق کے والد شیخ علی حسین ایک طویل مدت تک پنجاب کے محکمہ مال گزاری سے وابستہ رہے اور اسی تعلق کی بنا پر مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم پنجاب میں ہوئی۔ (۱۰) شیخ احمد حسن اپنے مضمون ’ابدی بھائی‘ میں لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کی تعلیم میٹرک تک پنجاب میں ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد ہاپوڑ آ گئے اور مولوی عبدالحق کو علی گڑھ کالج میں داخل کرادیا جہاں سے انہوں نے ۹۵۔۱۸۹۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہ ہاپوڑ کے پہلے شخص تھے جو انگریزی تعلیم کے لیے کالج میں داخل ہوئے۔ (۱۱)

بشیر احمد جو مولوی عبدالحق کے ملازم تھے اور جنہوں نے اُن کی ۴۳ سال خدمت کی، ان کا مکان ہاپوڑ میں مولوی عبدالحق کے مکان کے قریب تھا۔ وہ اُن کی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میری والدہ کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی بھی ہاپوڑ میں ایک معزز خاندان کی لڑکی سے اُن کی والدہ نے طے کر دی۔ جبکہ مولوی صاحب کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ مگر وہ والدہ کی بات کو اس وقت نہ ٹال سکے، اور مجبور ہو گئے۔ لیکن شادی ہی کے دن گھر سے فرار ہو گئے۔ کئی سال تک اُن کی بیوی بیٹھی رہیں، پھر مولوی صاحب نے والدین کے انتقال کے بعد ایک عزیز کو اُن کے مہر کا روپیہ ادا کر کے طلاق دے دی اس مطلقہ خاتون کی شادی بعد میں ممتاز حسن صاحب (ہاپوڑی) سے ہوگئی۔'' (۱۲)

مولوی عبدالحق کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ان کے علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے سے ہوتا ہے۔ دراصل انہیں وہاں پر ایسا ماحول میسر آ گیا تھا جو تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے مثالی تھا۔ اس وقت سرزمینِ علی گڑھ گویا مشاہیر کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ ان میں سرسید احمد خان، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ اور مولانا شبلی کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ اس ماحول میں مولوی عبدالحق کو ذہنی تربیت کے بہترین مواقع ملے۔ مزید خوش نصیبی یہ تھی کہ سرسید اور حالی کی ان پر خصوصی شفقت رہی۔ اس طرح علی گڑھ نے مولوی عبدالحق کو ٹھوس علمی بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد سرسید کے ایماء پر نواب محسن الملک نے ایک خط دے کر مولوی عبدالحق کو حیدر آباد روانہ کیا جہاں اس وقت نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین فنانس منسٹر تھے۔ انہی دنوں نواب افسر الملک بہادر کمانڈر انچیف نواب وقار الملک سے ملنے آئے ان کی ملاقات مولوی عبدالحق سے بھی ہوئی اور انہوں نے اِن کا تقرر ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ کے طور پر کر دیا۔ (۱۳)

افسر الملک کافی ادب دوست آدمی تھے۔ ان کی سرپرستی میں ایک ماہانہ ادبی رسالہ ''افسر'' نکلا کرتا تھا۔ مولوی عبدالحق کے پہنچتے ہی اس کی ادارت افسر الملک نے ان کے سپرد کر دی۔ (۱۴) اس طرح مولوی عبدالحق کی زیرِ ادارت اس رسالے نے کافی اہمیت اختیار کر لی اور اس میں اعلیٰ درجے کے مضامین شائع ہونے لگے۔

۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالحق عارضی طور پر مہتمم تعلیمات اورنگ آباد مقرر ہوئے اور پھر یہ عہدہ انہیں

مستقل طور پر مل گیا۔ اس دوران میں انہیں انجمن ترقی اردو کے جنرل سیکریٹری کی ذمہ داری ملی۔

انجمن ترقی اردو کا قیام جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی میں ہوا۔ پروفیسر ٹامس آرنلڈ کو پہلا صدر اور مولانا شبلی نعمانی کو انجمن کا پہلا جنرل سیکریٹری مقرر کیا گیا (۱۵)۔ اس وقت انجمن کا دفتر علی گڑھ میں قائم کیا گیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے تقریباً ڈھائی سال اپنے عہدے پر کام کیا اور پھر مستعفی ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۰۵ء کو ان کی جگہ نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا (۱۶) اور پھر ۱۹۰۹ء میں اس عہدہ پر مولوی عزیز مرزا کا انتخاب عمل میں آیا (۱۷)۔ عزیز مرزا بھی انجمن ترقی اردو کے لیے اس طرح کام نہ کر سکے جیسی ان سے توقع کی جا رہی تھی۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا۔ اسی اجلاس میں انجمن ترقی اردو کے جنرل سیکریٹری کا انتخاب عمل میں آیا اور مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کے چوتھے جنرل سیکریٹری کے طور پر یہ عہدہ سنبھالا۔ اس وقت وہ مملکتِ حیدرآباد میں صدر مہتمم تعلیمات تھے اس لیے انہوں نے انجمن ترقی اردو کا دفتر بھی علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل کر دیا۔ (۱۸) محمد سخاوت مرزا لکھتے ہیں:

> ''بابائے اُردو نے انجمن ترقی اردو کی مستقل قیام گاہ۔۔۔ روضہ بی بی اورنگ آباد کے بیرونی دوازے پر بنائی جس میں ایک طرف خود رہتے تھے دوسری طرف انجمن کا دفتر تھا۔ شیخ چاند میرے ہم جماعت بابائے اُردو کے ساتھ رہتے تھے جہاں میری ملاقات بزمانہ ملازمت اورنگ آباد ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ اس مقبرے سے کچھ دور پنچہ گٹہ چلے گئے جہاں مرحوم کا قیام تقریباً بیس سال رہا۔ مولوی صاحب مرحوم مناظرِ قدرت کے دلدادہ تھے۔ اس لحاظ سے دکن میں اورنگ آباد سے بہتر مقام آپ کو کوئی نظر نہ آیا۔ آب و ہوا اور مناظرِ قدرت کے پیشِ نظر بعد کو حوض تغلق والے مکان میں منتقل ہو گئے تھے جو دولت آباد اور خلد آباد کے مابین پہاڑیوں میں لبِ تالاب تھا۔ یہیں سے سر راس مسعود کو دعوت دی تھی کہ وہ موسمِ برسات میں ضرور آئیں۔'' (۱۹)

انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہوتے ہی اورنگ آباد اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ یہاں پر دوسری زبانوں سے کئی نایاب کتابیں ترجمہ کر کے اردو میں منتقل کی گئیں۔ دکنی اردو کی قدیم کتابیں منظر عام پر لائی گئیں۔ اصطلاحات پر کام ہونے لگا۔ کئی اہم کُتب کی اشاعت کا بندوبست ہوا۔ ان تمام سرگرمیوں کا مرکز مولوی

عبدالحق کی ذات تھی چنانچہ مقبرہ درانی کے جس باغ میں مولوی عبدالحق کا مکان اور انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا 'اردو باغ' کے نام سے موسوم ہوا۔یہیں پر تعلیمِ بالغاں کا مدرسہ قائم کیا گیا۔اس کے ساتھ ہی مدارس کے لیے جدید نصاب کی فراہمی کا منصوبہ بنایا گیا اور درسی کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کیا گیا۔اردو لغت کے کام کا آغاز ہوا اور کتابوں کی طباعت کے لیے ایک پریس کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس طرح اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے گئے۔

مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کو اپنی ذات کا ایک حصہ بنا لیا۔انہوں نے اپنی تمام جمع پونجی انجمن کے لیے وقف کر دی اور دن رات اس کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔سید ہاشمی فرید آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''یہ تم نے کیا کہا کہ میں اپنا ذاتی روپیہ کیوں بے دردی سے انجمن پر خرچ کر رہا ہوں۔ تمہارے بھائی ، یا بیٹے پر خدانخواستہ کوئی وقت آپڑے تو کیا تم اس کی مدد نہ کرو گے اور کیا ایسے وقت میں تم روپیہ کا منہ دیکھو گے۔میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جُدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں اس کا سیکرٹری رہوں یا نہ رہوں۔'' (۲۰)

اسی دور میں مولوی عبدالحق نے دولتِ عثمانیہ کو اردو یونیورسٹی کے قیام پر رضامند کیا۔چنانچہ اس سلسلہ میں ابتدائی اقدامات کے طور پر اورنگ آباد کالج کا قیام عمل میں لایا گیا اور انہوں نے صدر مہتمم تعلیمات اور سیکریٹری انجمن ترقی اردو کے عہدے کے ساتھ ساتھ اس کالج کے پرنسپل کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔انہوں نے اورنگ آباد کالج میں بہترین تعلیمی ماحول کی فراہمی کے لیے بھرپور اقدامات کئے اور کالج کو جدید خطوط پر استوار کیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے حوالے سے دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور مولوی عبدالحق کو اس کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔مولوی عبدالحق اورنگ آباد کو انجمن ترقی اردو کی وجہ سے ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن عثمانیہ یونیورسٹی کا منصوبہ بھی انہی کا تیار کردہ تھا۔پس اس کی کامیابی کی خاطر اور دوستوں کے اصرار پر انہوں نے دارالترجمہ کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔دارالترجمہ کے تحت بہت سی اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے اور اس حوالے سے کڑے معیاروں کو پیشِ نظر رکھا گیا۔انتہائی قابل لوگوں کو اس کام کے لیے مقرر کیا گیا اور مولوی عبدالحق تمام کام کی

خودنگرانی کرتے رہے۔یہیں پر اصطلاحات سازی کا بھی کام شروع کیا گیا اور اردو اصطلاحات کے لیے اصول و ضوابط بنائے گئے۔مختار الدین احمد لکھتے ہیں:

''دارالترجمہ کا کام اپنی نظیر آپ ہے۔اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جو تجویز دارالترجمہ قائم ہونے سے پہلے عمل میں آ چکی تھی وہ ناکام ہو جاتی اگر یہ ادارہ اس تندہی سے اپنا کام انجام نہ دیتا۔مولوی صاحب میں ادبی قیادت کی بے پناہ صلاحیت تھی۔انہوں نے سارے ملک کے اہلِ علم اردو داں حضرات کو یکجا کر کے مصروفِ عمل کر دیا اور اپنی رہنمائی سے اس قافلے کو برابر آگے بڑھاتے رہے۔اہلِ اردو اس بنیادی کام کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔'' (۲۱)

مولوی عبدالحق اورنگ آباد سے حیدر آباد چلے گئے لیکن انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد ہی میں رہنے دیا گیا۔انہوں نے بیک وقت دونوں جگہ اپنی توجہ مرکوز رکھی اور اردو کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔۱۹۲۹ء میں وحیدالدین سلیم صدرِ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ مولوی عبدالحق کو یہ ذمہ داری سنبھالنا پڑی۔

۱۹۳۷ء کی کانگریسی وزارتوں نے انجمن کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا اور اسے تباہ کرنے پر تُل گئیں۔ مولوی عبدالحق نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں دکن میں قیام اور انجمن ترقی اردو کے دکن میں دفتر کی موجودگی سے اردو کے تحفظ و اشاعت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔چنانچہ اس چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انجمن ترقی اردو کو دہلی منتقل کر دیا جائے۔اسی دوران میں حکومت نے 'ودیا مندر سکیم' شروع کی جس کے تحت اردو مخالف سرگرمیاں شروع کر دی گئیں۔اس حوالے سے مولوی عبدالحق نے حکومت کی بھرپور مخالفت کی اور اور حکومت کے کارپردازان سے ٹکر لی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور اردو دشمن پالیسیاں قائم رکھی گئیں۔جلیل قدوائی لکھتے ہیں:

''یہ اُردو کے لیے بڑا پُر آشوب زمانہ تھا۔بابائے اردو' گاندھی جی' راجندر پرشاد' کھیر ٹنڈن وغیرہ سے اُردو ہندی کے مسئلہ پر ٹکر لے رہے تھے۔چنانچہ اُردو کے ہر نمبر میں مرسلہ اخباری تراشوں کی بنا پر لکھے ہوئے بابائے اردو کے بیانات پڑھنے کے قابل ہوتے تھے۔'' (۲۲)

بالآخر انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی میں منتقل کر دیا گیا۔اس کے بعد بھی مولوی عبدالحق کچھ عرصہ تک

جامعہ عثمانیہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے لیکن بعد میں انجمن ترقی اردو پر بھرپور توجہ دینے کی خاطر انہوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور مستقل طور پر دہلی آ گئے۔

دہلی میں آ کر مولوی عبدالحق نے اردو کے لیے اپنی جدو جہد تیز کر دی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دہلی ہندوستان کا مرکز ہے اور یہاں رہتے ہوئے زیادہ بہتر انداز میں کام کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ دہلی اردو کے حوالے سے بھی اہم مقام رکھتا ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جس کو وہ اردو کا مولد قرار دے چکے تھے۔ چنانچہ دہلی میں رہتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اردو زبان کو رواج دینے اور اس کو جائز مقام دلانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ صوبہ سرحد میں اُردو کے فروغ کے سلسلہ میں غلام رسول مہر کے نام اپنے ۲ جولائی ۱۹۴۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''سرحد سے مجھے روپیہ وصول کرنے کی زیادہ تمنا نہیں۔ اصل مدعا یہ ہے کہ وہاں اردو کو فروغ ہو۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ صوبے کی تعلیم میں اردو کی کیا حیثیت ہے اور اس کی ترقی و اشاعت کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ انجمن کی ریڈریں وہاں رائج ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ وہاں کے ہمدرد اصحاب ہماری جو مالی مدد کریں گے ہم وہ سب رقم بلکہ اس سے زیادہ ان کے صوبے میں اشاعتِ اردو پر صرف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ وہاں مخلص کام کرنے والے مل جائیں۔'' (۲۳)

جب انجمن ترقی اردو کو دہلی منتقل کیا گیا تو اس وقت تک یہ ایک ننھے سے پودے سے ایک تناور درخت بن چکی تھی۔ مولوی عبدالحق اس کی پرورش کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر چکے تھے حتیٰ کہ اپنی جوانی بھی۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''انجمن کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا (۱۹۱۳ء) تو اس کا کل اثاثہ ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا۔ مگر اب جو وہ اورنگ آباد سے دہلی آئی (۳۸ء) تو اپنی چھاپی ہوئی کتابوں کے بیسیوں صندوق بھر کر لائی جن کی مالیت کم و بیش ایک لاکھ روپیہ تھی۔ لیکن ان مطبوعات سے بھی زیادہ بیش بہا جناب مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں انگریزی، اُردو، فارسی اور عربی کی ہزاروں اعلیٰ درجے کی علمی کتابیں شامل تھیں۔ صدہا قلمی نسخے تھے، بعض اتنی قدیم اور

نادرالوجود کہ اُن کی نظیر نہ تھی۔''

دلی آ کر مولوی عبدالحق کو اردو کے لیے کئی محاذوں پر کام کرنا پڑا۔ اردو کے فروغ کے لیے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ 'اردو' پہلے ہی سے انجمن ترقی اردو کے تحت نکل رہا تھا لیکن اردو کے حوالے سے سیاسی جھگڑے اس کی ادبی حیثیت کو متاثر کرنے لگے۔ چنانچہ ایک اردو اخبار 'ہماری زبان' جاری کیا گیا جو پندرہ روزہ تھا۔ اس کے علاوہ انجمن نے کتب کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مختلف اردو کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا اور اردو کے فروغ اور تحفظ کے لیے قراردادیں منظور کی گئیں۔

مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کے فروغ کی کوششوں کو ایک تحریک کی صورت دی اور نہ صرف خود اس مقصد کے لیے کام کیا بلکہ دوسری معتبر شخصیات کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلے اور ان کے مشوروں کو ایک خاص اہمیت دی گئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کی تیسری آل انڈیا اردو کانفرنس جنوری ۱۹۴۴ء کو منعقد ہوئی اس موقع پر مولانا عبدالماجد دریابادی کو شرکت کی دعوت دیتے ہوئے ان کے نام ۲۰ دسمبر ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس اجلاس میں اردو زبان و ادب کی اشاعت و ترقی کے متعلق بہت اہم تجاویز پیش ہونے والی ہیں۔ آپ جیسے پختہ خیال اور تجربے کار حامیانِ اردو کے مشورے ان معاملات میں نہایت کارآمد اور کانفرنس کی کامیابی کا موجب ہوں گے۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ اس کانفرنس میں شرکت فرما کر ہمیں اپنے مشورہ اور تجربے سے مستفید فرمائیں۔'' (۲۵)

مولوی عبدالحق اردو کو ہندو مسلم اتحاد کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کے مطابق یہ زبان ان دونوں بڑی قوموں کی مشترکہ کاوشوں کا ثمر ہے۔ دونوں قوموں نے اس چمن کی آبیاری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک دھاگے میں کوئی پرو سکتا ہے تو وہ یہی زبان ہے۔ اس دور میں انہوں نے اردو سے اس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور کوشش کی۔ سر سکندر حیات خاں کے نام ۹ جان ۱۹۴۶ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ زبان اتحاد ہی کی بدولت اور اتحاد ہی کے لیے بنی تھی۔ اب بھی ہم اس کے ذریعے سے رشتہ اتحاد کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کا یہی مسلک ہے اور اب تک وہ اسی پر کاربند ہے۔ اگر خدانخواستہ اُردو کے گڑھ میں رخنہ پیدا ہوگیا تو یہ شیرازۂ اتحاد درہم برہم ہو جائے گا۔'' (۲۶)

لیکن یہ ایسا دور تھا کہ اردو پر ہر طرف سے وار کیا جارہا تھا اور اس کو کچلنے اور ختم کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جارہی تھی۔ مولوی عبدالحق اردو زبان کی مختلف مقامات پر حالتِ زار کو دیکھ کر کُڑھتے تھے اور اس کی بہتری کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے ۳۰ اپریل ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''آپ سے یہ امر مخفی نہیں کہ صوبہ متحدہ میں اردو کتابوں کی تعداد (جیسا کہ گورنمنٹ گزٹ سے ظاہر ہے) ہر سال کم ہوتی جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں ہندی کتابوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے بعض اہل الرائے نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ زبان صوبہ متحدہ میں صرف چند روز کی مہمان ہے۔ ایک ممتاز ہندو لیڈر نے یہ فرمایا کہ اب اُردو زبان کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں۔ ایک دوسرے صاحب نے جو اپنے کو اردو کا دلدادہ کہتے ہیں اور ایک مشہور اردو رسالہ اور اردو اخبار کے اڈیٹر ہیں ازراہِ ہمدردی اس کی عمر صرف دس سال قرار دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس مدت کے بعد یہ زبان اس صوبے میں نہیں رہے گی یا کم سے کم یہاں کی عام زبان نہیں خیال کی جائے گی۔ یہ کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ وہ صوبہ جہاں اردو نے نشوونما اور فروغ پایا اور جہاں اردو کے بہترین ادیب اور شاعر گزرے ہیں اور جہاں زبان اب ٹکسالی سمجھی جاتی ہے اس حالت کو پہنچ گیا۔ یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اس طرف سے غفلت کی جائے۔'' (۲۷)

مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے اردو کے لیے اپنا جہاد جاری رکھے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کا مرحلہ آن پہنچا اور ملک کو ہندوستان اور پاکستان دو آزاد مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور اس آگ کی لپیٹ میں انجمن ترقی اردو کا دفتر بھی آ گیا جسے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دہلی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر کی تباہی کا حال مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محمد داؤد رہبر کے نام ۱۹ نومبر ۱۹۴۷ء کے خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

''دلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوتا ہے۔ ظالم بلوائیوں نے سبھی کچھ لوٹ لیا۔ کتب خانہ تو محفوظ رہا۔ لیکن میرے کام کرنے کے کمرے میں تین الماریاں تھیں۔ ایک بڑی فولادی الماری تھی جس میں میں نے نہایت نادر اور نایاب قلمی نسخے محفوظ کر دیئے تھے، وہ کم بخت یہ سمجھے اِس

میں مال وزر ہوگا۔ ہتھوڑوں سے توڑا جب اُن کی منشاء کے مطابق کچھ نہ نکلا تو کتابیں اور کاغذ اور دوسری کتابیں اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینک دیں اور ڈھیر لگا کر آگ لگانا چاہتے تھے کہ اتنے میں مالکِ مکان آ گیا۔ اُس کی خوشامد درآمد سے باز رہے۔ لیکن مالکِ مکان صاحب نے یہ تمام ڈھیر اور دوسری بہت سی ردّی مکان میں جگہ جگہ ڈال دی۔ کچھ پاخانے اور غسل خانے میں کچھ صحافت خانے میں، کچھ برآمدوں وغیرہ میں، جب سے میں یہاں آیا ہوں ہم کئی شخص روزانہ صبح سے شام تک اِن ردّیوں کے ڈھیروں سے کتابیں اور کاغذ اس طرح چھانٹتے رہتے ہیں جیسے کوئی ریت میں سے سونے کے ذرّے چنتا ہے اور شام کو جب واپس جاتے ہیں تو آدمی سے بھوت بنے ہوتے ہیں۔'' (۲۸)

مولوی عبدالحق نے اس کے بعد بھی انجمن ترقی اردو کو دہلی میں از سرِ نو زندہ کرنا چاہا لیکن اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں خود بھی ہندوستان میں تحفظ نہیں تھا۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر کو سربمہر کر دیا گیا اور کڑی نگرانی شروع کر دی گئی۔ آخر ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ انجمن ترقی اردو کو پاکستان میں منتقل کر دیا جائے اور اس کا دفتر لاہور میں قائم کیا جائے۔ اس حوالے سے میاں بشیر احمد کے نام اکتوبر ۱۹۴۷ء کے خط میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میرا پختہ ارادہ تھا کہ دہلی نہ چھوڑوں گا ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کا بھی تو ہم پر حق ہے، ان کی خدمت مقدم ہے۔ لیکن اب حالات ایسے ناقابلِ برداشت ہو گئے ہیں کہ دہلی کا قیام ناممکن ہو گیا ہے۔ میں نے یہاں اپنے احباب سے مشورہ کیا۔ ہم سب کی یہ رائے قرار پائی کہ اب انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے بشرطیکہ آپ صاحب بھی اس سے اتفاق فرمائیں۔ کام ہم ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کریں گے۔'' (۲۹)

ان مایوس کن حالات کے باوجود مولوی عبدالحق یہ چاہتے تھے کہ ان کا ہندوستان سے رابطہ بحال رہے اور انجمن ترقی اردو وہاں پر بھی اپنی خدمات سرانجام دیتی رہے تاکہ اردو کا دفاع جاری رہے۔ چنانچہ انہوں نے دہلی میں انجمن کے دفتر کو ختم نہ کیا۔ اس حوالے سے عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے ایک خط، جو انہوں نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو لکھا، میں لکھتے ہیں:

''میں تو سدا کا پردیسی ہوں ۔ نہ کبھی گھر بنایا اور نہ گھر میں رہنا نصیب ہوا۔ ایک جھونپڑا تھا سو خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی نہیں ۔ لاہور سے ۳۰ کو کراچی واپس آیا اور ۳۱ کو وہاں سے روانہ ہو کر کل شب یہاں پہنچا۔ دو ر روز بعد یہاں سے پھر کراچی چلا جاؤں گا۔ پاکستان کے مرکز کے افتتاح کے بعد دلّی پہنچوں گا۔ قائداعظم نے ۱۵ اپریل کے بعد کسی تاریخ کو افتتاح کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اب ہندوستان کا مرکز دلی ہوگا اور پاکستان کا کراچی۔'' (۳۰)

خیر خواہانِ اردو کی رائے یہ تھی کہ پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے دفتر کے لیے لاہور موزوں ترین مقام ہوگا۔ علامہ اقبال بھی اس حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کر چکے تھے کہ لاہور ہی ایسا مقام ہے جہاں پر اردو کی ترقی اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے بہترین ماحول موجود ہے۔ خود مولوی عبدالحق پنجاب کو اردو کے حوالے سے مرکزی اہمیت دیتے تھے۔ پنجاب کی اردو کے حوالے سے اہمیت کے بارے میں سر سکندر حیات خاں کے نام ۹ جون ۱۹۴۶ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پنجاب اُردو کا گڑھ ہے اور تقریباً اسی ۸۰ سال سے مسلسل اُردو کی قابلِ قدر خدمت کر رہا ہے اور اس خدمت میں ہندوستان کے سب صوبوں سے پیش پیش ہے۔ اگر وہاں اُردو کی حیثیت میں فرق آیا تو نہ صرف اہلِ پنجاب کو بلکہ ہندوستان کے تمام اُردو داں طبقے کو (جو ملک میں بڑی اہمیت رکھتا ہے) دلی صدمہ پہنچے گا اور ہر صوبے میں اس کے خلاف شورش برپا ہو جائے گی۔ یوں تو ہم میں سینکڑوں اختلافات ہیں، یہاں تک کہ مذہب بھی اس سے نہیں بچا لیکن اُردو کے معاملے میں ہم سب ایک ہیں خواہ کسی خیال اور مشرب کے ہوں۔'' (۳۱)

اس صورت حال میں مولوی عبدالحق نے آخر فیصلہ کیا کہ لاہور میں انجمن کا صدر دفتر قائم کیا جائے چنانچہ اس کے لیے عمارت کی تلاش شروع کر دی گئی۔ اس حوالے سے میاں بشیر احمد کے نام اکتوبر ۱۹۴۷ء کے خط میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں نے جو عمارتیں اور پریس وغیرہ چھوڑے ہیں ان کی تقسیم عمل میں آرہی ہے۔ اگر آپ کے توسط اور عنایت سے ہمیں کوئی اچھا پریس اور ایسا مکان مل جائے جس میں انجمن کا دفتر اور کتب خانہ وغیرہ آسکے تو ہم بخوشی اس کے خریدنے کے لئے تیار

ہیں۔ یہ بہت اچھا موقع ہے، شاید پھر ایسا موقع نہ مل سکے۔ میں نے اس مضمون کا ایک خط میاں افتخار الدین صاحب کو بھی لکھا ہے۔ اگر آپ ازراہِ کرم تکلیف فرما کر اُن سے اس بارے میں گفتگو کر کے کوئی انتظام فرما دیں تو بہت ممنون ہوں گا۔'' (۳۲)

لیکن حالات کچھ عجیب نہج پر جا رہے تھے۔ جب مولوی عبدالحق نے لاہور میں انجمن ترقی اردو کے دفتر کے لیے کوششیں شروع کیں تو انہیں اس کے لیے مناسب جگہ نہ مل سکی اس کے علاوہ لاہور کے اہلِ ادب کا رویہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ مولوی عبدالحق نے محسوس کیا کہ لاہور میں بھی انجمن کے لیے حالات سازگار نہیں۔ اس دوران میں وہ ہندوستان میں دفتر کو ازسرِ نو کھولنے کے لیے وہاں گئے لیکن وہاں کے حالات بھی ان کے موافق نہ تھے اور حکومتِ ہند نے ان کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو لکھے گئے ایک خط میں وہ دہلی سے لکھتے ہیں:

''یہاں آ کر عجب پریشانیوں اور الجھنوں میں پھنس گیا ہوں۔ سی۔ آئی۔ ڈی ہمارے درپے ہے۔ ہمارے تمام کاموں، چلنے پھرنے۔ آنے جانے۔ ملنے جلنے۔ کھانے پینے تک کی نگرانی کی جاتی ہے۔ پولیس ہمارے ملازموں کو طرح طرح سے ستاتی ہے۔ لُوٹ سے جو کتب خانہ اور کچھ کاغذات یا سامان بچ گیا تھا اُسے حکومت نے سربمہر کر دیا ہے اور دو مسلح سپاہی دن رات پہرہ دیتے ہیں تاکہ ہم دونوں جانے نہ پائیں اور جائیں تو کچھ بعید نہیں کہ کوئی بہانہ گھڑ کر یا کوئی جھوٹا الزام تراش (کر) مجھے جیل کی ہوا کھانے کے لئے بھیج دیں۔ اِس کا تجربہ اب تک نہیں ہوا تھا۔ آخر عمر میں یہ بھی ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔ میرا اصلی ارادہ یہ تھا اور اسی غرض سے یہاں آیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ونوں جگہ کام کروں۔ لیکن یہاں کی حکومت کو یہ گوارا نہیں۔'' (۳۳)

آخر کار مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کو کراچی لے گئے اور وہاں پر انہیں اس مقصد کے لیے شاردا مندر کی مناسب عمارت مل گئی۔ چنانچہ ایک بار پھر وہ اردو کی بقا کی جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کراچی میں وہ انجمن ترقی اردو کا افتتاح بابائے قوم قائداعظم سے کرانا چاہتے تھے جس کی انہوں نے حامی بھی بھر لی تھی۔ قائداعظم اردو کو وہ واحد زبان سمجھتے تھے جو ملکی اتحاد کی ضامن ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو کی اہمیت کو بارہا واضح کیا اس حوالے سے

مولوی عبدالحق کا ان سے مسلسل رابطہ رہا۔ کراچی میں انجمن ترقی اردو کے افتتاح کے حوالے سے حسن بانو قزلباش کے نام ۱۱ جون ۱۹۴۸ء کے خط میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''قائداعظم کے پروگرام ایسے جلد جلد بدلے اور کچھ علیل بھی رہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ کوئٹہ جاتے وقت خاص طور سے بڑی معذرت کی اور کہا کسی اور سے افتتاح کرا لیجئے۔ میں کسی اور موقع پر انجمن میں آ جاؤں گا۔ اب ہم نے بغیر رسم افتتاح کام شروع کر دیا ہے۔''
(۳۴)

کراچی آ کر انہوں نے انجمن ترقی اردو کو دوبارہ فعال اور متحرک کیا اور فسادات کے باعث اس پر جو جمود کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اس کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات کئے۔ انجمن کے دستور العمل میں نئے حالات کے مطابق تبدیلیاں کی گئیں۔ منقطع اشاعتی سلسلوں کو دوبارہ شروع کیا گیا۔ بند رسالوں کا دوبارہ اجرا کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مئی ۱۹۴۸ء سے رسالہ ''قومی زبان'' کا آغاز کیا گیا۔ دیگر رسالوں میں ''معاشیات'' ''اردو'' ''سائنس'' ''تاریخ وسیاست'' کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ لائبریری کو وسعت دی گئی اور انجمن ترقی اردو کے لیے فنڈز حاصل کرنے کی تگ و دو تیز کر دی گئی۔

مولوی عبدالحق نے کراچی میں آتے ہی یہاں پر جامعہ عثمانیہ کی طرز پر اردو یونیورسٹی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس منصوبے کے ابتدائیے کے طور پر ۲۳ جون ۱۹۴۹ء کو اردو کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شروع میں اس کالج کے طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے پرائیویٹ طلبہ کے طور پر امتحان میں شریک ہوتے۔ کالج کے کسی یونیورسٹی کے ساتھ باقاعدہ الحاق کے حوالے سے ڈاکٹر داؤد رہبر کو لکھے گئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں، یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونیورسٹی اِس کے الحاق کے لئے آمادہ نہیں۔ سندھ یونیورسٹی نے انکار کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدود سے باہر ہے۔ اب میں اس سوچ میں ہوں کہ کروں تو کیا کروں، اب بند کرتا ہوں تو بدنامی الگ اور بچارے لڑکوں کی اتنے دنوں کی محنت اور روپیہ بھی رائیگاں جائے گا۔ انجمن نے باوجود بے سروسامانی جو ہزاروں روپے کا خرچ برداشت کیا وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ ہم ہندوستان سے لٹ پٹ کے برباد ہو کے آئے تھے۔ توقع تھی کہ پاکستان

ہمارے آنسو پونچھے گا اور ہماری ہمت افزائی کرے گا۔لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہاں کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔کہاں تک لکھوں بڑی طولانی داستان ہے۔''

(۳۵)

آخر کار وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن کے ذریعے کالج کا سندھ یونیورسٹی سے الحاق کرا کے ہی مولوی عبدالحق نے دم لیا۔انہوں نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔وہ زندگی بھر اردو زبان• کے دفاع کے لیے لڑتے رہے۔مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''لوگ مجھ لڑاکا کہتے ہیں۔میں طبعاً لڑاکا نہیں لیکن حالات نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔ وہاں غیروں سے لڑتا رہا یہاں اپنوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ساری عمر یوں ہی لڑتے بھڑتے گزری۔''(۳۶)

ان پریشان کُن حالات میں بھی وہ ڈٹے رہے اور حکومت سے باقاعدہ مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا،اردو کا مقدمہ ہر جگہ پیش کیا اور اردو کو پاکستان میں جائز مقام دلانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔چنانچہ ان کی انہی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے حکومت نے انہیں اردو کمیٹی کا صدر مقرر کر دیا۔ اس کمیٹی کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اردو کمیٹی جو حکومت کے ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ نے میری صدارت میں بنائی ہے اس کا کام میں نے شروع کر دیا ہے۔اس میں دفاتر میں اردو کی ترویج یونیورسٹیوں میں اردو ذریعہ تعلیم،انسائیکلوپیڈیا کی تالیف،تراجم وغیرہ سب کچھ ہے۔''

(۳۷)

اس دوران میں انہوں نے انجمن ترقی اردو کو بھی مزید فعال بنانے کی ضرورت محسوس کی۔اس کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ ملک میں جگہ جگہ انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کی جائیں۔ساتھ ہیں انہیں ایسے مخلص کارکنوں کی تلاش تھی جو محنت اور لگن کے ساتھ ان کے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔صفیہ شمیم ملیح آبادی کے نام ۲۱ اگست ۱۹۵۴ء کے خط میں لکھتے ہیں جو ان دنوں راولپنڈی میں تھیں:

''کیا آپ کی توجہ اور کوشش سے یہ ممکن نہیں کہ وہاں انجمن کی ایک ایسی شاخ قائم کی

جائے جس کے ارکان اردو کے سچے بہی خواہ اور بااثر ہوں اور وہ انجمن کے مقاصد اور اردو کی تحریک کو خلوص اور ہمت کے ساتھ انجام دیں۔ مسلم لیگ پارٹی اور مجلس دستور ساز نے جو نامعقول اور ناقابلِ عمل فارمولا منظور کیا ہے اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اردو کہ ترقی اور فروغ کے لئے زیادہ توجہ کریں۔'' (۳۸) ؟

دراصل ان کے نزدیک اردو کے فروغ کا ایک ہی حل تھا کہ ملک میں انجمن ترقی اردو کی شاخوں کا جال بچھا دیا جائے تاکہ ملک کے ہر گوشے میں اردو کی آواز پہنچ سکے کیونکہ اس وقت اردو مخالف قوتوں کا زور تھا اور ان کا توڑ ضروری تھا۔ اس حوالے سے وہ ان تھک محنت کے قائل تھے۔ صفیہ شمیم ملیح آبادی کے نام ۱۶ ستمبر ۱۹۵۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''ہمیں سارے پاکستان میں انجمن کی شاخوں کا جال بچھا دینا چاہئے تاکہ ہم اردو کی حمایت میں متفقہ طور پر آواز اٹھا سکیں ورنہ یہاں اردو کے پنپنے اور فروغ پانے کی بہت کم توقع ہے۔ مشاعرے اس اہم خدمت کو انجام نہیں دے سکتے۔ کھیل تماشوں سے یہ کام نہیں ہوگا اس کے لئے سخت جدوجہد اور قربانی کی ضرورت ہے۔'' (۳۹)

یہاں پر اس کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مولوی عبدالحق نہ صرف ملکی سطح پر اردو کو فروغ دینا چاہتے تھے بلکہ وہ اس سے بھی وسیع تناظر میں اس زبان کو دیکھ رہے تھے اور ملک سے باہر بھی انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کر کے اردو کو رواج دینا چاہتے تھے۔ بیرونِ ملک اردو کے فروغ کی کوششوں کے حوالے سے ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام ۱۲۸ کتوبر ۱۹۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''تم تو اب اچھے خاصے لندنی ہو گئے ہو۔ ڈر ہے کہ کہیں وہیں کے نہ ہو رہو۔ وہاں اُردو کی انجمن ضرور بناؤ۔ اب اُردو کے استاد بھی تم ہی ہو۔ پھر کیا ہے اِس سے یادِ وطن تو رہے گی۔ اپنی زبان پھر بھی اپنی ہوتی ہے خواہ غیر زبان پر کتنی ہی قدرت کیوں نہ ہو۔'' (۴۰)

۱۹۵۴ء میں محمد علی بوگرہ کی حکومت نے اسمبلی میں ایک ایسا بل منظور کرانا چاہا جس میں اردو کو بالکل نظر انداز کیا جا رہا تھا اور اس سے اردو مخالف انداز جھلکتا تھا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق اُردو کے فروغ کے لیے انتہائی اقدام سے بھی نہ گھبرائے اور ایک بہت بڑے جلوس کی صورت میں اسمبلی ہال کے سامنے جا پہنچے۔ وہ ڈاکٹر داؤد رہبر

کے نام یکم فروری ۱۹۵۵ء کو لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

''پچھلے سال جس روز مجلسِ دستور ساز (کانسٹی ٹیوئینٹ اسمبلی) میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، میں ایک لاکھ اشخاص کا جلوس لے کر مئی کی گرمی میں تین میل پیدل چل کر ایوانِ اسمبلی میں پہنچا اور اس مقام میں جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع اور جرم ہے۔ ہزاروں آدمی گھس گئے۔ پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لئے کھڑی تھی کہ ذرا بھی جنبش ہو تو فائر کر دیں۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ عاملانِ حکومت کا خیال تھا کہ خون خرابہ ہوگا۔ لیکن یہ ایسا پُر امن احتجاج تھا کہ سب حیرت میں رہ گئے۔ اسمبلی کا اجلاس برخاست کرنا پڑا اور دوسرا دن مجھ سے بات چیت کا ٹھیرا۔ گفتگو ہوئی سمجھوتا بھی ہوا۔ لیکن عمل اس کے خلاف کیا۔'' (۴۱)

اسی دوران میں مولوی عبدالحق کی یہ بھرپور کوشش رہی کہ اردو کو وفاقی زبان کا درجہ دلوایا جایا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو تمام صوبوں کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں صفیہ شمیم ملیح آبادی کے نام ۱۲ اگست ۱۹۵۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''اس عرصہ میں میں نے دو کام شروع کئے ہیں۔ ایک اردو یونیورسٹی کی تحریک اور دوسرا کل پاکستان وفاقی زبان کمیٹی کا قیام۔ چونکہ ہماری حکومت فیڈرل یعنی وفاقی ہے اس لئے اس کی زبان بھی وفاقی ہونی چاہیے۔ وفاقی زبان میں کوئی علاقائی یا صوبائی زبان نہیں آسکتی۔ وہ ایسی زبان ہوگی جو پورے وفاق میں زیادہ بولی یا سمجھی جاتی ہو اور وہ اردو کے سوا کوئی زبان نہیں ہوسکتی۔'' (۴۲)

اس بات کا انہوں نے بارہا اعادہ کیا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اردو کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے اور اردو کے علاوہ کسی زبان میں ایسی قوت نہیں پاتے تھے جو ملکی ضرورت کو پورا کر سکے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''مملکتِ پاکستان ایک فیڈرل یعنی وفاقی حکومت ہے، لہٰذا اُس کی زبان بھی فیڈرل یعنی وفاقی ہونی چاہیے۔ وفاقی زبان سے مراد وہ زبان ہے جو پاکستان کے ہر حصے (یونٹ) میں زیادہ سے زیادہ بولی اور سمجھی جائے۔ اس بنا پر علاقائی اور صوبائی زبانیں خود بخود خارج

ہو جاتی ہیں خواہ وہ چار کروڑ کی ہوں یا چار لاکھ کی۔ کیونکہ وہ ایک محدود رقبے میں بولی اور سمجھی
جاتی ہیں اور اس سے باہر انہیں کوئی نہیں سمجھتا۔ اس لیے ان میں سے کوئی زبان بھی وفاقی
حکومت کی زبان نہیں ہوسکتی۔ پاکستان کی وفاقی زبان صرف ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ اردو ہے
جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ برِعظیم بھارت پاک اور اس سے باہر بھی دور دور چھائی ہوئی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ قائداعظم علیہ الرحمہ نے اِسے پاکستان کی واحد زبان قرار دیا تھا۔'' (۴۳)

لیکن سیاسی صورت حال اردو کے حق میں نہیں جا رہی تھی۔ ان حالات میں مولوی عبدالحق کے لیے
حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ ایک تو حکومت کی پالیسیاں خلاف جا رہی تھی دوسری افتادیہ آن پڑی کہ خود
انجمن ترقی اردو کی مجلسِ نظما اور مولوی عبدالحق کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے اور مولوی عبدالحق کو تقریباً انجمن ترقی
اردو سے الگ کر دیا گیا۔ ایسے حالات میں وہ بے حد مایوسی کا شکار ہوگئے اور خود کو انجمن کی عمارت کی بالائی منزل تک
محدود کرلیا۔ اس دور کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ۱۹ فروری ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''میرے رفقائے کار نے مجھے ایسی اذیتیں پہنچائیں اور انجمن کو ایسے نقصانات پہنچائے
کہ میں کسی کام کا نہ رہا۔ میرا کتب خانہ تک سربمہر کر دیا۔ میرے مسودات سب کتب خانے میں
بند رہ گئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہوگیا۔ خیانت اور بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لئے طرح
طرح کی الجھنیں پیدا کر دیں۔

نیا انقلاب آیا تو خائن اور بددیانت گھبرائے۔ سازشوں کا زور کم ہوا۔ اسی کے ساتھ
حکومت نے اردو ترقی بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لئے مجھ سے درخواست کی۔ میں نے
بخوشی اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ بھی اجازت دی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب
کرلوں۔ اللہ نے چپ کی داد دی اور صبر کا پھل ملا۔ انشاءاللہ اب کام پوری مستعدی کے ساتھ
شروع ہو جائے گا اور گزشتہ آفات کی تلافی ہو جائے گی۔'' (۴۴)

۱۱۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مارشل لاء کا نفاذ کر کے حکومت سنبھال لی۔ مولوی
عبدالحق نے نئی حکومت کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے ایوب خان سے ملاقات کی اور ان کو انجمن کی بگڑتی ہوئی
حالت اور عہدے داروں کی بددیانتیوں کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ جنرل ایوب خان نے فوری طور پر مارشل لاء

ریگولیشن جاری کیا اور اس کے مطابق مولوی عبدالحق کو اختیارات دوبارہ مل گئے نئی مجلسِ نظما تشکیل دی گئی اور انجمن ترقی اردو دوبارہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئی۔

اسی دوران میں مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے قاموس الکتب شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہیں بہت سے کتب خانوں کی خاک چھاننا پڑی مختلف کتب خانوں کی مطبوعہ فہرستیں حاصل کی گئیں اور ان سے مدد لی گئی۔ اس قاموس الکتب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بیگم شائستہ اکرام اللہ کے نام ۵ فروری ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں انجمن ترقی اردو میں اپنی میں نگرانی قاموس کتب اردو یعنی Bibliography of Urdu تیار کر رہا ہوں۔ اس میں اردو زبان کی تمام کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ جو ابتدا سے اب تک لکھی گئی مع مختصر کیفیت کے درج کی جائیں گی۔ پہلی جلد ''اسلامیات'' پر ہے جو زیرِ طبع ہے آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اُردو میں اسلامیات کے موضوع پر تقریباً بارہ ہزار کتابیں درج ہو چکی ہیں۔ یہ قاموس پانچ جلدوں میں ہوگی۔'' (۴۵)

مولوی عبدالحق اردو کے فروغ کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کرتے رہے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس حوالے سے وہ ایک کامیاب تجربہ جامعہ عثمانیہ کی صورت میں کر چکے تھے۔ چنانچہ پاکستان میں بھی اردو یونیورسٹی کا قیام ان کا ایک خواب تھا۔ اقبال شیدائی کے نام ۲۲ جون ۱۹۶۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ اس یونیورسٹی کا مقصد صرف یہی نہیں ہوگا کہ نصاب کی کتابیں اردو کے ذریعے پڑھا دی جائیں بلکہ اردو زبان کی ترقی و فروغ کے لیے بھی کوشش کی جائے گی۔ دارالترجمہ اور ریسرچ وغیرہ کے شعبے بھی قائم کئے جائیں گے۔'' (۴۶)

مولوی عبدالحق کی عمر ۹۰ سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور وہ اردو کی جنگ لڑتے ہوئے اب بڑھاپے کی آخری حدوں کو چھونے لگے تھے۔ ضعیفی کے باوجود وہ اپنے مشن کو بھرپور انداز میں جاری رکھے ہوئے تھے لیکن

ساتھیوں کے افسوسناک رویے نے انہیں نڈھال کر دیا اور وہ بیمار رہنے لگے۔ شروع میں ان کا علاج جناح ہسپتال کراچی میں کرایا گیا لیکن جب ان کی صحت نہ سنبھلی اور اس کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ان کو کمبائنڈ ملٹری ہسپتال مری میں حکومت کے خرچ پر علاج کے لیے بھجوا دیا جہاں ان کا خصوصی طور پر علاج ہونے لگا تشخیص پر کینسر کا مرض سامنے آیا جو مایوس کن مراحل میں داخل ہو چکا تھا انہیں دوبارہ کراچی میں پاکستان نیول ہسپتال میں داخل کرایا گیا لیکن ان کی طبیعت نہ سنبھل سکی اور بالآخر ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو وہ اردو اور اہلِ اردو کو سوگوار چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی خواہش کے مطابق ان کو انجمن ترقی اردو کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

مولوی عبدالحق کو بابائے اردو کا خطاب دیا گیا جس کو انہوں نے سچ کر دکھایا۔ انہوں نے اردو زبان نہ صرف ہمدردی کی نظر سے دیکھا بلکہ ایک شفیق باپ بن کر اس کی پرورش کی اور اس کے تحفظ و بقا کی جنگ لڑی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو اردو زبان کو آگے بڑھانے، اس کو ترقی دینے اور اس کو پھیلانے میں صرف کر دیا۔ اگر چہ اردو میں کئی ایسی شخصیات نظر آتی ہیں جن کو اردو کی ترویج و اشاعت میں معاون کہا جا سکتا ہے لیکن ایسا غمگسار کوئی نہیں ملتا جس نے اپنی ساری زندگی اس زبان کو سہارا دینے اور اس کو تحفظ فراہم کرنے میں گزار دی ہو۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے یہ خدمت کسی ذاتی مفاد یا لالچ کے بغیر سرانجام دی۔ ان کے سامنے ہمیشہ اردو کا مفاد رہا اور اسی کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنائے رکھا۔

انہیں ہمیشہ اردو کی ترقی اور اس کے تحفظ کی فکر رہی یہی وجہ ہے ان کی خواہش تھی کہ ملک میں عام طور سے زبان کی اشاعت کے لیے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں کہ اردو کو ایک ہمہ گیر مقام حاصل ہوا۔ ان کے خیال میں یہ ذرائع اختیار کر کے بہترین نتائج حاصل کئے جا سکتے ہی مثلاً اُردو مدارس اور کتب خانوں کا قیام، سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اُردو کی شرکت، موجودہ نصابِ اُردو کی اصلاح، اُردو کی انجمنوں کا قائم کرنا اور ایسے اُردو اخبار وں اور رسالوں کا اجراء جو سلیس زبان میں زمانہ حال کے حالات اور واقعات کو اس طرح سنجیدگی اور صفائی سے پیش کریں کہ ہر پڑھا لکھا شخص سمجھ سکے اور مستفید ہو سکے۔ وہ اپنی رائے میں بے لاگ ہوں اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ان جرائد کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہو لیکن مخصوص طور پر وہ اپنی زبان کے نگران ہوں یعنی وہ اپنی زبان کے متعلق ہر قسم کی خبریں مہیا کریں، مختلف علاقوں میں زبان کی جو حالت ہے اس سے آگاہ کریں اور ان مقامات

میں جن اصلاحوں اور کوششوں کی ضرورت ہے اُن پر بحث کریں، اُردو تالیفات کا جائزہ لیں، انصاف کے ساتھ تنقید و تبصرہ کر کے ان کے حُسن و قبح کو ظاہر کریں۔ ان تمام تجویزوں سے بڑھ کر ایک ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن مولفین و مترجمین کی قدر افزائی کی جائے جو اپنی زبان میں قابلِ قدر کام کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کے نزدیک دوسری صورت زبان کی ترقی کی یہ ہے کہ مختلف قسم کی جامع لغات، مبسوط صرف ونحو، انسائیکلو پیڈیا کی تالیف اور ہر قسم کے علوم وفنون پر تالیفات مہیّا کی جائیں۔ زبان کو شایستہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ زبان میں صفائی، شُستگی اور پختگی پیدا ہو، وہ نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر ہو اور اس میں مختلف اسالیب بیان کے سانچے موجود ہوں۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ زبان میں اعلیٰ درجے کی تصانیف و تالیفات اور غیر زبانوں کی بہترین تصانیف کے ترجموں کا ذخیرہ فراہم ہو جو اہلِ قلم کی رہنمائی کر سکے۔ (۴۷)

اردو زبان کی اشاعت کے حوالے سے انہوں نے انجمن ترقی اردو کے لیے ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار کیا اور اس کو لاگو کر کے اردو کی ترقی کی راہیں متعین کیں۔ چنانچہ اس لائحہ عمل کے مطابق سب سے اوّل یہ تجویز کیا گیا کہ ہندوستان کے تمام علاقوں اور صوبوں میں اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے جس کا یہ مطلب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تحقیقی طور سے یہ معلوم کیا جائے کہ اُن علاقوں میں اُردو سمجھنے، بولنے والوں اور پڑھے لکھوں کی کیا تعداد ہے، یہ تعلیم کس درجہ تک ہے اور طلبہ کی کیا تعداد ہے، اس کے درسی نصاب کی کیا حالت ہے، قدیم طرزِ مدارس کی تعداد جن میں اُردو پڑھائی جاتی یا ذریعہ تعلیم ہے کتنے ہیں اور ان میں طلبہ کی تعداد کیا ہے، سرکاری اور نجی اُردو کتب خانوں کی تعداد ایسی انجمنوں اور اداروں کی تعداد اجو اردو کی خدمت کرتے ہیں، اُردو مطابع اور جرائد کی تعداد اور حالت، سرکاری محکموں اور عدالتوں میں اردو کی حیثیت۔ اِن شمار و اعداد کے علاوہ یہ بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہاں اُردو زبان ترقی پر ہے یا انحطاط پر اور اس کے کیا اسباب ہیں، لوگوں کو اُردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے یا نہیں، وہاں کی زبان مقامی خصوصیات، اُردو کا اثر قرب و جوار کی زبانوں پر، وہاں کی قدیم تصانیف اور مُصنفین اور شعرا کے نام وغیرہ وغیرہ۔ نیز اس بات کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر علاقے میں اس کے حالات کی رو سے اُردو کی اشاعت وترقی کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ (۴۸)

اردو زبان کو مستحکم کرنے اور شائستہ بنانے کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انجمن ترقی اردو اس کی طرف سے بھی غافل نہیں رہی۔ چناں چہ اس نے قدیم کم یاب تذکرے اور قدیم اُردو کی کتابیں جن پر اُردو ادب کی تاریخ کا بہت کچھ انحصار ہے ڈھونڈ کر طبع کرائیں اور ان کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں جو اب تک ہمارے ادب کی تاریخوں میں چلی آرہی تھیں رفع ہوگئیں اور اس وقت سے اُردو ادب کی تاریخ کا رنگ بدل گیا۔

اس کے علاوہ مختلف قسم کی لغات زیرِ طبع ہیں مثلاً انگریزی اُردو کی جامع لغات جو زیرِ طبع ہے اور چند ماہ میں چھپ کر شائع ہو جائے گی، 'اصطلاحاتِ پیشہ وراں' جو تقریباً مکمل اور زیرِ نظرِ ثانی ہے، اس کا پہلا حصّہ عنقریب مطبع میں پہنچ جائے گا۔ قدیم اُردو کی لغات وغیرہ، اُردو زبان کی مبسوط جامع لغات جو نظام گورنمنٹ کی سرپرستی میں مرتّب ہو رہی ہے وہ بھی انجمن ہی کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ ایک دوسری تجویز جو اس وقت انجمن کے زیرِ غور ہے وہ یہ ہے کہ دُنیا کی اعلیٰ زبانوں کی جس قدر بہترین تصانیف ہیں اُن کا اُردو میں ترجمہ کر دیا جائے۔ اس کی فہرست تیّار ہو چکی ہے اور اب اسے عمل میں لانے کی تدبیر کی جارہی ہے۔ یہ کام اگر سرانجام پا گیا تو عظیم الشان کام یابی ہوگی۔'' (۴۹)

مولوی عبدالحق اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے ممکنہ ذرائع کو استعمال کرنا جانتے تھے۔ وہ ایک طرف اپنے ادب کو مستحکم اور علوم و فنون سے مالا مال کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انہیں اپنی زبان کی اشاعت منظور تھی۔ اس لیے ان تمام وسائل اور ذرائع پر غور کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے جو اردو زبان کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں۔ (۵۰) اپنی حکمت عملی کو انتہائی جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق اردو کے فروغ کے لیے درج ذیل تجاویز دیتے ہیں:

''اس میں کوئی زحمت نہیں صرف توجہ کی ضرورت ہے۔ خطوں کے لفافوں پر پتا اُردو میں لکھیں۔ جلسوں میں تقریریں اُردو میں کریں۔ اپنے جلسوں کی رودادیں اُردو میں لکھیں۔ اپنے سائن بورڈ، اپنے نام کی تختیاں اُردو میں ہوں۔ منی آرڈر اور رجسٹری کے فارم ڈاک خانے سے اُردو میں طلب کریں اور اُردو ہی میں پُری کریں۔ باہم خط و کتابت اُردو میں کی جائے اُردو اخبار اور رسالوں کی سرپرستی کریں۔ اُردو کتابوں کا مطالعہ کریں۔ حساب کتاب اُردو میں

رکھیں۔

یہ عام باتیں ہیں۔اگر چہ معمولی ہیں مگر بہت ضروری ہیں۔اس میں نہ زحمت ہے نہ خرچ صرف تھوڑی سی توجہ درکار ہے۔

اب میں ان امور کا ذکر کرتا ہوں جن میں کچھ زحمت بھی ہے اور کچھ خرچ بھی۔

۱۔ خانگی طور پر اُردو کے مدرسے اور مکتب قائم کیے جائیں۔

۲۔ بالغوں کی تعلیم کے لیے شبینہ مدرسے کھولے جائیں۔

۳۔ دینی مکتبوں میں اُردو کی تعلیم لازمی کر دی جائے۔

۴۔ لڑکیوں کو خاص طور پر اُردو کی تعلیم دلائی جائے۔

۵۔ جہاں جہاں ممکن ہو مطالعہ گھر قائم کیے جائیں۔

۶۔ اُردو کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین کی جائے اور انہیں اُردو اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔

آخر میں ان چند امور کا ذکر کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور پر آپ سے ہے۔

۱۔ ریاست میں اُردو کے تحفظ اور اس کی ترویج کے لیے ایک مستقل اور مضبوط انجمن ترقی اردو قائم کی جائے جس کی شاخیں ریاست بھر میں پھیلائی جائیں۔

۲۔ ریاست کو مشورہ دیا جائے کہ اُردو کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے ایک خاص افسر کا تقرر کیا جائے۔

۳۔ نیز یہ درخواست کی جائے کہ اُردو کو بھی وہی درجہ دیا جائے جو ہندی کو حاصل ہے اور عدالتوں میں اُردو رسم الخط کی اجازت دی جائے۔

۴۔ اُردو کے کتب خانوں اور مدرسوں کے لیے ریاست سے امداد کی درخواست کی جائے۔''(۵۱)

مولوی عبدالحق اردو زبان کے قدیم و جدید کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔انہوں نے قدیم ادب کا کھوج لگایا۔زبان کی قدیم بنیادوں کا سراغ لگایا اس حوالے سے دکنی ادب کے قدیم مخطوطوں کی دریافت

اور انہیں اپنے قیمتی مقدروں کے ساتھ شائع کرنا ان کی اردو زبان کے لیے ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ اسی طرح اردو زبان و ادب کی عہد بہ عہد تاریخ کا مکمل جائزہ پیش کر کے نہ صرف اردو زبان کے خدو خال کی وضاحت کی بلکہ اردو زبان کے اسلوب کے تعین میں مدد حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک بے حد نکھری ہوئی زبان نظر آتی ہے ایک ایسی زبان جو جدید تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے سرسید احمد خان اور حالی سے کسبِ فیض کیا اور ان کے اسلوبِ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے معراج پر پہنچا دیا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ زبان کو فروغ دینے کے حوالے سے ان کے مشن کو بھی آگے لے کر بڑھے اور اس سلسلے میں سامنے آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہر قسم کی مشکلات کا دیدہ دلیری سے سامنا کیا۔ مولوی عبدالحق اردو کے لیے ایک جہادی سوچ رکھتے تھے:

''ان حالات میں ہمارا فرض صاف واضح ہے۔ اب ہم تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے۔ سکوت و سکون، بے عملی و بے اعتنائی انسانوں اور قوموں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ بقا کے لیے جدوجہد لازم ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں نے اپنی زبان کی بقا کے لیے بڑی بڑی صعوبتیں اور عقوبتیں جھیلیں اور جانیں کھپا دی ہیں۔ اگر ہم اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں لگا تار کوشش اور محنت، سختیوں اور قربانیوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بڈھا سرسیّد آخر دم تک اپنی زبان کی حفاظت کے لیے لڑتا رہا۔ ہمیں آج اسی سیّد احمد خانی خلوص و درد اور جوش و ہمت کی ضرورت ہے۔'' (۵۲)

مولوی عبدالحق گہرا لسانی شعور رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ کسی بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت سے زبان کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے لیے جو بھی قدم اٹھایا اس میں ان حقائق کو مدِنظر رکھا۔ اسی طرح زبان کی کسی بھی علاقے کے لیے عملی ضرورتوں کا جائزہ لے وہاں پر اردو زبان کے فروغ کے لیے پرگرام ترتیب دیا۔ اس لیے ان کے اصول محض کتابی یا اکتسابی نہ تھے بلکہ انہوں نے گردو پیش کے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، جغرافیائی اور تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر ایک مکمل لائحہ عمل مرتب کیا۔

ان کی زندگی اور زبان کے لیے جدوجہد کا مطالعہ کر کے جو بات واضح نظر آتی ہے وہ یہ کہ زبان کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر رجائی اور روشن رہا ہے۔ ان کی تحریروں، خطبات اور عملی اقدامات سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اردو زبان کے روشن مستقبل کو دیکھتے ہوئے اپنی منزل کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل

رہے۔ بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج جو اردو زبان کا روپ نظر آرہا ہے اور اس وقت یہ زبان دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کسی طور کم نہیں تو اس کو اس درجے تک پہنچانے میں اور اس کو اس کا مقام دلانے میں جو شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت ہے اور اورنگ آباد کالج کی تقریب میں طلبہ کی طرف سے ان کو دیا جانے والا 'بابائے اُردو' کا خطاب، اردو کے ساتھ ان کے تعلق کی مکمل وضاحت کے لیے کافی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مولوی عبدالحق، مکاتیبِ عبدالحق (مرتبہ جلیل قدوائی)، کراچی،
اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء، ص ۴۴۲

۲۔ عقیل ملک، ڈاکٹر (ہاپوڑ)، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو،
پاکستان، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۵۵

۳۔ احمد حسن، شیخ، سہ ماہی اردو (بابائے اردو نمبر)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۲ء، ص ۲۰

۴۔ مولوی عبدالحق، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۱۸۸

۵۔ مختار الدین احمد، عبدالحق، نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱

۶۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۱۲۰

۷۔ عبدالرشید، صوفی، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۶

۸۔ احمد حسن، شیخ، سہ ماہی اردو، ایضاً، ص ۲۰

۹۔ ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔

۱۰۔ عقیل ملک، ڈاکٹر (ہاپوڑ)، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو،
پاکستان، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۵۵

۱۱۔ احمد حسن، شیخ، سہ ماہی اردو، ایضاً، ص ۲۲۔۲۳

۱۲۔ مولوی عبدالحق، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۱۸۸

۱۳۔ احمد حسن، شیخ، سہ ماہی اردو، ایضاً، ص ۲۳

۱۴۔ مختار الدین احمد، عبدالحق، ایضاً، ص ۲۴

۱۵۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، کراچی،
انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳
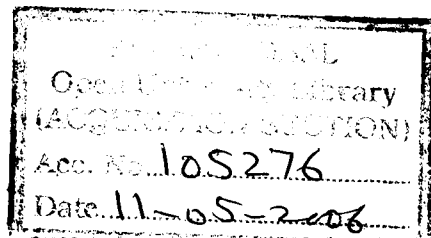
۱۶۔ -----ایضاً-----،ص ۱۵

۱۷۔ -----ایضاً-----،ص ۱۹

۱۸۔ -----ایضاً-----،ص ۲۰

۱۹۔ محمد سخاوت مرزا، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اگست ۱۹۷۷ء، ص ۲۵

۲۰۔ مولوی عبدالحق، مکاتیب عبدالحق، ایضاً، ص ۴۷۷

۲۱۔ مختار الدین احمد، عبدالحق، ایضاً، ص ۳۸

۲۲۔ مقتدا خاں شیروانی، الحاج مولوی، قومی زبان، کراچی،
انجمن ترقی اردو پاکستان، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۱۶

۲۳۔ مولوی عبدالحق، مکاتیب عبدالحق، ایضاً، ص ۲۵۳

۲۴۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخِ انجمن ترقی اردو، ایضاً، ص ۹۳۔۹۴

۲۵۔ مولوی عبدالحق، مکاتیب عبدالحق، ایضاً، ص ۲۱۵

۲۶۔ -----ایضاً-----،ص ۴۴۱

۲۷۔ -----ایضاً-----،ص ۲۰۳۔۲۰۴

۲۸۔ -----ایضاً-----،ص ۲۸۴

۲۹۔ -----ایضاً-----،ص ۳۹۱

۳۰۔ -----ایضاً-----،ص ۲۱۹

۳۱۔ -----ایضاً-----،ص ۴۴۰

۳۲۔ -----ایضاً-----،ص ۳۹۱

۳۳۔ -----ایضاً-----،ص ۳۰۴۔۳۰۵

۳۴۔ -----ایضاً-----،ص ۵۷۴۔۵۷۵

۳۵ ------ایضاً-----،ص ۳۱۹

۳۶ ------ایضاً-----،ص ۲۲۴

۳۷۔ -----ایضاً-----،ص ۲۲۴

۳۸۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۶۶۳

۳۹۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۶۶۵

۴۰۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۳۲۰

۴۱۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۳۳۵

۴۲۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۶۶۴

۴۳۔ مولوی عبدالحق، ماہنامہ قومی زبان، کراچی،
انجمن ترقی اردو پاکستان، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۵۶۔۵۷

۴۴۔ مولوی عبدالحق، مکاتیبِ عبدالحق، ایضاً، ص ۲۲۹

۴۵۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۶۶۱

۴۶۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۶۰۱

۴۷۔ مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)،
کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۲ء، ص ۴۴۔۴۵

۴۸۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۴۵۔۴۶

۴۹۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۴۶۔۴۷

۵۰۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۱۲۵

۵۱۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۲۲۷۔۲۲۸

۵۲۔ ـــــ ایضاً ــــــ، ص ۲۷۷

☆☆☆

اردو زبان کا آغاز وارتقا_بابائے اردو کی نظر میں

اردو زبان کا آغاز وارتقا__ بابائے اردو کی نظر میں

اردو زبان کی ابتدا اوراس کے ارتقا کے حوالے سے اب تک متعدد نظریات پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر نظریات میں اردو زبان کے آغاز کو بعض علاقائی زبانوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اوران زبانوں سے اردو کو ماخوذ قرار دیا گیا ہے۔ڈاکٹر شوکت سبزواری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اردو کی ابتدا اوراسکے نشو ونما کے متعلق خصوصیت کے ساتھ اردو داں طبقے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔مسلمانوں کی ساختہ و پرداختہ زبان سمجھ کر کوئی اسے عہدِ شاہجہانی کی پیداوار بتاتا ہے۔کوئی اسکی قدامت کے پیشِ نظر محمود غزنوی کی فتوحاتِ ہند سے اس کا رشتہ جوڑتا ہے۔اور کوئی اس سے پیچھے ہٹ کر محمد ابنِ قاسم کی فتحِ سندھ سے اس کی ولادت دکھاتا ہے۔ پہلے گروہ نے اس کا مولد دلی کو ٹھہرایا تھا۔ دوسرے گروہ نے پنجاب سے اس کا خمیر اٹھایا۔تیسرے گروہ نے اسکی آنول نال سندھ میں گڑھی ہوئی بتائی۔ایک اور گروہ آیا جس نے دکن و گجرات میں پھلتا پھولتا دکھا کر اس کا پودا دکن کی سرزمین سے اگایا۔'' (۱)

چنانچہ مولوی عبدالحق کے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں نظریات کا جائزہ لینے سے پہلے ان مختلف نظریات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اس حوالے سے سب سے پہلے جو نظریہ ہمارے سامنے ہے وہ میرامن دہلوی نے پیش کیا۔اگرچہ میرامن کوئی باقاعدہ محقق یا نقاد نہیں لیکن اپنی کتاب 'باغ و بہار' ، جو ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی، کے مقدمہ میں انہوں نے اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں وضاحت کی ہے:

''حقیقت اُردو کی زبان کی بزرگوں کے مُنھ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجُگی ہے۔انہی کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اوراپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سُلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ

ہوئے۔اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔۔۔

جب اکبر بادشہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب اقوام قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئیں لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔اس لیے اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو مقرر ہوئی۔'' (۲)

اس طرح میر امن کی رائے میں اردو کا وجود مختلف زبانوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔میر امن کے اس نظریے نے بعد میں آنے والے محققین کو بنیاد فراہم کی اور بہت سے لوگوں نے اپنی تحقیق کو میر امن کے خیال کی روشنی میں آگے بڑھاتے ہوئے اردو زبان کو مخلوط زبان قرار دیا۔چنانچہ سر سید احمد خان بھی اپنی کتاب 'آثار الصنادید' میں اردو زبان کو مختلف زبانوں کے ملاپ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔البتہ انہوں نے اس کی ابتدا شہنشاہ اکبر کے بجائے شاہجہاں کے دور سے کی ہے۔اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''جبکہ شہاب الدین شاہ جہاں بادشہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلاء کے حاضر ہونے کا حکم دیا اور دلی کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاجہاں آباد اس کا نام رکھا۔اس وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ہر ایک کی گفتار و رفتار جدا تھی۔ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا، جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کی یہ خود ایک نئی زبان ہوگئی اور چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبانِ اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر و امراء اسی کو بولا کرتے تھے۔گویا کی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا ''اردو'' نام ہوگیا۔'' (۳)

ان نظریات میں اردو کو مختلف زبانوں کی آمیزش کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔اس کے بعد جو نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں جو بنیادی چیز ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کی اردو کو کسی ایک علاقائی زبان سے وجود پانے کی بات کی گئی ہے۔اس علاقائی زبان میں جب عربی اور فارسی اثرات داخل ہوتے ہیں تو اردو معرض وجود میں

آتی ہے۔

بعض محققین اردو کی اصل برج بھاشا کو قرار دیتے ہیں۔ برج بھاشا گیارہویں صدی سے قبل برج کے قطعے کی زبان تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے اس میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی شمولیت ہوئی۔ یہاں کی دوسری زبانوں کی نسبت اس زبان نے مسلمانوں کی زبان کے زیادہ اثرات قبول کئے اور اس طرح ایک نئی شکل اختیار کر کے اردو کہلائی۔ اس نظریہ کو باقاعدہ طور پر سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے پیش کیا۔ وہ اپنی کتاب آبِ حیات کے آغاز میں لکھتے ہیں.

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔'' (۴)

محمد حسین آزاد کے بقول جب مختلف زبانوں کے الفاظ برج بھاشا میں شامل ہوئے تو اس نے ایک الگ زبان کا روپ دھار لیا:

''اِس زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنے۔ گری پڑی۔ پریشان چیز۔ چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔'' (۵)

محمد حسین آزاد کے علاوہ جن محققین نے اردو زبان کا ماخذ برج بھاشا کو قرار دیا ان میں حکیم شمس اللہ قادری شامل ہیں۔ انہوں نے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ کی شمولیت کو اردو زبان کے وجود کا باعث قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔'' (۶)

نواب نصیر الدین خیال نے اپنی کتاب 'داستانِ اردو' کے ایک باب کا عنوان ''برج بھاشا اردو بننے کے لیے تیار ہوتی ہے'' رکھا۔ عربی، فارسی کے ساتھ اختلاط سے ان کے خیال میں اس زبان نے اردو کا روپ دھارا۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اسی اختلاط کیا نام کسی زبان کی ترقی و وسعت اور مدارج طے کر کے کسی خاص بام تک اُس کا پہنچنا ہے۔ ہماری بھاشا کی یہی وہ تدریجی ترقی و وسعت تھی جس نے پردیسیوں کو بھی پرچا کر اپنا کر لیا۔ اور انکی بے تکلف زبانوں سے آخر ایک نیا خطاب (اردو) پا کر اسے تسلیم کر لیا۔ اس ترقی یافتہ بھاشا (اردو) کی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے کئی صدی پیشتر یعنی اصل عربوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔!'' (۷)

حافظ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے کافی استدلال سے کام لیا ہے اور اس طرح لسانی تحقیق میں ایک باقاعدہ روایت کا آغاز کیا۔ حافظ محمود شیرانی اردو کی ابتدا شاہجہان اور اکبر سے کہیں پہلے بتاتے ہیں:

''ہم اردو کے آغاز کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے، بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے۔ اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں بیسویں صدی ہجری کی ابتدا یعنی بابر کی آمد کے قبل سے ادبیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور فارسی لغات کی شہادت سے جونویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں، صاف واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہندی سے ان کا مقصد یہ زبان ہے جسے ہم اردو کہتے ہیں۔'' (۸)

حافظ شیرانی نے ان نظریات کو رد کیا ہے کی اردو دہلی کی قدیم زبان ہے۔ وہ اس بات کی تردید کرتے ہیں کی اردو برج بھاشا کی بیٹی ہے۔ ان کے بقول ان دونوں زبانوں کی صرف ونحو اور دوسرے خصائص پر غور کریں تو ان کے راستے مختلف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی

زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔''　(۹)

چنانچہ شیرانی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کیونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی پہنچے تو وہ اپنے ساتھ پنجاب کی زبان لے گئے۔ یہ زبان یقیناً ملتانی زبان ہو گی۔ ان کے بقول:

''اس کے متعلق شہادتِ لسانی کافی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسما و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں، پنجابی و اردو میں ساٹھ فی صد سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔''　(۱۰)

ملتانی زبان جب دہلی پہنچتی ہے تو اس میں وہاں کی زبانوں کے اثرات شامل ہوتے ہیں اور اس طرح ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے جس کو اردو کا نام دیا جاتا ہے۔

''دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔''　(۱۱)

چنانچہ اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے شیرانی کے نظریے نے کافی اہمیت اختیار کی۔ خصوصاً علاقائی زبانوں کے حوالے سے اردو زبان کے آغاز اور فروغ کے سلسلہ میں جتنے نظریات ہیں ان میں اس نظریے کو اہم مقام حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اردو کے دیگر ماہرین لسانیات نے بھی اس نظریے کی حمایت کی اور اس حوالے سے اپنی آرا کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری لکھتے ہیں:

''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتحِ دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی، جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو پایہ تخت نہ بنایا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس حصہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو

پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔'' (۱۲)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق وہ زبان جو پنجاب سے دہلی پہنچی یہاں کے مقامی اثرات قبول کرنے کے بعد دکن کے ماحول میں اس کی صحیح پرورش ہوئی:

''زبان ہندوستانی کا ارتقا پنجاب ہی سے شروع ہو چکا تھا۔لیکن اس کے ثانوی مدارج دوآبہ گجرات اور دکن میں تکمیل کو پہنچے۔'' (۱۳)

''ہمارے اس نظریے کا مزید ثبوت اردو کی دکنی شاخ پر غور وخوض کرنے سے بھی حاصل ہوتا ہے جب شمال کے مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا تو وہاں ان کے ساتھ وہی زبان گئی جو ابھی خام تھی اور جس پر نواح دہلی کی زبان کا پورا اثر نہیں پڑنے پایا تھا۔ یہ غیر پختہ زبان دکن میں پھیل گئی اور بالکل نئے اصول پر نشو ونما پانے لگی۔ وہ ان اثرات سے محروم رہی جو شمال میں اردو کی تشکیل کر رہے تھے اور جن کی وجہ سے وہاں اردو رفتہ رفتہ کھڑی بولی سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔'' (۱۴)

برجموہن دتا تریہ کیفی نے اپنی کتاب 'کیفیہ' کے آغاز میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اردو زبان کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب بیرونی حملہ آوروں نے پنجاب کا رخ کیا تو مقامی لوگوں سے میل ملاپ کے نتیجہ میں ایک کھچڑی زبان وجود میں آئی جو بعد میں شمالی ہند میں پہنچی۔

''قیاس یہ چاہتا ہے کہ اول اول ایک چُو چُو کے مربّے کی سی ادھ کچری کھچڑی بولی پنجاب میں شروع ہوئی ہوگی۔پھر پنجاب سے شمال مغربی ہند میں پھیلی ۔۔۔'' (۱۵)

اس حوالے سے طویل بحث کرنے کے بعد کیفی اپنی تحقیق سے یہ نتائج اخذ کرتے ہیں:

''۔۔۔

(۳) اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔

(۴) اردو کی پیدائش کے ذمہ دار ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔۔۔'' (۱۶)

حافظ محمود شیرانی کے نظریے کو کافی پذیرائی ملی۔ اس کی حمایت میں بہت کچھ لکھا گیا اور سرزمینِ

پنجاب کو اردو کا مولد قرار دینے کے حوالے سے مختلف دلائل فراہم کئے گئے۔ اس میں بنیادی استدلال یہی رہا کہ مسلمان حملہ آور پنجاب کے راستے ہندوستان میں آتے رہے اور یہاں کی تہذیب و معاشرت پر ان کا گہرا اثر رہا جس کی وجہ سے یہاں کی زبان پر بھی ان کے اثرات پڑے اور اس طرح اردو کا ایک ہیولا تیار ہوا جس کی آبیاری بعد میں دہلی اور دکن کی زمینوں میں ہوئی اور اس نے اردو کا روپ دھارا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بقول:

''مختلف محققینِ لسانیات کی ان آرا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد تاریخی اور لسانی اعتبار سے یہ موقف قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اردو (ہندوی) کی ابتدا اس وقت ہو گئی تھی جب مسلمان شمال مغرب سے فاتحانہ انداز کے ساتھ برِصغیر میں داخل ہوئے اور قریب قریب موجود ہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں ان کی مستحکم حکومت قائم ہو گئی۔'' (۱۷)

عین الحق فرید کوٹی حافظ محمود شیرانی کے نظریے کی حمایت کرتے ہوئے پنجابی کو اردو کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اس کا رشتہ قدیم ہڑپائی زبانوں سے جوڑتے ہیں:

''حقیقت بھی یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادیں وادی سندھ ہی میں استوار ہوئی ہیں اور اس کا سلسلہ نسب پنجابی، اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبان سے جا ملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں مروج تھی۔'' (۱۸)

سید سلمان ندوی اپنی کتاب ''نقوشِ سلمانی'' میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کی اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی کیونکہ یہ علاقہ ایرانیوں اور عربوں کی گزرگاہ رہا ہے اور اس طرح مسلمانوں کی آمد بھی سب سے پہلے سندھ کے راستے ہوئی۔ فتحِ سندھ کے بعد خصوصاً مسلمانوں اور ہندوؤں کا آپس میں میل جول رہا اس طرح سندھ کے علاقے میں اردو کے ابتدائی نقوش تیار ہوئے:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ''ہیولٰی'' اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' (۱۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

'' دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ جہاں جہاں یہ زبان پہنچی وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کر کے اپنی شکل بناتی رہی۔ اس کا ایک ہیولٰی سندھ اور ملتان میں تیار ہوا، پھر یہ

لسانی عمل سرحد و پنجاب میں ہوا جہاں سے تقریباً دو صدی بعد یہ دہلی پہنچا اور وہاں کی زبانوں کو
جذب کر کے اور ان میں جذب ہو کر سارے برِعظیم میں پھیل گیا۔'' (۲۰)

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق یہ سندھی زبان نہیں تھی جس نے اردو کا روپ اختیار کیا بلکہ شورسینی اَپ بھرنش اس وقت بنگال سے پنجاب، سندھ، کشمیر، گجرات و راجپوتانہ تک اور شمالی ہندو نیپال سے مہاراشٹر تک کے علاقوں میں اپنے اثرات رکھتی تھی۔ چنانچہ:

'' اردو اس بین الاقوامی، ملک گیر شورسینی اَپ بھرنش کا جدید ترین روپ ہے۔۔۔
شورسینی کا اثر پنجاب، راجپوتانہ و گجرات کے ذریعے سندھ و ملتان میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ اور
جب محمد بن قاسم نے ۹۴ھ (۷۱۲ء) میں سندھ و ملتان فتح کیا تو یہاں ایک ایسی کھچڑی زبان
بولی جاتی تھی جو پیاجی اثرات بھی رکھتی تھی اور شورسینی اثرات بھی۔'' (۲۱)

نصیر الدین ہاشمی کی دکنی ادبیات میں بہت زیادہ خدمات ہیں اور وہ اردو زبان کی دکن میں مقام اور حیثیت پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی اردو زبان کے آغاز کے بارے میں رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کی آمد اردو زبان کی ابتدا کا باعث بنی۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

'' یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے
پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے
ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر
ہوئی۔'' (۲۲)

نصیر الدین ہاشمی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی ہوگی کیونکہ یہاں پر مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ ملنے کا کافی موقع ملا اور اس طرح مسلمانوں کی زبان اور مقامی زبان کے باہمی اتصال کے باعث اردو وجود میں آئی۔ لیکن وہ اپنے اس نظریے کے حق میں کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہ کر سکے اور خود ہی اسے رد کر دیتے ہیں:

'' اب یہ امر خاص طور سے غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود و
باش کی اور حکومت قائم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت کی، تعلیم دی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا یہاں

کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت کام کاج خرید وفروخت میں ان سے سابقہ رہتا تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا، جو دونوں غیر قوموں کے لیے تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہوئی۔ اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے۔ وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔ مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں۔ اس لیے سرِ دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔'' (۲۳)

ڈاکٹر سہیل بخاری اپنی کتاب ''اردو کی زبان'' میں اردو کے آغاز کے حوالے سے مختلف نظریات کا جائزہ لینے کے بعد ان سب سے اختلاف کرتے ہوئے اردو زبان کو مہاراشٹری اَپ بھرنش کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اردو سندھ، پنجاب، بیجاپور یا دہلی میں سے کہیں بھی پیدا نہیں ہوئی بلکہ ان مقامات میں باہر سے لائی گئی:

''اردو کی اصل مرزبوم کے متعلق اب تک جتنے بھی نظریات پیش کئے گئے ہیں وہ سب کے سب حقیقت سے دور ہیں کیونکہ اردو مہاراشٹری پراکرت سے پیدا ہوئی ہے اور مہاراشٹری ملک مہاراشٹر میں بولی جاتی تھی۔ اردو اسی مہاراشٹر کے مشرقی علاقے میں پیدا ہوئی ہے اور مرہٹی اور برج بھاشا کی سگی بہن ہے۔'' (۲۴)

اسی طرح اپنے ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں:

''میرے علم کی رو سے اردو زبان نہ شورسینی سے نکلی ہے نہ پالی سے بلکہ اس کا ماخذ مہاراشٹری پراکرت ہے۔'' (۲۵)

ڈاکٹر سہیل بخاری دوسرے محققین کی طرح اردو کو نوعمر نہیں سمجھتے بلکہ ان کے خیال میں اردو ہندوستان کی کسی بھی معاصر زبان سے کم عمر نہیں ہے:

''ایسے ہی لوگوں نے جو زبانوں کی عمروں کو انسانوں کی عمروں سے کچھ تھوڑا سا ہی بڑھا ہوا سمجھتے ہیں اردو کو خواہ مخواہ کمسن اور نوعمر بنا رکھا ہے۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس زمانے میں شعرائے دکن اپنے مربی اور سرپرست بادشاہوں سے خلعت وانعام پا رہے تھے

اس زمانے میں بھی اردو زبان کا وہی انداز اور وہی کینڈا تھا جو آج پایا جاتا ہے۔ اردو زبان عمر میں اپنی کسی معاصر زبان سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ ذخیرہ الفاظ و اسالیب ہی میں کسی سے پیچھے ہے۔'' (۲۶)

ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی کی رائے بھی یہی ہے اور وہ اردو کو قدیم آریائی زبان کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں۔ یہ زبان مختلف ادوار میں علاقائی بولی کے روپ میں پرورش پاتی رہی اور اپنی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد جدید اردو زبان کے طور پر ہمارے سامنے آئی۔ ان کی تحقیقین کے مطابق اردو اسی عوامی پراکرت کی ترقی یافتہ شکل ہے جو مہاراشٹری اَپ بھرنش کہلاتی ہے:

''اردو آریائی زبان ہے اس کا لسانیاتی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر برِصغیر میں آریوں کی صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن سے منسلک ہے۔۔۔ اردو بھی ایسی ایک عوامی پراکرت کی ترقی یافتہ شکل ہے جسے مہاراشٹری اَپ بھرنش کہتے ہیں۔ پراکرت کی سب سے بڑی روایت اس کا عوامی عنصر ہے اور یہی عنصر اردو نے اپنے ورثہ میں پایا ہے۔ یہ کسی خاص علاقے۔ مذہب۔ کسی خاص فرقے۔ قبیلے۔ طبقے یا جماعت کی زبان نہیں، اس کی تشکیل و ترویج میں برِصغیر کے تمام صوبوں علاقوں۔ ان کے لوگوں کی مقامی بولیوں۔ لوک گیتوں۔ کہانیوں اور سنگیت نے حصہ لیا ہے اس لئے اردو قیدِ مقام سے آزاد ہے۔ کبھی پنجاب کے لہلہاتے سبزہ زاروں میں اس نے بچپن گزارا اور کبھی دلی کی گلیوں اور بازاروں میں اسے پھرتے دیکھا گیا۔ اس کی جوانی کی اٹھان دکن اور گجرات میں ہوئی۔ دلی اجڑ کر فیض آباد اور لکھنو پر رونق آئی تو اس نے پورب دیس کو اپنا مسکن بنایا لیکن اس کی آواز سرحد کے بلند پہاڑوں۔ بنگال کے دریاؤں۔ لہلہاتے دھانوں کے کھیتوں۔ سندھ کے روپہلے چمکتے ریتیلے میدانوں۔ کشمیر کے سبزہ زاروں اور جوئے باروں میں ہر جگہ سنائی دیتی رہی۔ جدید ہندوستانی پاکستانی زبانوں میں یہ وسعت۔ ہمہ گیری اور پھیلاؤ اردو کے ہی حصہ میں آیا ہے اور آج بھی یہ اس کی ایک ممتاز روایت ہے۔'' (۲۷)

ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اردو کی قدامت کے قائل ہیں اور اردو کو ہند آریائی زبانوں کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اردو نے تقریباً ۱۰۰۰ء میں اپنی اپ بھرنش زبان سے الگ روپ اختیار کر کے

اردو کا روپ دھارا:

''اردو نے بھی (اس کا نام اردو بعد میں پڑا) ۱۰۰۰ء کے بعد اپنا قدیم چولا بدلا اور آہستہ آہستہ اس کے موجودہ خط و خال نمایاں ہوئے۔ابھی وہ پوری طرح ابھرنے بھی نہ پائی تھی اور پر پرزے ہی جھاڑ رہی تھی کہ مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے۔انہوں نے اس زبان کو نکھارا۔'' (۲۸)

شوکت سبزواری دیگر محققین کی بعض آرا کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کی اردو دراصل وہی زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی اور آج تک ان علاقوں کی یہی زبان ہے:

''ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔اردو اس کی ادبی شکل ہے۔اس زبان کو یہ نام بعد میں اس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب و شعر کی زبان کا درجہ پایا۔مسلمانوں کے ہمرکاب یہ زبان دہلی سے نکل کر ملک کے دور دراز حصوں تک پہنچی۔مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کا اقتدار بڑھا اور اس کی حدیں وسیع ہوئیں۔'' (۲۹)

ان کی رائے میں دہلی کی زبان نے خصوصاً اس وقت ترقی کی جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے۔اس وقت یہ زبان دہلی کے بازاروں میں عام بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔چنانچہ مسلمانوں نے اسے اپنی سرپرستی میں لیا اور اس طرح ان کے ساتھ یہ زبان گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر پرورش پا کر جدید ادبی زبان بن گئی:

''اردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔مولانا محمود خاں شیرانی کو بھی ماننا پڑا کی اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے۔وہ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔زبان کا مولد وہی ہوتا ہے۔جہاں وہ بلاشرکتِ غیرے بولی جائے۔پنجاب ،اودھ، دکن، بہار، گجرات، بمبئی، وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سِکہ چلتا ہے، اردو کے پہلو بہ پہلو

دوسری زبانیں بھی ہیں ۔ کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے بول چال کی زبانیں اور ہیں ۔ کہیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں ۔ کہیں شہر کی زبان اردو ہے، دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے ہیں ۔لیکن یو پی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں ۔صرف اردو ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ یو پی کے مغربی اضلاع میں ہندو مسلمان سب اردو بولتے ہیں۔ وہ ہندو کی زبان بھی ہے اور مسلمان کی بھی ۔ دوسرے مقامات میں وہ صرف مسلمان کی زبان ہے۔ مسلمان اردو بولتے ہیں۔ ہندو مقامی زبان استعمال کرتے ہیں ۔مثلاً تامل کے علاقے میں مسلمانوں کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ بازار اور ہاٹ میں بدستور تامل کا سکہ چلتا ہے۔'' (۳۰)

ڈاکٹر شوکت سبزواری اگرچہ اردو کو ایک قدیم زبان مانتے ہیں اور مسلمانوں کی برِصغیر آمد سے قبل اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اردو زبان کے ارتقا اور فروغ میں مسلمانوں کی آمد کو ایک اہم موڑ گردانتے ہیں:

''اردو کا مسلمانوں سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی ''ساختہ'' نہ سہی پرداختہ ضرور ہے۔'' (۳۱)

ڈاکٹر مسعود حسین نے ہریانی، کھڑی اور میواتی بولیوں کو اردو کا ماخذ قرار دیا لیکن مزید تجزیے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو نواح دہلی کی کھڑی بولی سے ہی وقوع پذیر ہوئی ان کے بقول:

''اس زبان کی بنیاد اس بولی پر ہے جو میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی ہے۔ یعنی کھڑی بولی۔''(۳۲)

نواب مولوی منظور جنگ بہادر نے بھی اردو زبان کو گنگا اور جمنا کے دوآبہ کی فضاؤں میں پرورش پا کر جوان ہوتے دیکھا اور ان کے مطابق ہر گھاٹ کا پانی پی کر اس کے آب و تاب میں اضافہ ہوا:

''فی الوقت ہمارا روئے سخن اردو سے ہے جس نے گنگا جمنا کے دوآبہ میں آنکھ کھولی اور اسی آب و ہوا میں پرورش پائی ۔ اس چشمہ کی سوتیں مقامی زبانیں تھیں جو خود لنڈ منڈ اور قلاچ تھیں ۔ پھر جب اہلِ ذوق کی آغوش تربیت میں عرب و عجم کا غازہ اس کے روئے زیبا پر چڑھایا گیا تو آناً فاناً میں چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ اس کے آگے بلبلِ شیراز کی نغمہ سرائیاں اور نطقِ اعرابی

کے زمزمے پانی بھرنے لگے۔'' (۳۳)

مولوی عبدالحق اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اس حوالے سے نظریات ان کے خطبات، مقدمات، تنقیدی تبصروں اور مضامین میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اردو زبان کی ابتدا، تاریخ، اسکی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت اور اردو کی برِ صغیر کی دوسری زبانوں پر فوقیت پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے دیگر ماہرینِ لسانیات کے اس وقت تک موجود نظریات کو خصوصی طور پر سامنے رکھا اور ان پر اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کیا۔ دراصل مولوی عبدالحق اردو سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کی اس زبان کو ترقی ملے اور اس کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہو۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ دن رات کوشاں رہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اردو کے قدیم ذخیرہ کو کھنگالنے میں گزار دی اور ایسے ایسے جواہر ان کو اس ذخیرہ سے ملے جن سے اردو زبان کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوگئی۔

مولوی عبدالحق نے اردو کے قدیم ذخیرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد اردو زبان کے آغاز کے بارے میں اپنے تحقیقی نتائج پیش کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات میں ایک پختگی نظر آتی ہے۔ وہ جو بھی نظریہ پیش کرتے ہیں اس میں ایک منطقی انداز اختیار کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو انتہائی مدلل انداز میں واضح کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے ان کے نظریات اپنے اندر کافی وزن اور اثر لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اپنے اندر تحقیق اور جستجو کا جذبہ رکھتے تھے اور اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو انہوں نے اردو زبان کے مختلف مسائل کے لیے وقف کیے رکھا۔ اپنے اسی جستجو کے جذبے کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''زبان کے رسم الخط، املا اور انشا میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔ اردو کی تاریخ اور اس کی نشو و نما میں بہت سی منزلیں ابھی ڈ کرنی باقی ہیں۔ شاہ راہِ زبان سے مختلف شاخیں ایسی پھوٹتی ہیں جن کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ مثلاً خود اُردو اور اس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں۔ ان میں باہم کیا تفاوت اور تعلق ہے اور ملک میں اُن کا کیا درجہ ہے؟

زبان کی ترقی و اشاعت کی بہت سی ایسی تجویزیں ہیں جو ابھی تک عالمِ خیال سے صفحہ قرطاس پر نہیں آئیں۔ ان پر بحث کرنا، ان کا جانچنا اور ان کو عمل میں لانا بھی بڑا کام ہے۔'' (۳۴)

مولوی عبدالحق اردو کی ارتقائی منازل کو کھوجنے میں ایک مقصد رکھتے تھے اور یہ مقصد اردو زبان کی ترویج اور ترقی تھا۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اردو کن کٹھن منزلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اس میں ہمارے بزرگوں کی کس قدر محنت شامل ہے۔ پھر انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ یہ کسی خاص طبقے یا کسی خاص علاقے کی زبان نہیں بلکہ اس کی پرورش کرنے میں برِصغیر کے سب طبقوں اور علاقوں کے لوگوں نے حصہ لیا اور اس طرح یہ ہمہ گیر زبان وجود میں آئی۔ اس لیے بلا تفریقِ قوم و مذہب اس کو فروغ دنیا اور اس کی حفاظت کرنا سب کا فرض ہے۔ چنانچہ اردو کی اسی ہمہ گیریت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''سارے ہندوستان میں زبانوں کا ایک نسا جال پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں اتنی زبانیں نہیں بولی جاتیں جتنی ہمارے دیس میں۔ اُتر والا دکھن میں اور دکھن والا پورب اور پچھّم میں ایسا ہی اجنبی ہے جیسا کوئی ہندوستانی افریقہ کے کسی خطے میں۔ ندرت کے خیال سے اگر کوئی اس پر فخر کرے تو شاید بے جا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بھی ملک کی ایک بڑی بدنصیبی ہے۔ قومی اتحاد کے مستحکم کرنے اور قوموں کے بنانے میں زبان کا بھی حصہ ہے۔ جہاں زبانیں اس کثرت سے ہوں جتنی یہاں ہیں، وہاں خیالات کی اشاعت اور باہمی اتحاد میں ضرور مشکل پیش آتی ہے اور یہ مشکل اس وقت ہمارے سامنے بھی ہے۔ لیکن اس افراتفری میں امید کی ایک جھلکی اس میں نظر آتی ہے کہ انھی زبانوں میں ایک ایسی بھی ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں بولی جاتی اور اکثر حصوں میں سمجھی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی اس قدر کثیر ہے کہ ہندوستان کی کسی اور زبان کو نصیب نہیں۔ اسے اب آپ اردو کہیے یا ہندُستانی۔ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ اس کی کوئی قوم اور ذات ہوتی ہے۔ اردو کی سرشت اور ساخت اس قسم کی ہے اور اس کی نشوونما اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ وہ بلا لحاظ قوم و ملت تقریباً سارے ہندُستان کی زبان ہے یا ہو سکتی ہے۔'' (۳۵)

بابائے اردو، اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی زبان ہے جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی۔ ان کے مطابق اس کا مخلوط ہونا ایسا تھا کہ برِصغیر کی مقامی زبان نے باہر کی زبانوں کے اثرات قبول کئے اور یہ زبانیں آپس میں اس طرح گھل مل گئیں کہ ایک نئی زبان بن گئی:

''یوں تو دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں غیر زبانوں کے لفظ نہ پائے جاتے ہوں۔ کیونکہ کوئی قوم دُنیا میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتی۔ دوسری قوموں کے میل جول سے لامحالہ کچھ نہ کچھ لفظ ان کی زبان کے آہی جاتے ہیں۔ لیکن قطع نظر اس کے بعض زبانیں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں کے اثر اور میل سے کھچڑی بن گئی ہیں۔ یہ مخلوط زبانیں کہلاتی ہیں۔ ایک زمانے تک علمائے لسانیات کو مخلوط زبانوں کے وجود سے انکار رہا لیکن مابعد کی تحقیقات نے قطعی طور سے ثابت کر دیا ہے کہ ایسی زبانیں موجود ہیں۔ انہیں میں ہماری زبان اردو کا شمار ہے۔ خود ریختہ کا لفظ جو پہلے اردو کا معروف نام تھا، اس خیال کی تائید کرتا ہے۔'' (۳۶)

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے میر امن نے اپنی کتاب ''باغ و بہار'' میں اور سر سید احمد خان نے ''آثار الصنادید'' میں اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیا اور مختلف اطراف کے لوگوں کے شہنشاہ اکبر اور شاہجہاں کے ادوار میں پایہ تخت دہلی میں جمع ہو جانے اور ان کے آپس میں لین دین کرنے، سودا سلف لینے سے ایک کھچڑی زبان کے وجود میں آنے کا ذکر کیا۔ لیکن اس سلسلہ میں نہ ہی دلیل پیش کی اور نہ اس کھچڑی زبان میں شامل زبانوں کا ذکر کیا گیا اور نہ وہ اردو کی ارتقائی منازل کا سراغ لگا سکے۔ دراصل یہ دونوں شخصیات اردو زبان پر باقاعدہ تحقیق نہیں کر رہی تھیں بس ایک نظریہ پیش کر دیا گیا اور اس وقت یہی ان کے لیے بہت تھا۔ لیکن مولوی عبدالحق کا اردو کو ایک کھچڑی زبان کہنا صرف کہنے کی بات نہیں۔ انہوں نے اپنی بات باقاعدہ استدلال کے ساتھ کی اور اردو زبان کی بنیاد فراہم کرنے میں ان کے نزدیک جن زبانوں نے حصہ لیا ان کو اپنی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا۔ اگرچہ اس مخلوط زبان کو پروان چڑھانے میں برِ صغیر کی بہت سی زبانوں نے حصہ لیا جس کا حوالہ مولوی عبدالحق کے ہاں کافی جگہ پر ملتا ہے لیکن ان کے مطابق دو زبانیں ایسی تھیں جنہوں نے اردو کی تعمیر میں مرکزی کردار ادا کیا:

''مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی۔ جب انہوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں کی ایک مقامی بولی سے جو اب کھڑی بولی کہلاتی ہے اور جس کے معنی عوام کی بولی کے ہیں، فارسی کی مڈبھیڑ ہوئی۔ جیسے جیسے ہندو مسلمانوں میں میل جول بڑھتا گیا ان دونوں زبانوں میں بھی ربط ضبط بڑھنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یہ دونوں ایسی گھل مل گئیں کہ فارسی اور کھڑی بولی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور جوں جوں اسلامی سلطنت پھیلتی گئی اس کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور یہ

بولی جسے کوئی جانتا پہچانتا نہ تھا ہماری بدولت سارے ہندوستان میں پہنچی سلطنت کی فوجیں، صوفی درویش، علما و شعرا، عمال و حکام جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے اسے روشناس کرایا۔'' (۳۷)

اس طرح ان دو بنیادی زبانوں کے ملاپ سے ایک مخلوط زبان وجود میں آئی۔ یہاں پر مولوی عبدالحق دلچسپ بات یہ بیان کرتے ہیں کہ اردو بالکل ایک نئی زبان کے طور پر ابھرتی ہے اور ان دو زبانوں سے علیحدہ پہچان رکھتی ہے۔ مخلوط زبان کی وہ اس طرح تعریف کرتے ہیں:

''جسے ہم مخلوط زبان کہتے ہیں اس کی خاص حیثیت ہوتی ہے۔ مخلوط زبان سے مراد وہ زبان ہے جو دو زبانوں کے آپس میں گھل مل جانے سے ایک نئی صورت اختیار کر لے اور اس کا اطلاق ان دو زبانوں میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے جس سے مل کر وہ بنی ہو۔ اسی کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے دو اجزا کیمیائی طور سے اس طرح ترکیب دیے جائیں کہ وہ اپنی ہیئت، تاثیر اور خاصیت میں ایک نئی چیز بن جائیں۔ اب اس کا اطلاق ان دو اجزا میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے گا۔ یہی حال اردو کا ہے جو فارسی اور ہندی کے سنجوگ سے بنی لیکن اب ہم اسے نہ تو ہندی کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی۔ اردو ہی کہیں گے۔'' (۳۸)

مخلوط زبان کے وجود میں آنے کے اسباب پر بھی مولوی عبدالحق نے تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کے مطابق مخلوط زبان بننے کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب ملک گیری ہے۔ ایک طرح کی ملک گیری یہ ہوتی ہے کہ حملہ آور آیا اور لوٹ مار کر کے چلتا بنا۔ اس صورت میں فاتح کا اس ملک کی زبان پر اثر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فاتح نے کسی ملک کو فتح کیا اور اس کا مستقل الحاق اپنے ملک کے ساتھ کر لیا اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ فاتح جبراً اپنی زبان کو اس ملک میں رائج کر دیتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں فاتح کی زبان کا اس ملک کی زبان پر کوئی پائیدار اثر ممکن نہیں۔ مولوی عبدالحق کے خیال میں ملک گیری کی تیسری قسم ایسی ہے جو مفتوح ملک کی زبان کو براہِ راست متاثر کرتی ہے، وہ یہ کی فاتح آیا اور اس نے مفتوح ملک میں مستقلاً قیام کر لیا۔ اس طرح فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کو آپس میں تا دیر ملنے کا موقع ملتا ہے اور ان کے اس ملاپ سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان جنم لیتی ہے۔

چنانچہ مسلمان ہندوستان میں میں فاتح بن کر آئے اور پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے یہا

ں کے عوام کے ساتھ میل جول رکھا جس سے فارسی اور مقامی زبان کا ربط ضبط بڑھا اور اس طرح ایک مخلوط زبان نے جنم لیا۔ (۳۹)

یہاں پر مولوی عبدالحق مخلوط زبان کے حوالے سے ایک اصول کی وضاحت کرتے ہیں کہ فاتح اور مفتوح کے باہمی ملاپ سے کس کی زبان مخلوط ہوتی ہے۔ ان کے مطابق ہوتا یہ ہے کہ وہ غیر زبان جو کسی کو سیکھنی پڑے مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان مخلوط ہو جاتی ہے۔ پس یہی حال مسلمانوں کے آنے سے ہوا۔ فارسی جو اس وقت فاتح کی زبان تھی، مخلوط نہیں ہوئی بلکہ اس علاقے کی مقامی زبان مخلوط ہو کر رہ گئی اور ایک نئی زبان کی صورت اختیار کر گئی۔

اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں کہ جب کوئی غیر زبان سیکھی جاتی ہے تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ اس میں نہ آنے پائے اور جہاں تک ممکن ہو صحیح اور فصیح زبان بولیں۔ لیکن اپنی زبان بولتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا اور جدت کے شوق میں اپنی زبان میں دوسری زبان کے الفاظ بلا جھجک استعمال کئے جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ فاتح کی زبان کا لب و لہجہ تک اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر فاتح کی زبان کے بے دریغ استعمال سے اس کے لفظ اس طرح زبان پر چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی آدمی اپنی زبان میں بول جاتا ہے۔ چنانچہ برصغیر میں بھی یہی اصول کارفرما ہوا۔ جب مسلمان یہاں پر فاتح بن کر آئے تو مقامی لوگوں نے ان کی زبان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے اثر نے ان کی زبان کو مخلوط کر گیا:

''یہ عام اصول ہندوستان کے اسلامی عہد میں بھی حرف بہ حرف عمل میں آیا۔ ملکی تسلط کے وقت فاتح قوم کی زبان فارسی تھی۔ امرا، بادشاہ، دربار اور دفتر میں رسائی کا بڑا ذریعہ یہی زبان تھی اور جیسا کہ ہونا چاہیے اور ہوتا آیا ہے اہلِ ہند نے فارسی سیکھنی شروع کی اور ایسی سیکھی کہ استاد ہو گئے۔ فارسی کا جاننا حصولِ علم و معاش ہی کی خاطر نہ تھا بلکہ فارسی تہذیب و شایستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور جیسا کہ دستور ہے فیشن میں داخل ہو گئی تھی۔ متواتر مطالعے، انشا و شعر و سخن کی مشق سرکاری اور دفتری نوشت و خواند کی وجہ سے اہلِ ملک کی طبائع میں ایسی رچ گئی تھی کہ انہوں نے فارسی لفظ ملکی زبان میں بلا تامّل داخل کرنے شروع کر دیے۔'' (۴۰)

مولوی عبدالحق کے نظریات اگرچہ اپنے اندر فکری پختگی لیے ہوئے ہیں لیکن بعض مواقع پر ان کے

اندر تضاد موجود ہے جو ان کی بات میں الجھاؤ پیدا کرتا ہے مثلاً وہ بار ہا یہی کہتے اور دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مفتوح کی زبان پر فاتح کی زبان کا اثر ہوتا ہے اور مفتوح کی زبان اپنی خوبیاں ترک کر کے ایک نئی زبان کا روپ دھار تی ہے۔ اس صورت میں فاتح کی زبان بالکل غیر متاثرہ رہتی ہے۔ لیکن اپنے ایک مضمون میں جب وہ دونوں زبانوں کی تبدیلی اور قربانی کا ذکر کرتے ہیں تو بات میں تضاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے:

''مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک اور بات بھی عمل میں آتی ہے جو قابلِ غور ہے۔ یعنی ان میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آ جائے اپنی بعض خصوصیات ترک کرنی پڑتی ہیں اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس طرح دونوں میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہے جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہے۔ اردو کے بننے میں بھی یہی ہوا۔ فریقین یعنی ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کی۔ اپنی مخصوص خصوصیات ترک کیں اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان بنی اسے اختیار کرلیا۔'' (۴۱)

سید قدرت نقوی نے مولوی عبدالحق پر اعتراض کیا ہے۔ ان کے مطابق کسی بھی زبان کو مخلوط کہنا درست نہیں اور دنیا کی کوئی بھی زبان مخلوط نہیں ہوتی۔ البتہ زبان کو متاثرہ کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے اچھے پڑھے لکھے طبقے میں ایک خیال جڑ پکڑ گیا ہے کہ زبان بھی مخلوط ہو سکتی ہے، حالانکہ لسانیات میں مخلوط زبان کا کوئی بھی وجود نہیں۔ جو حضرات مخلوط زبان کے وجود کے قائل ہیں، وہ غلط فہمی کا شکار ہیں اور ان کی غلط فہمی اس بنا پر ہے کہ انہوں نے الفاظ (اسما) کو بڑی اہمیت دے دی ہے۔ حالانکہ لسانیات میں اسما کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر کسی زبان کے الفاظ (اسما وغیرہ) داخل ہو جائیں تو وہ زبان مخلوط ہو گئی کیونکہ اس کے اجزائے ترکیبی میں دو زبانیں شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق بھی اسی نظریے کے قائل نظر آتے ہیں۔'' (۴۲)

اس بات پر ماہرینِ لسانیات متفق نظر آتے ہیں کہ جب بھی دو یا دو سے زیادہ زبانیں آپس میں ملتی ہیں تو ایک دوسرے کو صرف اسما اور صفات کی حد تک متاثر کرتی ہیں اس طرح ان کی اپنی صرف ونحو میں کسی قسم کی تبدیلی

نہیں ہوتی اور زبان کا بنیادی ڈھانچہ غیر متاثرہ رہتا ہے۔ دراصل مولوی عبدالحق بھی اس اصول کی حمایت کرتے ہیں اور زبان کے مخلوط ہونے سے ان کی مراد بھی اسما اور صفات کی حد تک دوسری زبانوں کے اثرات ہیں۔ چنانچہ اردو کے مخلوط ہونے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ بھی ایک مسلم اصول ہے کہ غیر زبان کے لفظ جو کسی زبان میں داخل ہو جاتے ہیں یا کسی زبان کو مخلوط کرتے ہیں تو وہ اصلی زبان کی صرف ونحو کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہی صورت اس مخلوط زبان اردو میں پیش آئی کہ فارسی کا اثر اسما وصفات تک رہا۔ البتہ بعض حروف عطف مثلاً: اگر، مگر، اگرچہ، لیکن وغیرہ آ گئے۔ اصل صرف ونحو بالکل ویسی زبان کی رہی اور جب ضرورت پڑی فارسی، عربی لفظوں کو ہندی قالب میں ڈھال کر اپنا بنا لیا۔ مثلاً عربی الفاظ: بَدَل، کفن، دفن، قبول، بحث سے بدلنا، کفنانا، دفنانا، قبولنا، بحثنا مصدر بنا لیے اسی طرح فارسی سے بخشنا، فرمانا، نوازنا، داغنا وغیرہ بنا لیے گئے۔ یہ سب اردو ہو گئے، فارسی عربی نہیں رہے۔'' (۴۳)

چنانچہ وہ اردو زبان کی اصل اس ہندی کو قرار دیتے ہیں جو دہلی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی اس زبان میں عربی فارسی اور دیگر زبانوں کے اثرات صرف اسما وصفات کی حد تک ہوئے لیکن زبان کا بنیادی ڈھانچہ جوں کا توں رہا البتہ ان زبانوں کی ملاوٹ سے اس میں خوبصورتی پیدا ہو گئی اور اس کے حسن میں اضافہ ہوا:

''اُردو کے ہندی نژاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں، کیوں کہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسما و صفات میں ہوا ہے ورنہ زبان کی بنیاد یہیں کی زبان پر ہے۔ تمام حروف فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں، افعال سب ہندی ہیں۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے اور عربی فارسی الفاظ میں شان وشوکت، اور زبان کے لیے ان دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہے۔ عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت اور نحو میں بلکہ خیالات میں بھی وسعت پیدا کر دی ہے، جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا اور وہ زیادہ وسیع اور کارآمد بن گئی۔'' (۴۴)

اس طرح مولوی عبدالحق کے اردو زبان کے آغاز کے نظریے کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ دراصل

اردو کو ہندی پراکرت کی نکھری ہوئی شکل ہی سمجھتے ہیں جس نے دوسری زبانوں کے اسما اور صفات کو اپنے اندر جذب کیا اور ان الفاظ سے ملاپ کے باوجود اس زبان نے اپنی اصل کو قائم رکھا۔ یہ ہندی زبان اس وقت تک شائستگی کے درجے کو پہنچ چکی تھی۔ جب اس کا دیگر زبانوں خصوصاً فارسی کے ساتھ ملاپ ہوا تو اس کے حسن اور نکھار میں مزید اضافہ ہوا اور اس نے اردو کا روپ اختیار کر لیا:

''اُردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہے۔ ہندی بولی اور فارسی کے میل سے بنی ہے۔ اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں وہ زمانہ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدّا پن اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقت تھی بالکل جاتی رہی، اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف سیدھے سادھے رہ گئے جس سے زبان میں لوچ، گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی ۔۔۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے اور عربی فارسی الفاظ میں شان وشوکت، اور زبان کے لیے ان دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہے۔ عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت اور نحو میں بلکہ خیالات میں بھی وسعت پیدا کر دی ہے، جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا اور وہ زیادہ وسیع اور کارآمد بن گئی۔ مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم ہے، ہندی ہی ہے۔'' (۴۵)

اس طرح جب مقامی ہندی زبان اردو کا روپ دھارنے لگی تو نہ صرف اس کے اپنے الفاظ نے ایک سلیقہ اور شائستگی اختیار کی بلکہ دوسری زبانوں کے جو الفاظ اس میں شامل ہوئے ان کو اپنا بنانے کے لیے ان کے لہجے اور حرکت وسکون میں بھی ایک تغیر رونما ہوتا ہے جس سے یہ الفاظ اس زبان کا حصہ بن کو یہیں کے ہو جاتے ہیں:

''عربی کے جو لفظ عام طور پر اُردو میں بہ تبدیلِ حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زدِ خاص وعام ہو گئے ہیں وہ اسی طرح فصیح ہیں خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ہوں۔ ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ ہوتے ہیں تو لہجے کے تغیر سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے۔'' (۴۶)

مولوی عبدالحق نے نہ صرف اردو کی بنیادیں فراہم کرنے والی زبانوں کا سراغ لگایا بلکہ ان تہذیبوں اور قوموں کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے جنھوں نے اردو کی اساس استوار کرنے میں حصہ لیا۔ وہ اردو کی

پیدائش کو ہندوستان کی تاریخ کا عجیب وغریب واقعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی غلط کہتے ہیں کہ اردو کی تعمیر صرف مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی اور یہ کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلکہ ان کے مطابق اس کو بنانے میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کا کردار ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو انہوں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے میل جول بڑھایا جو ہندو تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی زبان کو سمجھنے کے لیے فارسی کو مدرسوں میں پڑھایا جانے لگا۔شہنشاہ اکبر کے دور تک سلطنت کا حساب کتاب ہندی زبان میں رکھا جاتا تھا لیکن راجا ٹوڈرمل نے احکامات جاری کئے کہ آئندہ حساب کتاب فارسی میں رکھا جائے گا۔اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فارسی ہندوؤں کی بول چال اور تحریر اور تقریر میں رچ بس گئی اور اس کے بے شمار الفاظ ہندی

زبان کا حصہ بننے لگے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق اردو زبان کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی ۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں اس نے جنم لیا لیکن صرف مسلمان اس کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔ یہ درحقیقت اس زمانے کے ماحول اور اس تمدن اور تہذیب کی مخلوق تھی جو مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئی اور جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں اور اردو کے بنانے میں تو (یہ میرا ذاتی خیال ہے) ہندو شریکِ غالب تھے۔''(۴۷)

مولوی عبدالحق اپنی بات بے حد سادہ اور عام فہم انداز میں کرتے ہیں اور سامنے کی مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔اس حوالے سے انہوں نے انگریزی زبان کی مثال دی ہے جو ایک فاتح قوم کی زبان تھی:

''جب انگریزوں کا اس ملک میں تسلط ہوا اور ہمارے نوجوانوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی ، انگریزی دفتروں میں ملازمت کی اور انگریزی بولنے اور لکھنے کی مشق بہم پہنچائی تو جب وہ اپنی زبان بولتے تو آدھی انگریزی اور آدھی دیسی زبان ہوتی تھی لیکن برخلاف اس کے جب کوئی انگریز اردو یا دیسی زبان بولتا تو یہ کوشش کرتا کہ اس کی گفتگو میں کوئی انگریزی لفظ نہ آئے ۔اب جو اردو میں سینکڑوں انگریزی لفظ داخل ہو گئے ہیں تو کیا یہ انگریز نے داخل کئے ہیں؟ یہ سب ہم نے اپنی خوشی سے داخل کئے ہیں۔ یہی حال اس وقت ہندوؤں کا تھا کہ وہ خوشی

خوشی بلکہ از راہِ فخر فارسی لفظ ہندی میں ملاتے چلے گئے۔'' (۴۸)

مولوی عبدالحق نے اردو زبان پر ہونے والے اعتراضات کا بھی بخوبی جواب دیا اور ساتھ ہی اردو کے مخلوط زبان ہونے کو کوئی قباحت نہیں بلکہ اسکی خوبی قرار دیا۔ ان کے بقول یہ زبان ہندو مسلم اتحاد کی علامت ٹھہری، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندو مسلم دونوں تہذیبوں کے ملاپ سے بنی تھی۔ چنانچہ اس کی خوبی کو مخالفینِ اردو نے عیب گردانا کہ یہ خالص زبان نہیں ہے۔

'' کہتے ہیں کہ یہ خالص زبان نہیں مخلوط ہے۔ اس لیے ملکی زبان نہیں ہوسکتی۔ بے شک یہ مخلوط ہے اور مخلوط ہونا ہی اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہے کہ یہی زبان قومی زبان ہونی چاہیے۔ یہ سب کی بولی ہے۔ ملک کے اکثر علاقے اور قومیں اس کے بنانے میں شریک رہی ہیں۔'' (۴۹)

مولوی عبدالحق کی نظر میں زبانوں کے ملاپ کے باعث اردو زبان میں بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے۔ جب کھڑی بولی میں فارسی زبان کا پیوند لگا تو اس سے اس زبان کے ذخیرہ الفاظ میں بے بہا اضافہ ہوا۔ خصوصاً مقامی زبان کے الفاظ کو جب فارسی کے مترادفات ملے تو اس سے خیالات میں صفائی اور صحتِ بیان پیدا کرنے میں مدد ملی اور ساتھ ہی ایک ہی لفظ کی بار بار تکرار سے جو زبان میں بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے وہ بھی رفع ہو گیا اور کلام میں حسن پیدا کرنے میں مدد ملی۔ لکھتے ہیں:

'' عوام کی زبان کھڑی بولی جس پر اردو کی بنیاد ہے اس قدر محدود تھی کہ اگر اس میں فارسی عنصر شریک نہ ہوتا تو وہ کبھی علم و ادب کے کوچے سے آشنا نہ ہوتی اور اس وقت جو اردو میں اظہارِ خیال کے نئے نئے ڈھنگ پیدا ہو گئے ہیں وہ ان سے محروم رہتی۔'' (۵۰)

بابائے اردو صرف ایک بات کہہ نہیں دیتے بلکہ وہ اپنی بات کو استدلال کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔ مثالوں کے ذریعے اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہیں اور اپنی تحقیق کی عمارت ٹھوس شواہد پر تعمیر کرتے ہیں۔ چنانچہ زبان کے اس وسعت پذیر ہونے کے حوالے سے اپنی بات کو اس طرح مثالوں سے واضح کرتے ہیں:

'' اردو میں ہندی اور فارسی لفظ مِل جُل کر شیر و شکر ہو گئے ہیں اور عام بول چال، محاوروں اور کہاوتوں میں بے تکلف آ گئے ہیں مثلاً تم کس باغ کی مولی ہو۔ اِٹّے دُٹّے کی خیر۔

اشرفیاں لُٹیں اور کوئلوں پر مُہر۔ ایک آنکھ میں شہد ایک آنکھ میں زہر، لاکھ کا گھر خاک کا ہو گیا،
اللہ کا دیا سر پر، خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ بد اچھا بدنام بُرا، بدن پر نہیں لتّا پان کھائیں البتہ۔
باہمن مشری بھاٹ خواص، اس راجا ہوئے ناس وغیرہ وغیرہ سینکڑوں کہاوتیں ہیں۔ یہی حال
محاوروں کا ہے مثلاً :۔ اللہ بیلی، آنکھوں میں خار لگنا، خُدا لگتی کہنا، آنکھوں پر پردہ پڑ جانا، لہو لگا
کے شہیدوں میں ملنا، اللہ میاں کی گائے۔

مخلوط زبان میں ایک آسانی مرکب الفاظ کے بنانے میں بھی ہوتی ہے۔ دیکھیے ہندی
فارسی کے میل سے کیسے اچھے اچھے مرکّب لفظ بن گئے ہیں مثلاً دل لگی، نیک چلن، جگت اُستاد، بھتیج
داماد، گھر داماد، سمجھ دار، گنڈے دار، اُگال دان، عجائب گھر، کفن چور، جیب گھڑی، امام باڑہ،
مونچھ زور وغیرہ وغیرہ ہزاروں مرکّبات ہیں۔'' (۵۱)

یہی وجہ ہے مولوی عبدالحق نے ہمیشہ ان کوششوں کی مخالفت کی جن کے ذریعے اردو زبان سے
بدیسی الفاظ نکالنے کی بات کی گئی۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ اب یہ الفاظ اردو کے گلدستے کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کو اردو
زبان سے خارج کرنا کسی صورت جائز نہیں بلکہ یہ سراسر نادانی ہے:

''غرض ہماری زبان ایک خوش اور ہرا بھرا گل دستہ ہے جس میں رنگ بہ رنگ کے خوب
صورت پھول اور نازک پتّیاں ہیں۔ کیا ہم اس وہم سے کہ اس میں گلاب بدیسی ہے اور کچھ
پتّیاں باہر کے پودوں کی ہیں انہیں نوچ کر پھینک دیں گے؟ اگر کوئی ایسا کرے تو سراسر نادانی
ہے۔'' (۵۲)

دراصل مولوی عبدالحق زبان کے فروغ میں معاشرتی، نفسیاتی اور تہذیبی عوامل کو بہت زیادہ اہمیت
دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کسی علاقے اور قوم کے حالات ہیں جو اس کو کسی زبان کی طرف راغب کرتے ہیں۔
تہذیبوں کے ارتقا کے ساتھ زبانوں کا ارتقا ہوتا ہے۔ جب ایک سے زیادہ تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو غالب تہذیب کی
زبان بھی غالب رہتی ہے اور دیگر زبانوں پر اپنے واضح اثرات مرتب کرتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ برتر تہذیب کی زبان
کا یا تو رنگ دوسری زبانوں پر چڑھ جاتا ہے اور یا وہ ان کو بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اور پھر ان کے مطابق زبانوں
کے فروغ کا نفسیاتی پہلو بھی یہی ہے کہ مفتوح تہذیب کے لوگ ہمیشہ فاتح کی زبان کو اپناتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں

اور اپنی زبان میں بے دریغ ان کی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ فاتح کی زبان اپنی نفسیاتی برتری کے باعث دوسری زبانوں پر چھا جاتی ہے۔اس حوالے سے انہوں نے تاریخ سے بہت سی مثالیں دی ہیں:

''جیسے آریاؤں کا ہندوستان میں آنا کہ وہ بالکل یہاں منتقل ہو گئے یا اُن کے مختلف قبائل فاتح کی حیثیت سے آگے پیچھے مسلسل طور پر یہاں آکر بس گئے ۔دیسیوں کو یا تو مار بھگایا، غلام بنا لیا یا اپنے میں جذب کر لیا۔ ملک کے بڑے حصّے پر انہیں کی زبان چھا گئی اور بعد میں اس سے بگڑ بگڑا کر یا خلط ملط ہو کر دُوسری پراکرتیں پیدا ہو گئیں ۔یا جیسے اہلِ یورپ کا امریکہ یا آسٹریلیا پر مسلّط ہو جانا، جہاں انہیں کی زبان کا بول بالا ہے اور سب ایک ہی زبان بولتے اور پڑھتے لکھتے ہیں۔'' (۵۳)

انہوں نے انگریزی کی مثال دی کہ انگریز بھی اس ملک میں فاتح بن کر آئے ۔اس طرح ان کو نفسیاتی برتری حاصل تھی چنانچہ ہندوستان کے لوگوں نے ان کی زبان سیکھنے اور اپنی زبان میں انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے میں ضرورت سے زیادہ مستعدی دکھائی۔ (۵۴)

مولوی عبدالحق زبان کو زندگی کا ایک حصہ سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زبان کے مطالعہ کو انسانی حیات کا مطالعہ قرار دیا۔ان کے نزدیک انسانی تہذیب وتمدن کے ساتھ زبان کا چولی دامن کا ساتھ اور ان دونوں کو الگ رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا:

''حضرات! زبان صرف اظہارِ خیال کا آلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جز ہے ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہے وہ اپنی بساط کے موافق اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑتا جاتا ہے۔اس میں ہمارے تمدّن وشائستگی ،خیالات وجذبات ، تجربات اور مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے ہر لفظ ایک زندہ شے ہے جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے ۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت ومشقت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدّس میراث ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے۔'' (۵۵)

پس اردو زبان کے آغاز کا محرک بھی یہی نفساتی ،تہذیبی اور معاشرتی وجوہات تھیں ۔مسلمان کیونکہ فاتح کی حیثیت سے برِصغیر میں آئے اس لیے ان کی تہذیب نے یہاں کی زبان پر گہرے اثرات مرتب کئے اور ان کی

زبان فارسی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا:

''یہی حال مغلوں کی حکومت کا تھا جب کہ یہاں فارسی کا رواج ہوا مغلوں کی حکومت میں ہندوستان کی کایا بدل گئی۔ وہ اس ملک میں اپنے ساتھ نئے آئین اور نئے اصولِ حکومت اور نیا مذہب لائے۔انہوں نے نئی تنظیم اور نئی حکمت کو رواج دیا اور نئے تمدّن اور نئی معاشرت کا دور شروع ہُوا، نئے آدابِ مجلس، نئے رسم و رواج اور نئے ذوق نے رواج پایا۔ان کے ساتھ طرح طرح کے کپڑے، قالین اور فرش فروش، سامانِ آسائش، نئے آلاتِ جنگ، نئے پھول اور پھل اور نئے قسم کے کھانے، نئی قسم کی صنّاعی، نئی قوم کی اصطلاحات اور الفاظ یہاں آئے اور رائج ہوئے۔انہوں نے یہاں کے حالات میں ایک عجیب تغیّر پیدا کر دیا اور سارے ماحول میں ایک نیا رنگ روپ نظر آنے لگا۔ اس جدید ذوق، اس جدید تہذیب اور جدید خیالات کے ادا کرنے کے لیے جو اس ماحول میں ساری تھے، سوائے فارسی کے کوئی دوسری زبان نہ تھی۔۔۔۔فارسی کی طرف یہ عام رجحان جدید حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا۔'' (۵۶)

مولوی عبدالحق زبان کی معاشرتی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ایک اہم معاشرتی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق زبان حالات کے مطابق اپنے انداز بدلتی رہتی ہے۔گویا یہ ایک زندگی کے جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔زندگی کا ایسا جزو جو اس سے کبھی جُدا نہیں ہوتا۔ان کے بقول:

''اس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔زبان کی ترقّی و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے۔یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات، تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔'' (۵۷)

اگر چہ دنیا کی ہر زبان قومی دھارے سے منسلک ہوتی ہے اور اس کی جڑیں اپنے علاقے کی تہذیب و معاشرت کے اندر پیوست ہوتی ہیں لیکن اردو زبان کا معاملہ اس حوالے سے سب سے زیادہ قوی ہے۔مولوی عبدالحق اس کو ہمارا ایک عظیم قومی سرمایہ سمجھتے ہیں جس کو موجودہ صورت تک پہنچانے میں ہماری تہذیب کے کئی ادوار نے حصہ لیا:

''قومی زبان کی اہمیت اور قوّت و اثر کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔اس کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرّہ، اس کی ہر ہر ترکیب ہماری تہذیب، ہمارے آداب اور ہماری

معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ وتہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے جس کی تہ میں ہماری زندگی کے نقوش کا اِک نسا جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہمارے اسلاف کی صدہا سال کی دماغی و ذہنی، اخلاقی و روحانی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس زبان نے جسے ہماری قومی زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہر دور میں زمانے کا ساتھ دیا اور ادب و معاشرت، سیاست اور علم وفن کی ضروریات کو کماحقہٗ پورا کیا اور کبھی اُس کی طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔'' (۵۸)

اسی حوالے سے مولوی عبدالحق نے بعض لوگوں کے اس اعتراض کی بھی وضاحت کی جو یہ کہتے ہیں کہ اردو زبان مسلمان بادشاہوں نے بنائی اور طاقت کے زور پر جبراً پھیلائی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ دراصل یہ لوگ اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں اور لسانیات کے اصولوں سے بھی نابلد ہیں کہ کوئی زبان طاقت کے زور پر نہیں رائج کی جاسکتی صرف معاشرتی ضرورت اور حالات ہی کسی زبان کے وجود کا باعث بنتے ہیں:

''یہ زبان فطری اصول پر خود بہ خود بنی اور حالات وضروریات نے اسے اور بڑھایا اور پھیلایا۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ دکن کے بعض بادشاہوں نے اس زبان میں نظمیں لکھیں لیکن ان کے دربار اور دفتر کی زبان بھی فارسی تھی اور اگر وہاں کسی زبان کو دخل ہُوا تھا تو وہ مقامی زبان تھی نہ کہ اردو یا ہندوستانی۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے یہ محض معاشرتی ضرورتوں کی بدولت وجود میں آئی اور اس کے بنانے میں زیادہ تر حصہ خود اہلِ ملک یعنی ہندوؤں کا تھا۔'' (۵۹)

مولوی عبدالحق کے نزدیک زبانیں بادشاہوں کے ذریعے نہیں پھیلتیں بلکہ ان کی جڑیں عوام میں ہوتیں ہیں اور وہی ان کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں جب تک اسلامی حکومت رہی دربار اور سرکاری دفاتر کی زبان فارسی رہی۔ یہاں تک کہ ہندو راجاؤں نے بھی اپنی سرکاری و دفتری زبان فارسی ہی کو رکھا۔ خود بادشاہ بھی فارسی بولتے اور لکھتے تھے۔ اس لیے وہ سوال کرتے ہیں کہ:

''لیکن کسی نے اب تک یہ نہ بتایا کہ کون سے مسلمان بادشاہ تھے۔ جنھوں نے یہ نیک

کام انجام دیا۔'' (۶۰)

اسی طرح اعتراض کرنے والوں نے یہ بھی اعتراض کیا کہ یہ درباری زبان ہے اور صرف دربار کے لیے موزوں ہے۔ مولوی عبدالحق اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ درباری زبان ہے۔ لیکن ان کے بقول یہ صرف درباری زبان نہیں بلکہ ہر مقام کے لیے مناسب اور ہر مقصد کو بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ہر طبقے کی زبان ہے:

''بے شک یہ درباری بھی ہے اور بازاری بھی، یہ عالموں کی بھی ہے اور عامیوں کی بھی، شہریوں کی بھی ہے اور دیہاتیوں کی بھی، یہ فلسفیوں کی بھی ہے اور سائنس دانوں کی بھی، یہ فسانوں کی بھی ہے اور داستانوں کی بھی دفتر کی مثلوں کی بھی ہے اور قصیدوں اور غزلوں کی بھی اور یہی اس کی سب سے بڑی فوقیت اور سب سے بڑی وجہ ترجیح ہے۔'' (۶۱)

سمپورنا نند جی نے اپنے صدارتی خطبے میں، جو آل انڈیا ہندی سہتیہ سمیلن کے پونا کے مقام پر ہوا، اردو کو ایک مصنوعی زبان قرار دیا۔ (۶۲)

مولوی عبدالحق کے نزدیک اردو کسی صورت میں مصنوعی زبان نہیں۔ یہ فطرت کے اصولوں کے مطابق بنی ہے۔ کسی انسان کی ذاتی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کو پروان چڑھانے میں تہذیبوں نے حصہ لیا:

''زبان انسانی زندگی، ضرورت اور خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی سازش یا چند لوگو ں کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ایک ایسی زبان کو جس کے بولنے والے کروڑوں انسان ہیں مصنوعی کہنا دن کو رات یا رات کو دن کہنا ہے۔'' (۶۳)

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ارتقائی منازل کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو کے آغاز کے حوالے دیگر نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ لیا اور ان کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا لیکن ان نظریات کی کمزوریوں کو واضح کیا۔ چنانچہ ان نظریات کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''اِس برِعظیم کا ہر علاقہ اس کا مُدّعی ہے کہ اس نے اُس کے ہاں جنم لیا۔ سندھ کا دعوا ہے کہ مسلمانوں کے قدم سب سے اوّل یہاں آئے اور ان کی برکت سے یہیں اس کا ظہور ہوا۔ ایک دن یہیں کے کھنڈروں میں اس کی آنول نال گڑی ملے گی۔ پنجاب والوں کا یہ کہنا ہے کہ

اوّل اوّل اِسلامی حکومت استقلال سے یہیں قایم ہوئی اور اس زبان کی بنا یہیں پڑی۔ اُردو سے قریب ترین کوئی زبان ہے تو پنجابی ہے۔ اہلِ گجرات کا دعوا ہے کہ اُردو زبان کو فروغ دینے والا انہیں کا خطّہ ہے۔ یہیں سے یہ اپجی اور یہیں اس نے ترقی کی۔ سب سے پُرانے ملفوظات اور اردو کی نظمیں یہیں ملتی ہیں۔ اور وؔلی جو اردو کا باوا آدم کہلاتا ہے گجرات ہی کا باشندہ تھا۔ اہلِ دکن اِس دعوے میں سب سے آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد تغلق کے زمانے سے اُردو کے قدیم یہاں آئے اور اُس کے وقت سے اب تک اس نے مسلسل ترقی کی۔ پُرانے اردو ادب کی ہر صنف کی تصانیف جس قدر یہاں ملتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ اور سب سے قدیم اُردو کی کتابیں بھی یہیں دست یاب ہوئی ہیں۔ اہلِ بہار بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں وہ وہاں کے بعض بُزرگوں اور اولیا کے ملفوظات پیش کر کے اِس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ اردو کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔ غرض ہر صوبہ اردو کے جنم کا مدّعی ہے۔'' (۶۴)

اپنے ایک مضمون میں انہوں نے حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اس نظریے سے اختلاف کیا ہے کہ اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی اور یہ کہ اس کی بنیاد پنجابی زبان پر ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے نظریے کو اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ مولوی عبدالحق ان کی اس بات کو اگرچہ سراہتے ہیں کہ حافظ محمود شیرانی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا صرف یہ قیاس ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی لیکن ساتھ ہی وہ شیرانی کے نظریے کی قیاس پر بنیادیں ہونے کے باعث اس کو رد کر دیتے ہیں۔ انہوں نے حافظ محمود شیرانی کی اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی گئے اور اپنے ساتھ وہاں کی زبان لے گئے اور آخر یہی زبان اردو کہلائی۔ لکھتے ہیں:

''یہ کسی صورت سے بھی تسلیم نہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو شخص پنجاب سے ہو کر یا وہاں رہ کر دہلی آئے تو وہ اپنی زبان دہلی میں رائج کر دے گا۔ اول تو یہ قیاس ہی صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی ہجرت پنجاب سے یکبارگی اس کثیر تعداد میں ہوئی کہ وہ دہلی پر اس طرح چھا گئے کہ انہیں کی زبان رائج ہو گئی اور سب اہلِ دہلی نے اسے اختیار کر لیا۔ دوسرے پنجاب کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہاں کوئی زبان مستقل طور سے بن سکتی۔ وہ اس زمانہ میں اس قدر پائمال رہا اور اس کی

حالت ایسی نا قابلِ اطمینان تھی کہ اس کی توقع ہی نہیں ہوسکتی تھی۔'' (۶۵)

اردو زبان میں پنجاب کے حصے کو مولوی عبدالحق اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں کی زبان کے کچھ الفاظ اردو زبان کے دھارے میں شریک ہوئے کیونکہ ہر زبان دوسری زبان کو متاثر کرتی ہے اور ایک زبان کے الفاظ کا دوسری زبان میں شامل ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اور اردو زبان نے تو ہر علاقے اور ہر تہذیب کی سیر کی اور برِ صغیر کی زبانوں کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کیا:

''باقی رہا یہ امر کہ بعض الفاظ پنجاب سے آئے اور وہ دہلی میں رائج ہو گئے تو اسے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں ہوسکتا۔ یہ ہر زبان میں ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ آ کر نہیں مل گئے۔ کسی زبان کے بننے کے لئے امن استقلالِ حکومت اور تہذیب و شائستگی کا ہونا ضروری ہے اور یہ دہلی ہی میں میسر ہوا۔'' (۶۶)

حافظ محمود شیرانی کا نقطۂ نظر ہے کہ سیاسی حوالے سے پنجاب کا اثر ہر دور میں دہلی پر رہا ہے اس لیے پنجاب کی زبان کا بھی دہلی میں کافی اثر و رسوخ رہا اور یہاں کی زبان مسلسل دہلی کا رُخ کرتی رہی جس سے لسانی اثرات کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے بقول:

''یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو، ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکارہ ہو جاتا ہے۔'' (۶۷)

مولوی عبدالحق اس بات سے اختلاف کرتے ہیں اردو اور پنجابی کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر اردو اور پنجابی میں کوئی مماثلت نظر آتی بھی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو زبان پنجابی سے ماخوذ ہے بلکہ یہ مماثلت اردو زبان کے پنجابی پر اثرات کی وجہ سے ہے:

''یہ خیال کہ پنجابی افعال کے آخر الف آتا ہے اور اردو میں بھی یہی ہے اسی لئے اردو پنجابی سے بنی ہے۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہندی کی شاخوں میں یہ صورت قدیم سے چلی آ رہی ہے

اور اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔۔۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ پنجابی میں جو تھوڑی
بہت مشابہت اردو سے پائی جاتی ہے وہ اردو کا اثر ہے نہ کہ پنجابی کا۔'' (۶۸)

حافظ محمود شیرانی مولوی عبدالحق کی ان کے نظریات سے مخالفت پر حیران ہوئے اور اس کا باقاعدہ اظہار انہوں نے اپنے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام ایک خط میں بھی کیا:

''عبدالحق صاحب کے تبصرے نے مجھ کو سخت مایوس کیا ہے۔ میں اس کو بیداد سمجھتا
ہوں۔'' (۶۹)

لیکن حافظ محمود شیرانی کے نظریے کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود وہ اردو زبان کے ارتقا اور اس کی نشو و نما میں پنجاب کے کردار سے انکار نہیں کرتے اور اردو زبان کا پنجاب سے تعلق ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''اردو پنجاب کے لیے کوئی نئی زبان نہیں۔ پنجاب سے اُردو کا تعلّق قدیم سے ہے۔
اور یہ آج سے نہیں صدیوں سے یہاں رائج ہے۔ اور اگر پنجاب میں اُردو ادب کا جائزہ لیا
جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر عہد میں یہاں اُردو کے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں اور اُردو لکھنے
پڑھنے کا شوق یہاں ہمیشہ رہا ہے۔ آپ کے شاعر مراد (متوفّی سنہ ۱۲۱۵ھ) اُن پہلے چند
حضرات میں سے ہیں جنہوں نے اُردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا۔ اُردو نے اگر
یہاں جنم نہیں لیا تو بھی اس کا بیج یہیں پڑا ہے۔ یہ صدیوں پہلے سے اسی طرح پنجاب کی تہذیبی
زبان رہی ہے جیسی آج کل ہے۔'' (۷۰)

ایک نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔ اس نظریے کی اساس یہ تھی کہ مسلمان کیونکہ سندھ کے راستے سب سے پہلے برِصغیر میں داخل ہوئے اس لیے انہوں نے سب سے پہلے یہاں کی زبان کو متاثر کیا اور اس طرح اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔ اس نظریے کی وضاحت پچھلے صفحات میں کی جا چکی ہے۔ مولوی عبدالحق اردو کی ترویج و ترقی میں سندھ کے کردار کے قائل ہیں لیکن جہاں تک اردو کے باقاعدہ آغاز کا تعلق ہے اس کو وہ رد کرتے ہیں:

''اے اہلِ سندھ! اگرچہ اُردو کی ابتدا آپ کے مُلک میں نہیں ہوئی لیکن سب سے پہلے مسلم
ہندو تہذیبوں کی یک جائی آپ ہی کے ہاں شروع ہوئی اور آپ ہی نے یک جہتی میں وہ رنگ پیدا کیا

جس کے نمونے کچھ دنوں پہلے تک دونوں قوموں کے رفتار و گفتار، خوراک و پوشاک وغیرہ میں نظر آتے تھے۔ اب بھی آپ کی زبان میں ہزاروں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ گویا آپ نے وہ زمین تیار کی جس پر آگے چل کر اُردو کے چمن نے رونق اور سرسبزی حاصل کی۔'' (۷۱)

جہاں تک دکن میں اردو زبان کے آغاز کا تعلق ہے اس حوالے سے بھی آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے دکن میں اردو زبان و ادب کے ذخائر کا کھوج لگانے کے حوالے سے بہت زیادہ کام کیا لیکن وہ اردو کی ابتدا دکن سے شمار نہیں کرتے بلکہ ان کے مطابق یہ مسلمانوں کے ساتھ دلی سے آئی:

''یہ زبان عوام کی تھی، بول چال کی تھی۔ دلّی سے چلی اور حکومت کے لشکر، صوبہ داروں، اہلِ عملہ، پیشہ وروں اور تاجروں کے ساتھ وسطِ ہند، راجپوتانہ، گجرات، دکن وغیرہ پہنچی۔'' (۷۲)

چنانچہ یہ زبان دلی سے دکن پہنچی تو مولوی عبدالحق کے مطابق اسے انتہائی تپاک کے ساتھ لیا گیا اور دکن میں یہ زبان عوامی اور ادبی حلقوں میں چھا گئی۔ یہاں کے حالات اس زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے بے حد سازگار تھے بادشاہ ادب پرور رویہ رکھتے تھے اور پورا ماحول اس زبان کو قبول کرنے کے لیے گویا منتظر تھا:

''یہ زبان جسے ہم دلّی کی زبان کہتے ہیں۔ صوفیوں اور درویشوں اور محمد تغلق کے ساتھ گجرات اور دکن میں آئی۔ محمد تغلق نے جب دولت آباد کو ہندستان کا دارالحکومت بنایا تو سارے دلّی کو وہاں لا بسایا اور ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگ وہاں آباد ہو گئے اور ان کے ساتھ یہ زبان بھی وہاں پہنچی اور ایسی پہنچی کہ کچھ دنوں کے بعد ادب و انشا کی مالک بن گئی اور شمال پر جو اس کا مولد و منشا تھا، فوقیت لے گئی۔'' (۷۳)

محمد تغلق کے بعد جنوب کا شمال سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے اور یہاں پر خود مختار حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح جو زبان دہلی سے بن کر آئی تھی اس پر دہلی کے مزید اثرات پڑنا بند ہو گئے۔ چنانچہ اب اس زبان پر مقامی اثرات منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس سے زبان کا تلفّظ کسی حد تک تبدیل ہوتا ہے اور رسم الخط میں معمولی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مقامی الفاظ اس زبان میں شامل ہونے لگتے ہیں جس سے اس کا ذخیرۂ الفاظ

مزید بڑھنے لگتا ہے۔البتہ یہاں پر فارسی کا اس طرح رواج نہ تھا جس طرح شمال میں فارسی زبان مقبول تھی ۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کی زبانوں کے ساتھ اس طرح مطابقت نہ رکھتی تھی اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کو فارسی سے دلچسپی تھی ۔اس طرح اردو زبان میں یہاں پر فارسی اثرات کا سلسلہ رک سا گیا۔ان تمام حالات سے زبان میں مقامیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔شہنشاہ اکبراور جہانگیر کے عہد میں اگر چہ یہاں پر شمال اور جنوب کے درمیاں چھیڑ چھاڑ رہی لیکن اس نے زبان پر زیادہ اثرات مرتب نہ کئے ۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبے دار مقرر ہوا تو پھر شمال اور جنوب کا رابط بحال ہوتا ہے۔خصوصاً اورنگ زیب کے ساتھ اس کا لشکر اور اس کی فوجیں دکن کے علاقے میں پہنچتی ہیں تو پھر ماحول میں ہل چل ہوتی ہے اور زبان کی نشو ونما میں دوبارہ تیزی پیدا ہوتی ہے۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعرا کا کلام دکن میں آتا تھا تو لوگ بڑے شوق سے پڑھتے تھے ۔اورنگ آباد کے اس وقت کے شاعر اور ادیب اپنی زبان کو دکھنی نہیں کہتے تھے بلکہ شمالی ہند سے منسوب کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اورنگ آباد اور حیدر آباد کے لب و لہجے اور زبان میں بہت فرق ہے۔گول کنڈہ کی فتح کے بعد یہ تعلق اور بڑھ گیا۔''(۴۷)

اسی طرح مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق مدراس میں بھی اردو اور فارسی کے ادیبوں کا اکٹھ ہوا اور شمالی ہند اور دوسرے مقامات سے شعرا اور ادیب جمع کئے گئے جس سے علم وادب کا چرچا ہوا اور ساتھ ہی اردو زبان کو بھی جلا ملی ۔گویا جنوب نے اس دور میں اردو کو ہر لحاظ سے پذیرائی بخشی ۔

مولوی عبدالحق جب اردو کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ اردو کا آغاز اگر چہ شمالی ہند سے کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا بیج شمالی ہند میں ڈالا گیا لیکن ان کی تحقیقات کے مطابق زبان کے پودے کی صحیح نشو ونما دکن کی آب و ہوا میں ہوئی ۔اپنی تصنیف 'قدیم اردو' میں لکھتے ہیں:

> ''اُردو نے اگر چہ شمالی ہند یعنی گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا۔لیکن وہ بات چیت ، کام کاج ،سودا سُلف تک محدود رہی ۔اہلِ علم نے اسے کبھی منہ نہ لگایا اور اس لئے اس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کھکھیڑ نہ اُٹھائی ۔سب سے اوّل ادبی صورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکنی کہلائی اور گروہ عوام سے نکل کر مجلسِ خواص میں آئی ۔شعرائے دکن جنکی تخیّل کی جولانگاہ فارسی زبان تھی ،اب اس نئی زبان میں طبع

آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہے گا اور اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہ ہوگی۔ اس امر کو ہمارے ہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

قائم کہتے ہیں۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اِک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اس میں دکنی زبان کی اس قدر تنقیص مقصود نہیں جس قدر اپنی تعلّی منظور ہے۔ ایک جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ہے

دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ'' (۷۵)

دکن کے ادیبوں اور شاعروں نے اردو زبان کو فارسی کے ساتھ ذریعہ اظہار بنایا۔ یہاں کے شاعروں نے فارسی تراکیب اور الفاظ کا اپنی شاعری میں کافی استعمال کیا ہے۔ اسی لیے مولوی عبدالحق اس خیال کو رد کرتے ہیں جس کے مطابق ایک زمانے تک ولؔی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا رہا اور آج تک بعض لوگ روایت کی پابندی کرتے ہوئے اسے باوا آدم کہہ جاتے ہیں۔ ان کے مطابق نہ ہی ولؔی اردو کے پہلے شاعر ہیں اور نہ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی زبان کو فارسی کے رنگ میں رنگا۔ دکن کے شعرا ولؔی سے بہت پہلے فارسی کی آمیزش اپنی زبان میں کر رہے تھے۔ اردو میں فارسی کی آمیزش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''دکن میں ہندی نے جب ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی۔ لیکن بہت سے ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں۔ اس وقت کے ادیب اور شاعروں نے دو دریاؤں کو جو مختلف سمت میں بہہ رہے تھے ایک نہر کھود کر لا ملایا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے اور ایرانی عشق کے پہلو نہ پہلو ہندی پریم کا جلوہ کھائی دیتا ہے۔ صورت ایک ہے مگر جلوے دو ہیں۔ بات ایک ہے مگر مزے دو ہیں۔'' (۷۶)

مولوی عبدالحق نے دکن میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا سراغ لگانے کے لیے وہاں کی تاریخ کا بغور جائزہ لیا۔ اس حوالے سے وہ خطہ گجرات کو کافی اہم سمجھتے ہیں اور ان عوامل کو سامنے لاتے ہیں جو یہاں پر اردو زبان کے فروغ کا باعث بنے اور اردو زبان کی ترقی میں معاون ہوئے۔ ان کے الفاظ میں خطہ گجرات اپنی خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان کے صوبوں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پر آنے والے سیاحوں اور شعرا نے ہمیشہ اس علاقے کی تعریف کی ہے اور یہاں کی آب و ہوا، حسن و نزاکت اور صنعت و حرفت کی کو سراہا ہے۔ مسلمانوں کا اس علاقے سے سب سے پہلے تعلق سلطان محمود غزنوی کے سومنات کا ارادہ کرنے کے وقت سے ہوا۔ سلطان یہاں کا علاقہ فتح کرنے کے بعد اپنی فوجوں کے ساتھ سومنات کی طرف روانہ ہوا۔ اسی طرح قطب الدین ایبک نے بھی گجرات کے علاقے میں حملہ کیا۔ لیکن گجرات کا سلطنتِ دہلی سے اصل رابطہ سلطان علاءالدین خلجی کے عہد سے ہوا۔ سلطان نے الغ خان کی کمان میں ایک فوجی لشکر گجرات بھیجا جس نے گجرات کو (سنہ ۶۹۶ھ) میں فتح کیا۔ اس طرح اس علاقے پر دہلی کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ سلسلہ محمد فیروز شاہ کے عہد تک جاری رہا۔ اسی اثنا میں گجرات کے سلطنتِ دہلی کی طرف سے مقرر کردہ ناظم نے اس علاقے پر ظلم و ستم کی انتہا کردی چنانچہ اس کی سرکوبی کے لیے ظفر خاں کو روانہ کیا گیا جس نے یہاں آکر انتظام خود سنبھالا۔ ادھر دہلی کی سلطنت کمزور پڑ رہی تھی اور آخر امیر تیمور نے آکر ملک کی حالت مزید بگاڑ دی۔ ظفر خاں نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور خود مختار بن بیٹھا اور اس طرح گجرات میں شاہی خاندان کا بانی بنا۔ اس کے بعد یہ خطہ شہنشاہ اکبر کے براہِ راست کنٹرول میں رہا اور سلطنت دہلی کی طرف سے اس کا صوبہ دار مقرر کیا جانے لگا۔ (۷۷)

> "گجرات کا تعلق دلّی کی اسلامی حکومت سے ابتدا سے رہا ہے اور وہاں کے امرا اور علما کے علاوہ ہزار ہا لشکری اور صناع وغیرہ گجرات میں آکر آباد ہو گئے اور گجرات سلطنتِ دہلی کا بہت ممتاز صوبہ ہو گیا۔ احمد آباد، سورت اور پٹن کے نام ایسے ہی مشہور و معروف ہو گئے جیسے دلّی، آگرہ اور الہ آباد وغیرہ کے۔ اس کا اثر وہاں کی معاشرت پر طرح طرح سے پڑا۔ خاص کر وہاں کی زبان پر جو بدل کر کچھ کی کچھ ہوگئی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ دہلی کی حکومت یا اہلِ دہلی نے جس جس خطے میں قدم رکھا خواہ وہ پنجاب ہو یا گجرات، دکن کے صوبے ہوں یا مدراس وہاں انہوں نے زبان پر اپنا نقش ضرور چھوڑا اور وہ نقش ایسا گہرا ہے کہ اب تک اُجاگر نظر آتا

ہے۔'' (۷۸)

اردو کی ترویج وترقی میں صوفیائے کرام کی خدمات بہت اہم ہیں ۔ان کا رابطہ کیونکہ براہِ راست عوام سے تھا اس لیے وہ ایسی زبان استعمال کرتے تھے جو سب کے لیے قابلِ فہم ہو اور اردو ہی ایسی زبان تھی جو عوامی رابطے کے لیے سب سے موثر تھی ۔ چنانچہ گجرات میں ان بزرگوں نے اسی زبان کو استعمال کیا۔جس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس زبان نے نے سنجیدہ خیالات کے اظہار کے لیے ایک بہترین ذریعے کے حیثیت اختیار کر لی ۔ان بزرگوں کے اقوال اور نثری تصانیف قدیم اردو کے ذخیرے میں قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔مولوی عبدالحق ان صوفیا کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

''گجرات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان بزرگوں نے اپنی تعلیم وتلقین کے لیے اُس زبان سے کام لیا ہے جو عوام میں بولی یا سمجھی جاتی تھی ۔ چناں چہ حضرت قطب عالم (ولادت سنہ ۷۹۰ھ وفات سنہ ۸۵۰ھ) وحضرت شاہ عالم (ولادت سنہ ۸۱۷ھ وفات سن ۸۸۰ھ) شیخ بہاء الدّین باجن (وفات سنہ ۹۱۲ھ) وسلطان شاہ غزنی (وفات سنہ ۹۲۲ھ) اے اقوال جو ہندی اور ہندی آمیز اردو میں ہیں اب تک موجود ہیں ان کے علاوہ شاہ علی جیو گام دہنی (وفات سنہ ۹۷۲ھ) کا پورا دیوان موسوم بہ 'جواہر الاسرار' ہندی زبان یعنی قدیم ہندی آمیز اردو میں اب بھی پایا جاتا ہے۔اور میاں خوب محمد چشتی (وفات سنہ ۱۰۲۳ھ) کی کتاب 'خوب ترنگ' قدیم گجراتی اردو میں ہے۔ یہ حضرات اپنی زبان کو عربی وعجمی آمیز گجراتی کہتے تھے۔جس کے معنے قدیم گجراتی اردو کے ہیں اسی طرح شاہ وجیہ الدّین علوی (وفات سنہ ۹۹۸ھ) کے اقوال بھی اسی زبان میں اُن کے ملفوظات میں پائے جاتے ہیں ۔امین گجراتی نے 'یوسف زلیخا' سنہ ۱۱۰۹ھ میں لکھی ۔اگر چہ وہ اپنی زبان کو گوجری یا گجراتی کہتا ہے لیکن خالص پُرانی اُردو میں ہے البتہ کہیں کہیں گجراتی لفظ بھی آ جاتے ہیں۔'' (۷۹)

دکن کے شاہی خاندانوں نے بھی اردو کی سرپرستی کی وہ ادب نواز رویہ رکھتے تھے اور ادیبوں اور شاعروں کی ان کے درباروں میں خاص اہمیت تھی ۔ان بادشاہوں نے دُور دُور سے اردو کے شعرا کو اپنے ہاں بلا کر اپنے دربار میں جگہ دی ۔خصوصاً شالی ہند سے بہت سے شعرا کو بلایا گیا جس سے اردو شاعری اور زبان کو رواج

دینے میں بہت مدد ملی۔اس کے ساتھ ہی ان میں سے اکثر دکنی بادشاہ خود بھی بہت اچھے شاعر تھے اور ان کے ضخیم کلیات دکنی زبان وادب میں آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔مولوی عبدالحق نے ان کی شاعری کو منظرِ عام پر لاکر اردو شاعری کے ارتقائی سفر کو سمجھنے کو مزید آسان کر دیا ہے۔عادل شاہی سلطنت کے ایک اہم بادشاہ علی عادل شاہ ثانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علی عادل شاہ ثانی کے زمانے میں شعروسخن کا گھر گھر چرچا تھا۔دکنی اُردو کو اُس زمانے میں بڑا فروغ ہوا۔بادشاہ خود بڑا سخن سنج اور خوش گو شاعر تھا۔خوش کلام شعرا کی قدر کرتا تھا اور بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنی مُلکی زبان دکنی اُردو کی طرف زیادہ مائل تھا۔اور اس کے کلام سے جو ہمیں دستیاب ہوا ہے اس کے صحیح ذوق کا پتا لگتا ہے۔۔۔علی عادل شاہ کا یہ رجحان دیکھ کر لوگوں کا شوق بڑھا اور دکنی شاعری عام ہوگئی۔علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں دکنی اُردو کے بہت شاعر گزرے ہیں لیکن ان سب میں نصرتی کا پایہ بہت بلند ہے وہ رزم و بزم دونوں کا اُستاد ہے۔''(۸۰)

مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق سلطان محمد قلی قطب شاہ گول کنڈہ کے ایسے شاعر ہیں جن کا کلیات سب سے پہلے مرتّب و منضبط صورت میں ملتا ہے۔یہ اردو کا بہت اچھا شاعر ہے اور اس کا دیوان بے حد ضخیم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی قادرالکلامی کا بھی ثبوت ہے۔قلی قطب شاہ کے بعد شاعری ایک باقاعدہ رُخ اختیار کر لیتی ہے اور شاعروں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اس دور کے شعرا نے کافی طویل مثنویاں لکھی ہیں جس میں نہ صرف انہوں نے اس دور کی تہذیب وثقافت اور رزم و بزم کا کھل کر بیان کیا ہے بلکہ زبان و بیان کے بھی مختلف پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔اس حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''۔۔۔اس کے بعد شاعروں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ان میں سے بعض (خصوصاً نصرتی) کا تخیّل اور قوّتِ بیان حیرت انگیز ہے۔انسانی جذبات،مناظرِ قدرت،رزم و بزم کے معرکے،اخلاقی نکات،صوفیانہ اسرار،عاشقانہ راز و نیاز وغیرہ مضامین پر جب ان کا کلام پڑھتے ہیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے اس ابتدائی زمانے میں جذبات و خیالات کے اظہار میں کس قدر ترقّی کر لی تھی۔ایک عجیب بات یہ ہے کہ ابتدا میں جس زبان کو

وطن میں کسی نے نہ پوچھا پردیس میں اس کی ایسی قدر ہوئی کہ اس میں بلامبالغہ سیکڑوں بہت اچھے اور بعض بے مثل شاعر اور ادیب پیدا ہو گئے اور وہ وہ چیزیں لکھ گئے جو آج بھی قابلِ قدر ہیں۔ خصوصاً اس زمانے کی بعض رزمیہ مثنویاں اس پائے کی ہیں کہ اُردو زبان کو اپنے عروج میں بھی نصیب نہ ہوئیں۔ اُردو زبان کے ارتقا کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔'' (۸۱)

مولوی عبدالحق نے دکنیات پر گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ انہوں نے دکنی ادب کے ذخیروں کو کھوجا اور بے شمار قدیم نسخے دریافت کر کے شائع کرائے اور ان پر اپنے قیمتی تبصرے اور مقدمے لکھے۔ ان قدیم کتابوں کو سامنے لا کر ایک تو مولوی عبدالحق اس دور کی اردو زبان کی صورت حال کو پیش کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ہی وہ زبان و ادب کی تاریخ کا سراغ لگا کر اس کی ارتقائی منازل کو بیان کرنا چاہتے تھے۔ ان قدیم ذخائر کے سامنے آنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان کی تاریخ کی ابتدائی منزلیں بہت پیچھے تک چلی گئیں۔ مولوی عبدالحق نے نہ صرف تنہا یہ کام کیا بلکہ انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم کو بھی استعمال کرتے ہوئے ایک تحریک کی صورت پیدا کر دی:

''اس طرح انجمن نے قدیم اُردو ادب کے متعلق تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور اُردو کی بعض قدیم کتب نظم و نثر شائع کی ہیں جن سے ابتدائے زبان کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔'' (۸۲)

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کے سامنے دکنی ادب کا قدیم ذخیرہ موجود تھا اور اس کے تقابلی مطالعے کے ذریعے وہ زبان کی قدامت اور مختلف علاقوں میں اس کے ارتقا کا آسانی کے ساتھ جائزہ لے سکتے تھے۔ شمالی ہند کی ایک قدیم کتاب کی نثر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کی ابتدا میں امروہے اور دلی کے آس پاس کے اضلاع کی زبان کا کیا رنگ تھا۔ جب ہم اس زبان کا مقابلہ دکنی زبان سے کرتے ہیں تو ان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں کے افعال اور ضمائر وغیرہ ایک ہیں۔ بہت سے ہندی یا ہندی سے بگڑے ہوئے لفظ دونوں کے ہاں یکساں استعمال ہوتے ہیں۔'' (۸۳)

مولوی عبدالحق کا دکن میں اردو زبان کے ارتقا اور نشو و نما کو اہمیت دینا اور اپنی تحقیقات کو یہاں پر

مرکوز کرنا بالکل بجا تھا کیونکہ دکن کا میدان اردو زبان کے لیے بہت زرخیز رہا ہے۔ چنانچہ اکثر محققین اگر اس بات کو تسلیم نہیں بھی کرتے کہ اردو زبان نے دکن کی فضا میں جنم لیا لیکن وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اردو کی نشو ونما میں دکن کا خطہ اہم مقام رکھتا ہے۔ اس حوالے سے سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

''سرزمین دکن کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے باسیوں نے اردو کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ بہمنی دور سے اردو کے فروغ اور نشو ونما کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ اب تک جاری ہے۔ اردو بہمنی دور سے پورے دکن میں مروج تھی۔ بہمنی سلطنت نے اسے سرکاری اور دفتری زبان بنا کر فروغ کے اور مواقع مہیا کیے۔ شاہان دکن کی سرپرستی میں یہ خوب پھلی پھولی۔ اس کے آثار نظم ونثر کی صورت میں سولھویں صدی عیسوی سے پہلے کے بھی پائے جاتے ہیں جن پر دکن کو بجا طور پر ناز ہے۔ ابتدائی دور سے اردو کی سرپرستی صوفیائے کرام نے کی۔ بعد میں بادشاہوں، امیروں اور عالموں کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی۔ عوام میں پہلے ہی مروج تھی۔ اس طرح اردو پروان چڑھتی رہی۔'' (۸۴)

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے ارتقا کی تمام کڑیوں کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے ہر دور میں اپنے آپ کو نکھارا اور سنوارا ہے۔ یہ اپنے اندر مختلف زبانوں کی خصوصیات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کو مختلف زبانوں سے واسطہ رہا اور ان کے الفاظ سے اس نے اپنے ذخائر کو مالا مال کیا ہے۔ اس کے لیے جس علاقے کی فضا سب سے زیادہ سازگار رہی ہے وہ دہلی کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کو ہمیشہ اردو کے حوالے سے مرکزیت حاصل رہی ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''جب تک دِلّی اُردو کا مرکز رہی ہندی کے دِل کش الفاظ اس میں برابر داخل ہوتے رہے اور اب تک دِلی کے ادیبوں نے اس کی پابندی کی ہے۔ چنانچہ زمانہ حال کے مصنّفین خصوصاً آزؔاد، حالؔی، ذکاؔءاللہ، نذؔیر احمد، نیز مرزا داؔغ نے سینکڑوں ہزاروں ہندی لفظ جو صرف زبانوں پر تھے اور مبتذل سمجھے جاتے تھے اور جنھیں ادب میں بار نہیں ملا تھا، اس خوبی سے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں کہ خاصے متین اور سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔'' (۸۵)

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لیے یہاں پر زبان میں عہد بہ عہد تبدیلیوں

کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ان کے مطابق دکن میں اردو زبان کے ارتقا کے دوسرے دور میں اردو کا رنگ بالکل جُدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اورنگ زیب کے شہنشاہ بننے کے بعد اورنگ آباد اس کا مستقر ٹھہرا۔اورنگ زیب کے ساتھ اس کی فوج کی ایک کثیر تعداد یہاں پر مقیم تھی جن کا تعلق دہلی سے تھا اور یہ لشکر اپنے ساتھ دہلی کی زبان بھی لایا تھا ۔اس لیے اس دور میں یہاں کی زبان کا رنگ وہی نظر آتا ہے جو دہلی کی زبان کا ہے۔اس طرح اگر اس دور کے شاعروں کی زبان دیکھی جائے تو دہلی اور اورنگ آباد کی زبان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہ سلسلہ آصف جاہ اول کے دور تک جاری رہا کیوں وہ بھی دلی سے آتے ہوئے وہاں کی آبادی کا منتخب حصہ اپنے ساتھ لے آئے اور اس طرح دلی کے اثرات مسلسل جاری رہے۔ یہاں پر زبان میں واضح تبدیلی اس وقت نظر آتی ہے جب اورنگ آباد کی بجائے دارالحکومت حیدر آباد کو قرار دیا گیا۔اس وقت حالات اور مقام کی تبدیلی کے باعث زبان نے ایک نیا انداز اختیار کیا ۔صرف چالیس سال کے مختصر عرصے میں دکن میں اردو زبان اپنی قواعد، محاورہ و روزمرّہ اور لب ولہجہ کے اعتبار سے ایک نیا انداز اختیار کر لیتی ہے:

''اورنگ آباد والوں نے زبان اور لب و لہجہ ہی نہیں بلکہ وضع قطع بھی دلّی والوں کی اختیار کر لی تھی۔لیکن تیس چالیس سال میں ۔۔۔نمایاں فرق آ گیا۔'' (۸۶)

تمام علاقوں میں اردو زبان کے ارتقا کا جائزہ لینے کے بعد مولی عبدالحق اپنا نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اردو زبان کے آغاز وارتقا پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''وہ خودرو نونہال جو دوآبہ گنگ وجمن اور اس کے قرب و جوار میں پھلا پھولا، اقتضائے زمانہ کی ہَوا اس کے بیج دور دور تک اُڑا لے گئی، ہر سرزمین کی آب وہَوا جہاں وہ پہنچے، انہیں راس آئی اور ہر خطّے کی زمین ان کے موافق نکلی ۔انہیں بے حقیقت بیجوں سے لہلہاتے ہوئے شاداب پودے نکلے۔قدرت نے ان بیجوں کی حفاظت کی، کلّے پھوٹنے پر ان کی پرورش کی اور ہمارے اسلاف نے اپنی آبیاری سے ان کی غورو پرداخت فرمائی۔ وہی بے حقیقت بیج اور وہی نازک پودے آج سرسبز تناور درخت ہیں جن کے پھول پھل سے ہمیں اس وقت ذوقِ تکلّم حاصل ہے۔''(۸۷)

پنڈت دتاتریہ کیفی اپنی کتاب 'کیفیہ' میں مولوی عبدالحق ہی کے نظریے کو تقویت دیتے ہوئے لکھتے

ہیں:

''شمالی ہند میں دو زبانوں کے اتصال اور اتحاد سے ایک تیسری زبان پیدا ہوئی تھی جب کہ دکن میں ایک بنی بنائی زبان شمالی ہند سے آئی اور وہاں اس کا رواج ہو گیا۔''　　(۸۸)

اردو زبان کے اندر یہ فطری صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے ساتھ بآسانی گھل مِل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس بھی زبان سے اسے ملنے کا اسے موقع ملا اس نے اس کی خصوصیات کو اپنے اندر مجتمع کرلیا۔ جس زمین اور جس زبان کی قربت اسے ملی اس کے اثرات اس نے جذب کیے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

''اردو اپنی فطرت سے بڑی ملنسار، اھلی گہلی، اور ہر زبان سے گھل مل کر شیر وشکر ہو جانے والی زبان ہے۔ قدیم پراکرت اور سنسکرت سے تو اس کا ناتا ہے ہی، فارسی، عربی، پشتو، پرتگالی، کول، انگریزی، دراوڑ زبانوں سے بھی اس کا خلا ملا رہا ہے۔ ان سب سے اس نے کچھ نہ کچھ لیا اور چراغ سے چراغ جلایا۔ اردو ہر چند ایک خاص علاقے کی زبان ہے جہاں اس نے آنکھ کھولی اور جہاں وہ پروان چڑھی لیکن وہ اس علاقے میں محصور نہیں رہی۔ اس نے اپنے مولد و منشا سے قدم باہر نکالا۔ ملک کے گوشے گوشے میں گئی اور اپنی ضرورت کے مطابق ع۔

تمتع زھر گوشہ یافتم

ہر گوشہ سے اس نے تمتع حاصل کیا۔ ہر چمن سے اپنا دامن بھرا۔''　　(۸۹)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی مولوی عبدالحق کے نظریے کو تقویت دیتے ہوئے اردو کے میل ملاپ کے رویے کو اس کی خصوصیت قرار دیتے ہیں اور اُن کی طرح، مسلمان اور ہندو دو تہذیبوں کے باہمی ملاپ کا اسے صلہ سمجھتے ہیں:

''اردو کا دوسرا بنیادی اور روائتی عنصر مفاہمہ اور میل ملاپ ہے۔ اردو ہندوؤں مسلمانوں کے میل ملاپ آویزش اور ربط وارتباط کا نتیجہ ہے۔ برِصغیر کے کسی علاقے کی تہذیب آج نہ خالص ہندووانہ ہے نہ خالص مسلمانی۔ اس دیس کے رہنے والوں میں ایک مخلوط کلچر اور ثقافت کی روح رواں ہے۔ اسے انڈو مسلم یا ہندلسانی ثقافت کا نام ہی دیا جاسکتا ہے اور اس

مفاہیم کی سب سے بڑی ترجمان بھی اردو ہی ہے۔ یہ ایسی زبان نہیں جسے مسلمان اپنے ساتھ عرب، ایران، افغانستان یا ترکستان سے لائے ہوں نہ یہ زبان ایسی ہے جو یہاں پہلے سے موجود تھی اور مسلمانوں نے اپنی عربی فارسی یا ترکی چھوڑ کر اسے اختیار کیا ہو بلکہ ان دونوں کے اتحاد، موانست اور ربط وارتباط نے اس کی تخم ریزی کی اور جب دو قومیں مل کر شیر وشکر ہو گئیں تو اس نخل کی آبیاری ہونے لگی یہاں تک کہ یہ ایک شاندار درخت بن گئی۔'' (۹۰)

مولوی عبدالحق نے اپنے خطبات میں لسانیات کے حوالے سے دلچسپ بیان دیا ہے جس کو زبان کے ارتقا کی ایک نئی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ وہ موجودہ زبان کو ایک نیا روپ دینا چاہتے تھے، ایک ایسا روپ جو زیادہ ہمہ گیر ہو اور جس کو پورے برِصغیر کی مشترکہ زبان قرار دیا جا سکے۔ اس حوالے سے انہوں نے اس وقت بعض حضرات کی اس رائے کی بھی تردید کی کہ اردو اور ہندی دراصل دونوں ایک ہیں صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ ان کے مطابق ایک زمانہ تھا کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہو سکتی تھیں۔ لیکن اب ان دونوں میں بُعد بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس دوری کو ختم کرنے کے لیے کئی کوششیں بھی کی جا چکی ہیں اور ہندی سے سنسکرت اور اردو سے عربی فارسی کے الفاظ نکال کر انہیں ایک کرنے کی تگ و دو کی گئی لیکن اس میں اب کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں۔ چنانچہ وہ یہاں پر ایک مشترکہ زبان بنانے کا ایک مشورہ سامنے رکھتے ہیں:

''میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہے اور میں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندی ادب میں اب تک جتنے عربی فارسی (یا اُردو) لفظ آئے ہیں یا ہندی بولنے والوں کی زبان پر ہیں وہ سب جمع کیے جائیں اور اسی طرح اُردو ادب میں جس قدر ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں یا اُردو بولنے والوں کی زبان پر ہیں وہ بھی اکٹھے کیے جائیں اور ان سب کو مِلا کر ایک لغات مرتّب کی جائے۔ گویا یہ اُردو ہندی زبانوں کے مشترکہ الفاظ اور محاورے ہوں گے۔ یہ کتاب ایک ایسی جماعت کی خدمت میں پیش کی جائے جس میں دونوں فریقوں کے نمائندے ہوں، وہ اس پر غور و بحث کریں اور اگر وہ اسے مستند قرار دیں تو کتاب شائع کر دی جائے۔ نیز یہ جماعت یا اس کی مقرّر کی ہوئی کوئی مجلس اس امر کی مجاز کی جائے کہ ہندی

اُردو زبانوں میں سے جن الفاظ کی ضرورت سمجھے اس میں اضافہ کردے اور نئے خیال یا مفہوم کے لیے باہمی مشورے سے جدید الفاظ تجویز کرے اور ان کا اعلان مناسب طریقے پر ملک میں کر دیا جائے۔ اگر چہ اس طرح سے اب تک کوئی زبان نہیں بنی لیکن ہمارے مُلک اور ہماری زبانوں کی حالت بالکل مختلف ہے۔ علاوہ اس کے یہ کیا ضرور ہے کہ جو بات اب تک نہیں ہوئی وہ آیندہ بھی نہ ہو۔ یہ زمانہ بدعت و جدت کا ہے اور اس میں اس قسم کی بدعتیں بالکل جائز اور مستحسن ہیں۔ اگر یہ صورت عمل میں آجائے تو کچھ تعجب نہیں کہ اہلِ علم اور ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو اس مشترکہ زبان کو رواج دینے پر آمادہ ہو جائے اور اپنے قلم کے زور سے اس کی حیثیت منوالے۔'' (۹۱)

دراصل مولوی عبدالحق نے اس قسم کا مشورہ اس لیے دیا کہ انہیں اپنی زبان پر بھرپور اعتماد تھا اور وہ اس کے اندر اتنی صلاحیت سمجھتے تھے کہ یہ کسی بھی زبان کی خوبیوں کو اپنے اندر مجتمع کر سکے:

''اس میں شک نہیں کہ اس زبان میں وسعت ہے اور اس میں لوچ اور جذب کرنے کی قوّت اور آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ خوبیاں اُسی وقت کام آسکتی ہیں کہ ہم ان سے کام لیں اور زبان کو مستحکم اور مکمل بنانے پر آمادہ ہو جائیں۔ بعض اہلِ سائنس کا قول ہے کہ آیندہ انسان جیسا چاہے گا بن جائے گا۔ میں اس قول کی تصدیق یا تردید نہیں کر سکتا لیکن زبان کے متعلّق بہ وثوق کہہ سکتا ہوں کہ جیسا ہم نے چاہا ویسی بنی اور جیسا ہم چاہیں گے ویسی بنے گی۔ '' (۹۲)

اردو زبان مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی۔ اس نے چونکہ مختلف علاقوں اور مختلف تہذیبوں میں پرورش پائی اس لیے اسی حوالے سے اس کو نام دیے جاتے رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دعوے دار ہر علاقے کے لوگ رہے اور اس کو اپنی زبان قرار دیتے رہے اس لیے انہوں نے اس کو نام بھی اپنے علاقے کے مطابق دیا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے بقول اس کی مقبولیت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ بعض علاقے کے لوگوں کے اس سے اپنی خصوصیت جتانے کے لیے اسے اپنے سے منسوب کر لیا تھا۔ چناں چہ اہلِ گجرات ایک زمانے میں اسے گُجری یا گجراتی کہتے تھے اور اہلِ دکن دکنی۔ ابتدا میں یہ جس نام سے زیادہ مشہور رہی وہ ہندی تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس ملک

میں پیدا ہوئی تھی اور دوسرے یہ کہ فارسی سے ممیّز کرنے کے لیے اسے یہ نام دیا گیا۔ یہ نام مصحفی کے زمانے تک رائج رہا چنانچہ مصحفی نے اپنے دو تذکروں کے نام تذکرہ ہندی یا ہندی گویاں رکھے۔ لیکن یہ نام بھی زیادہ نہ چل سکا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی باقاعدہ نام نہ تھا بلکہ فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے اسے اس طرح پکارنے لگے تھے۔ دوسرے بعض اوقات دوسری زبانوں کو بھی ہندی کے نام سے موسوم کر دیا جاتا اس لیے آہستہ آہستہ یہ نام غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ریختہ کا لفظ لے لیتا ہے۔ یہ لفظ درحقیقت اس وقت مقبولیت حاصل کرتا ہے جب اس زبان میں ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو کا یہ نام زیادہ عرصہ تک اپنی شہرت قائم نہ رکھ سکا۔ غالب کے ابتدائی زمانے تک اس کا استعمال نظر آتا ہے اور جب یہ زبان عام ہو گئی تو یہ نام خود بخود مٹ جاتا ہے۔ بعض انگریز اور یورپین اسے موز بھی کہتے رہے اور بعض لوگوں نے اسے مسلمانی بھی کہا۔ اس طرح مختلف وقتوں میں اسے 'زبانِ ہندوستان' 'اندوستان' 'اندوستانز' 'ہندوستان' یا 'ہندوستانز' 'ہندوستانی' کا نام دیا جاتا رہا۔ (۹۳)

جہاں تک اردو لفظ کا تعلق ہے یہ مولوی عبدالحق کے مطابق بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا:

''اردو کا لفظ بعد میں آیا۔ میر تقی میرؔ اسے اپنے تذکرے میں '' زبان اُردو معلّٰی شاہ جہاں آباد دہلی'' لکھتے ہیں۔ اس کے بعد زبان اُردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ زبان کا لفظ اُڑ گیا اور خود 'اُردو' زبان کے معنوں میں آنے لگا۔ مصحفی اور انشا کے زمانے میں اس کا رواج عام ہو گیا تھا۔ یہ لفظ اپنی اصل کا پتا دیتا ہے اُردو یعنی شاہی کیمپ میں مختلف قوموں اور مختلف زبان کے لوگ تھے اور انہیں کے باہمی اختلاط سے یہ مخلوط زبان ظہور میں آئی اور سارے مُلک میں پھیل گی۔ اب اُردو اور ہندُستانی میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ اُردو ادبی زبان ہے اور ہندُستانی عام زبان جو خواص و عوام سب سمجھتے ہیں۔ لفظ اُردو کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ یہ لفظ بولنے لکھنے اور پڑھنے میں سہل ترین ہے۔ بولنے میں اس لیے کہ اس میں کوئی ثقیل حرف نہیں اور بلا تکلّف ادا ہو جاتا ہے۔ پڑھنے میں اس لیے کہ ہر حرف الگ الگ لکھا جاتا ہے۔ لکھنے میں اس لیے کہ چاروں حروف ابجد کے سب سے چھوٹے اور آسان حروف ہیں، کہیں دائرہ یا کشش یا جوڑ نہیں اور لکھنے میں بھی الگ الگ رہتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ نقطے کا نام نہیں، سب بے نقط ہیں۔'' (۹۴)

لیکن یہاں یہ وضاحت کردینی ضروری ہے کہ میر تقی میؔر نے اگرچہ اپنے تذکرے میں 'زبانِ اردو معلیٰ شاہ جہاں آباد دہلی' کی ترکیب استعمال کی ہے لیکن وہ پہلے شخص نہیں تھے جو اس زبان کو یہ نام دے رہے تھے۔ بلکہ مولوی عبدالحق کے بقول مصحفؔی اُردو شعرا میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے زبان کے لیے ''اُردو'' کا لفظ سب سے پہلے استعمال کیا:

''جہاں تک تحقیق ہوا ہے اُردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''اردو'' کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان تذکروں میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ حضور کے حال میں ذکر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہ جہاں آباد میں لطف علی خاں ناطق کے گھر پر مشاعرہ تھا۔ میؔر صاحب کی طرحی غزل میں قافیے کے بعد ردیف ''اور'' بہ معنی طرف تھی۔ بعضے فصحا نے اُسے خلافِ ''اردو'' خیال کر کے اُس کی پیروی نہ کی۔ نثاؔر کے حال میں لکھتے ہیں کہ ''ادائے زبانِ اُردو چناں چہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود'' قہر کے تذکرے میں مرزا قتیؔل کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''او ہم باوصفِ فارسی گوئی دعوئے اردو دانی ریختہ داشت'' اسی طرح مہجوؔر کے حال میں لکھا ہے کہ ''سہ کتاب در زبانِ اردوئے ریختہ، شکر آمیختہ از خامہ فکرش رونق سواد پزیرفتہ'' لیکن ''زبان اُردوئے معلّٰی کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے تذکرۂ نکات الشعرا میں لکھا ہے۔''(۹۵)

اس حوالے سے مولوی عبدالحق نے 'ہندوستانی' کے لفظ پر خاصی بحث کی ہے۔ ان دنوں یہ مسئلہ خصوصاً آل انڈیا ریڈیو پر چھیڑا جا رہا تھا۔ دراصل ہندوستانی کا لفظ زبان کے سلسلے میں آج تک کسی ہندوستانی ادیب یا شاعر نے استعمال نہیں کیا بلکہ یہ اہلِ یورپ کی ذہنی اختراع ہے۔ چنانچہ جب وہ سترھویں صدی میں یہاں آئے تو یہاں کی زبان کو اندستان، اندستانی اور بعد ازاں ہنڈستانی کے نام سے پکارنے لگے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق جب انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج بنایا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں کے کسی بھی ادیب نے زبان کو ہنڈستانی نہیں لکھا بلکہ اسے اردوئے معلّٰی، ریختہ یا ہندی کہا گیا۔ البتہ انگریز خود اس کو ہنڈستانی کے نام سے موسوم کرتے رہے۔ اسی طرح جدید ہندی جس کا ان دنوں بہت شور تھا اس کو وہ اردو کا بچہ قرار دیتے ہیں:

''جدید ہندی جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے نئے زمانے کی پیداوار

ہے۔اس نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جنم لیا۔دراصل یہ اُردو کا بچہ ہے۔وہ اس طرح کہ عربی فارسی کے لفظ نکال کر اُن کی جگہ سنسکرت لفظ بٹھا دیے تھے۔مختصر یہ کہ ہمارا ادب، ہندُستانی کے لفظ سے خالی ہے۔اُردو کے کسی مستند اہلِ زبان اور غالباً ہندی کے اہلِ زبان نے بھی اس لفظ کو زبان کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کیا۔'' (۹۶)

اردو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی مولوی عبدالحق بتاتے ہیں جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور وہ ہے عورتوں کی زبان۔ان کے مطابق یوں تو دنیا کی ہر زبان میں عورتوں اور مردوں کی بول چال میں فرق ہوتا ہے لیکن اردو میں یہ امتیاز زیادہ نمایاں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان نے جس خطے میں جنم لیا وہاں پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔اس وجہ سے عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرزِ بیان اور بول چال بہت کچھ الگ ہوگئی۔عورتوں کی نظر بہت تیز ہوتی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوبیوں یا خامیوں کو بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ان کی دلچسپیاں اور مصروفیات مردوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ان کا زیادہ تر وقت امورِ خانہ داری، بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسوم و رواج کی پابندی او ور ان کے متعلق معاملات میں صرف ہوتا ہے۔عورت کیونکہ صنفِ نازک ہے اس لیے اس کی زبان میں بھی نزاکت اور لوچ ہوتا ہے۔چنانچہ ہمیں عورتوں کے ہاں جو محاورے اور مثلیں نظر آتی ہیں وہ لطیف، سبک، نازک اور اپنے اندر خوبصورتی لیے ہوئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے بنائے ہوئے گیت اور شاعری اپنے اندر ایک دلکشی لیے ہوئے ہیں۔پھر یہ کہ مشرقی عورت کے ہاں ایک حجاب اور شرم کا رویہ پایا جاتا ہے اس لیے لفظوں کے استعمال میں بھی انہوں نے ایک لحاظ رکھا ہے اور ان کی زبان میں بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کی بجائے اشارے کنائے اور تشبیہ استعارے میں بات کرنے کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔اسی طرح عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کو جب وہ اپنی زبان میں ڈھال لیتی ہیں تو ان میں بھی ایک خوبصورتی اور ترنم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو یہ لفظ اپنا مفہوم تک تبدیل کر کے اردو کے لفظ ہو گئے ہیں۔مولوی عبدالحق عورتوں کی زبان کے اردو میں حصے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں یا عربی فارسی کے لفظ ہیں تو انہیں ایسا تراشا ہے کہ ان میں اُردو کی چمک دمک پیدا ہوگئی ہے۔اب جدید حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی

ہے۔ ریختی گوشعرا کا بڑا احسان ہے (اگر چہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انہوں نے اس زبان کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ اور محاورے اور مثلیں ادبی زبان میں آ گئی ہیں اور ہمارے ادب کی زیب و زینت ہیں۔ اس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنف نازک کی اس پاکیزہ زبان کا اکثر حصّہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہو گیا ہے۔ اس کے اضافے سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حسن ہی نہیں پیدا ہوا بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔'' (۹۷)

مولوی عبدالحق اردو زبان کے آغاز کو اس وقت کا تقاضا گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس وقت ایسی مشترکہ زبان کی ضرورت تھی جس کو برِصغیر کے عوام آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں کیونکہ یہ ایک ایسا ملک تھا جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں۔ چنانچہ قانونِ قدرت نے اپنا کام کیا اور اس وقت کی ضرورت کے تحت یہ زبان پھیلتی چلی گئی۔ جب اسلامی حکومت یہاں مستحکم ہوئی، اور یہاں کے مختلف علاقوں میں میل جول اور ربط بڑھا تو ان حالات کے تحت ایک نئی زبان کی ضرورت ناگزیر ہو گئی کیونکہ اس وقت جتنی زبانیں تھیں وہ اپنے اپنے حلقے تک محدود تھیں۔ فارسی اپنی تمام تر اہمیت کے باعث یہاں کے لوگوں کے لیے ایک غیر زبان تھی اور اس میں عوام کے ساتھ رابطہ ممکن نہ تھا۔ پس ایسے حالات میں اردو نے اس فریضے کو سرانجام دیا اور ایک ایسی زبان بن کر ابھری جو برِصغیر میں رابطے کا ذریعہ بن گئی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''جس وقت یہ زبان وجود میں آئی تو مُلک میں جتنی بولیاں مروّج تھیں وہ سب اپنے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور حلقوں میں محدود تھیں، یہ زبان قدرت سے ایسے ماحول اور ایسے حالات اور اس قسم کے اثرات کے تحت بنی تھی اور اس طرح سے اس کی ترکیب عمل میں آئی تھی کہ خود بہ خود مُلک کے اکثر خطّوں میں پھیلتی گئی اور لوگ اسے قبول کرتے چلے گئے۔ ملک میں کوئی دوسری بولی یا زبان ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی اور جتنی بولیاں یا زبانیں تھیں وہ اپنے حلقے سے باہر نہ بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ اور خصوصاً انگریز اس مُلک میں آئے تو انہوں نے اسے ہندوستانی یعنی ہندوستان کی زبان سے موسوم کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب فارسی کی بجائے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی تو کسی نے اختلاف

نہ کیا۔ اختلاف ہوتا تو کس بنا پر؟ کوئی دوسری زبان ایسی تھی ہی نہیں جو ہندستانی ہونے کا دعویٰ کرتی۔'' (۹۸)

مولوی عبدالحق اردو کی نشو و نما میں صوفیا کے کردار کو انتہائی اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ ہی وہ لوگ تھے جن کا عوام کے ساتھ براہِ راست رابطہ تھا۔ ان بزرگوں کو ایسے وسیلے کی ضرورت تھی جس کے ذریعے ان کا عام لوگوں کے ساتھ رابطہ بحال رہ سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے درویشوں اور صوفیوں نے اس کی قدر پہچانی۔ یہ صوفیا عوام کے مزاج شناس تھے اور انسانی نفسیات کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے اس بات کو بہت جلد محسوس کرلیا کہ عوام کے دلوں کو موہ لینے کے لیے ان ہی کی زبان سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوسکتی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری سے مسلسل اس بات کے ثبوت ہمیں ملتے ہیں۔ ان صوفیا کے اقوال ان کے مریدوں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ محفوظ کر رکھے ہیں۔ یہ اقوال اس ہندی زبان میں ہیں جو بعد میں اردو کے نام سے سارے ہندوستان کی زبان کہلائی۔ مولوی عبدالحق ان صوفیا کے ناموں کی فہرست اس طرح دیتے ہیں:

''مثلاً بابا فرید شکر گنج، حضرت بندہ نواز گیسو دراز، امیر خسرو، قطب عالم، شاہ عالم، سیّد محمود غوث گوالیاری وغیرہ انہی بزرگوں میں سے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایسے صوفیا بھی گزرے ہیں جن کی مستقل تصنیفات پائی جاتی ہیں جیسے شمس العشاق میراں جی، شاہ برہان الدّین جانم، سید میراں حسینی شاہ، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، خوب محمد چشتی، بابا حسینی وغیرہ۔ یہ آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی تک کے بزرگ ہیں۔'' (۹۹)

ان بزرگوں کے کلام میں مولوی عبدالحق کے نزدیک چند باتیں قابلِ غور ہیں جس کی بنا پر اردو کی نشو و نما میں بہت زیادہ مدد ملی۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں فارسی رسم الخط کو اختیار کیا اس طرح اردو زبان کے لیے یہ رسم الخط مخصوص ہوگیا اور اس طرح ہندوستان کی یہ زبان ایک نئے لباس میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوئی۔

ان بزرگوں کے کلام میں جس دوسری بات کی طرف مولوی عبدالحق نے اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ ان کے ہاں زبان کا مقامی رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور فارسی، عربی الفاظ کا کم سے کم استعمال کیا گیا ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کا تخاطب عوام کے ساتھ تھا جو فارسی اور عربی سے زیادہ مانوس نہیں تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے صوفیا کے کلام

سے مثالیں بھی پیش کی ہیں:

''دوسری بات یہ ہے کہ ہندی الفاظ کی بہتات ہے اور عربی فارسی بہت کم۔

جیسے

آپیں جوگی سب جگ چیلا　　آپیں ایک ناتھ رہے اکیلا

اپنی اچھیا کر چلے نپایا　　نیکی بدی کے دومدرے بھایا

ان چاروں مصرعوں میں صرف نیکی بدی کے دو فارسی لفظ آئے ہیں اور یہ بھی
ایسے ہیں جو ہندُستان کی اکثر زبانوں میں بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں اور یہ خیال بھی نہیں آتا
کہ یہ ہندی ہیں یا فارسی

اے دنیا کے لوگ کیڑے مکوڑے

گھیو شہد دوڑاتے گھوڑے

ڈوبتے بہت نکلتے تھوڑے

ان تین مصرعوں میں صرف دو لفظ یعنی دنیا اور شہد آئے ہیں۔ باقی سب ہندی ہیں اور یہ دو لفظ
ایسے معمولی ہیں کہ ہر جگہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دو مثالیں میں نے جان کر ایسی دی ہیں کہ ان میں
فارسی عربی لفظ بھی ہیں۔

ورنہ صفحے کے صفحے پڑھ جایئے کہیں ایک لفظ بھی فارسی عربی کا نہیں آتا۔'' (۱۰۰)

اس طرح ان بزرگوں نے اردو میں کوشش کی کہ کم سے کم دوسری زبانوں کے لفظ آئیں۔ چونکہ انہوں نے مذہب کی تلقین کی اس لیے عربی اور فارسی الفاظ سے بالکل گریز ممکن نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندی سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال کیے جس سے مقامیت کا رنگ اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں استعمال ہونے والی بحریں بھی ہندی ہیں اور انہوں نے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا وہ بھی مقامی رنگ لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ نیز ان کے استعارات وتشبیہات سب ہندی ہیں۔ ان کے ہاں ہندی شعرا کی طرح عورت ہی عاشق نظر آتی ہے حتیٰ کہ یہ تصوف اور معرفت کی باتیں بھی عورت کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک کمال یہ دکھایا کہ عربی فارسی الفاظ کو بھی ہندی رنگ دے کر مقامی بنا لیا:

''ایک بات ان کے کلام میں یہ پائی جاتی ہے کہ عربی، فارسی یا ہندی کے لفظ وہ اس طرح لکھتے ہیں جو عوام کی زبان پر تھے۔ اصل کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ عربی فارسی کے لفظ نہیں رہے تھے۔ بلکہ اسی زبان کے لفظ ہو گئے تھے جو عام طور پر بولی جاتی تھی۔ مثلاً علیحدہ کو ''الادھا'' وضع اور نفع کو 'وضا' اور 'نفا' بعدازاں کو 'بزاں' شروع کو 'شرو' وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں کہ وہ جاہل تھے۔ صاحبِ علم تھے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ جس زبان میں وہ لکھ رہے ہیں وہ فارسی عربی نہیں بلکہ ایک دیسی زبان ہے اور وہ لفظ خواہ اصل میں عربی کے ہوں یا فارسی کے اب تبدیلِ ہیت کے ساتھ دیسی زبان کے ہو گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فلسفہ، زبان اور اصولِ لسانیات پر انکی کس قدر نظر تھی۔'' (۱۰۱)

مولوی عبدالحق اردو کو ایک زندہ زبان کہتے ہیں جو مسلسل نشو ونما پذیر ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ یہ انسانی ضرورت کے تحت اپنے اندر نئے الفاظ کو سمو سکے یہی وجہ ہے کہ اس کا ارتقا ابھی رُکا نہیں شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے بولنے والے اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ زبان کی اسی ذرخیزی پر وہ بجا طور پر فخر کرتے ہیں اور اسے دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کم نہیں سمجھتے:

''انصاف شرط ہے اُردو کے جملے اور لفظ انگریزی سے کس بات میں کم ہیں۔ مانا کہ انگریزی میں نت نئے الفاظ داخل ہوتے جاتے ہیں اور اُردو میں اُن کے مترادف پہلے سے موجود نہیں۔ انگریزی میں پہلے سے یہ لفظ کب موجود تھے۔ نئی چیزیں ضرورت پیدا کرتی ہے۔ نئے الفاظ بھی ضرورت سے بنائے جاتے ہیں۔ انگریزی میں بنائے جا سکتے ہیں تو اُردو میں کیوں نہیں بن سکتے۔ ہمیں اپنی زبان میں الفاظ بنانے کی اس لیے ضرورت ہے کہ انگریزی اصطلاحات اور الفاظ ایک خاص اور قلیل طبقے تک محدود رہتے ہیں۔ ہم جو الفاظ اپنی زبان میں بنائیں گے وہ خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہوں گے۔ لوگوں کے ذہن ان الفاظ کے مفہوم تک یا کم ازکم مفہوم کے قریب تک تو ضرور پہنچیں گے۔'' (۱۰۲)

مولوی عبدالحق اردو زبان کے نئے امکانات کے ہمیشہ قائل رہے اور وہ یہ بات پوری شدّت کے ساتھ جانتے تھے کہ اردو کا ارتقا مسلسل جاری ہے۔ یہ ایک زندہ زبان ہے اور زندہ زبانیں ہر وقت آگے بڑھتی رہتی ہیں

ان میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ زبان کی یہ نشو ونما فطری انداز میں ہونی چاہیے۔اگر ہم اپنی طرف سے اردو زبان میں بے ہنگم اور بے جوڑ الفاظ شامل کرتے چلے جائیں گے تو اس سے زبان کا قدرتی حسن متاثر ہوگا۔وہ کہتے ہیں:

''ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک زندہ زبان کے لیے لازم ہے کہ اس میں نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہے ورنہ وہ ایک روز مُردہ ہو جائے گی۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لغات میں سے بھدّے، بے ڈھنگے اور ثقیل الفاظ چُن چُن کر بھر دیے جائیں۔ ہر زبان کی ایک فطرت اور ساخت ہوتی ہے اور جب تک لفظ اس کے سانچے میں نہیں ڈھلتا ، قابلِ قبول نہیں ہوتا۔''(۱۰۳)

لیکن اس سے یہ بھی مطلب نہیں لینا چاہیے کہ مولوی عبدالحق زبان میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کے قائل نہیں تھے۔وہ زبان میں نئے الفاظ کے اضافے کو زبان کی فطرت میں دخل اندازی نہیں سمجھتے تھے بلکہ فطرت کے ساتھ سعی کو شامل کرنا زبان کے حسن وزیبائش کے لیے ضروری سمجھتے تھے،ایسی سعی جو زبان کو بگاڑنے کی بجائے نکھارنے کا باعث بنے:

''میں اس موقع پر دو غلط فہمیوں کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں جو ہم لوگوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہم اُردو دانوں کو بڑا غرّہ ہے کہ اُردو زبان میں آگے بڑھنے اور پھلنے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔وہ گزشتہ زمانے میں بغیر کسی کوشش کے خود بہ خود پھیلتی چلی گئی اور اسی طرح آیندہ بھی پھیلتی اور ترقّی کرتی چلی جائے گی۔اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اُردو میں فطری صلاحیت موجود ہے لیکن اگر فطرت کو انسانی سعی کی مدد نہ ملے تو فطری صلاحیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔اور اکثر اوقات ایسی چیزیں خود رو پودوں کی طرح پامال ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ اس لیے فطری صلاحیت کو اُبھارنے اور ترقّی دینے کے لیے آپ کی کوشش پیہم اور متواتر جاری رہنی چاہیے۔'' (۱۰۴)

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے آغاز سے لے کر اس کی تمام ارتقائی منازل کو زیرِ تحقیق لایا ہے اور اردو کی نشوونما میں ہر دور کا حصہ ان کے مدِ نظر رہا ہے۔چنانچہ وہ اردو زبان کی تاریخ اور اس کے لسانی ارتقا کو بیان

کرتے ہوئے ان تمام حالات کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں جن سے اردو کو اپنے ارتقائی سفر میں دوچار ہونا پڑا۔ اس حوالے سے وہ ہندوستان کے سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہیں جن کے باعث اردو نے موجودہ رنگ اپنایا ہے۔ اپنی کتاب 'قواعدِ اردو' کے مقدمہ کے آغاز میں انہوں نے انتہائی جامعیت کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما کو بیان کیا ہے اور ان تمام عوامل کا حوالہ دیا ہے جو اس اہم ارتقائی سفر میں شامل رہے:

''اُردو زبان دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اور ابھی ابھی اس نے اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا سیکھا ہے۔ زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اُسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کوپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے، اُسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے۔ اُردو اُس زمانے کی یادگار رہے، جب مسلمان فاتح ہندستان میں داخل ہوئے اور اہلِ ہند سے اُن کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا۔ اُس وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہوتا چلا، جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی، جس کا ان میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانے تک ان کی زبان فارسی ہی رہی، دربار و دفاتر میں بھی اُسی کا سکہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اُسے شوق سے سیکھا۔ اُس زمانے میں فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ فضیلت کا ملنا بغیر تحصیلِ زبانِ عربی ناممکن تھا، کیوں کہ مسلمانوں کے علوم و فنون کا خزانہ اُسی زبان میں مدفون ہے۔ اِدھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی اُسے بھی مسلمانوں نے سیکھا، عوام وہی زبان بولتے تھے۔ چنانچہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے، مسلمان شاہی درباروں اور علما اور شعرا نے بھی یہ زبان سیکھی اور اس میں تالیف و تصنیف بھی (جو زیادہ تر نظم تھی) کی۔ غرض ہندستانیوں کے اس میل جول اور خلا ملا سے ایک نئی زبان نے جنم لیا، جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہے ظاہر ہے، یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر، اس لیے اول اول ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے اور اس کے لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمتے گئے اور مغلیہ

سلطنت کے آخری دور میں شعرا نے اس بچے کو اپنے سایہ عاطف میں لیا اور پال پوس بڑا کیا، بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندستان پر مسلط ہوئی جو ہندو مسلمانوں سے بالکل غیر تھی۔ اس قوم نے اس کی اُنگلی پکڑی اس نے اُنگلی پکڑتے اُن کا پہنچا پکڑا اور دربار سرکار میں اُس کی رسائی ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ دفاتر سے فارسی کو نکال باہر کیا اور خود اُس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی۔ آخر ہندستان کی قدیم راج دھانی اس کا جنم بھوم اور دوآبہ اس کا وطن ہوا۔ اب دور دور پھیلی چلی ہے اور ہندُستان کے اس سرے سے اُس سرے تک چلے جایئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، بلکہ ہندستان کے باہر تک جا پہنچی ہے۔ سب سے بڑھی چڑھی بات یہ ہے کہ یہ تین جلیل القدر قوموں کی یعنی ہندو، مسلمان اور انگریزوں کی چہیتی ہے اور ان تینوں کی متفقہ کوششوں کی عظیم الشان یادگار ہے۔ تینوں نے اسے سیکھا، پڑھا، لکھا، تینوں نے اس کی ترقی کی مقدور بھر کوشش کی اور اب تینوں کی بدولت اس رتبے کو پہنچی کہ دنیا کی جدید زبانوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہوئی۔'' (۱۰۵)

کیونکہ مولوی عبدالحق کے نزدیک یہ زبان مسلسل ارتقا پذیر ہے اور اس کا ارتقا رکا نہیں اس لیے انہوں نے ان تمام ادوار اور اقوام کو زیرِ بحث لایا جو اردو کے ارتقا میں حصہ دار ہیں۔ خصوصاً وہ تین اقوام کا اردو میں سب سے زیادہ حصہ اور بنیادی کردار سمجھتے تھے۔ ان اقوام میں مسلمان، ہندو اور انگریز شامل ہیں۔ اگرچہ اردو کی بنیاد مسلمانوں اور ہندوؤں نے فراہم کی لیکن اس کو جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں جس قوم کا مرکزی کردار ہے وہ انگریز تھے۔ انگریز برِصغیر میں تجارت کی غرض سے آئے اور انہوں نے یہاں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ تجارت کی غرض سے ان کا یہاں کے لوگوں کے ساتھ تعلق رہا لیکن ان کے لیے یہاں کی زبان اور یہاں کے لوگوں کے لیے ان کی زبان اجنبی رہی۔ جوں جوں ان کی تجارت کا سلسلہ بڑھتا گیا ان کے ارادے بھی بدلتے چلے گئے۔ انہوں نے یہاں کی سیاست اور تہذیب و معاشرت کو اچھی طرح سمجھ لیا اور وہ گُر جان گئے جن کے ذریعے وہ یہاں پر کنٹرول حاصل کر سکتے تھے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر تک انہوں نے یہاں پر بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی اور وہ تقریباً پورے برِصغیر کو اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے۔ اور بالآخر انیسویں صدی کے آغاز ہی میں وہ دلی

پر قابض ہو کر یہاں کے حکمران بن بیٹھے۔صرف علامتی طور پر مغلیہ بادشاہت قائم رکھی گئی۔ چنانچہ جب عنانِ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے یہاں کا نظام چلانے کے لیے اور عوام سے رابطے کے لیے ایسی زبان کی ضرورت محسوس کی جس کو یہاں پر سب سمجھتے ہوں۔ چنانچہ انہیں اردو ہی ایسی زبان نظر آئی جو رابطے کا بہترین ذریعہ ہوسکتی تھی۔پس انہوں نے انگریزوں کے لیے اس زبان کی تحصیل ضروری سمجھی۔لیکن جب انہوں نے اردو زبان کے موجود ذخیرے کی طرف نظر دوڑائی تو ایسے مواد کی شدید کمی نظر آئی جس کو زبان سکھانے کے لیے نصاب کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔اس مقصد کے لیے ایک ادارہ فورٹ ولیم کالج کے نام سے قائم کیا گیا۔اس ادارے میں اردو زبان کے قابل افراد کو اکٹھا کیا گیا اور ان سے سادہ اردو میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ان میں اکثر کتب دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ تھیں۔اگر چہ اس ادارے کا مقصد تو انگریزوں کی تعلیم تھا لیکن بلواسطہ طور پر اردو زبان کے لیے یہ ادارہ ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔خصوصاً اردو نثر کے ذخیرے میں اس نے بے مثال اضافہ کیا اور اردو نثر کو ایک نیا انداز دینے میں اس کا اہم کردار ہے۔اس طرح وہ غیر قوم جس کا مقصد یہاں کے عوام پر تسلط قائم کرنا تھا نادانستگی میں یہاں کی زبان کو فائدہ پہنچا گئی۔اس حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلّط اس وقت ہندُستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔اس نے اُردو کی دست گیری کی اور اس لیے کہ ہندُستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذّب سوسائٹی میں ملنے جُلنے کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے اس کا دور دورہ تھا۔علاوہ اس کے ہندُستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لیے انہوں نے اس کی سرپرستی کی۔سب سے بڑا احسان جان گل کرسٹ کا ہے جس نے اُنیسویں صدی کے شروع میں بہ مقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا۔جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں ان کی تعلیم کے لیے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔یہ عجیب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجا ٹوڈرمل کی کوشش

سے دفاتر میں داخل ہوئی۔ اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو نثر کا لکھنا اُسی وقت سے شروع ہُوا اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اُردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گل کرسٹ نے اُردو نثر پر کیا۔'' (۱۰۶)

اس طرح مولوی عبدالحق کے مطابق ان تین اقوام کی شعوری یا غیر شعوری کاوشوں سے اردو زبان نے جدید روپ اختیار کیا اور ان اقوام کو یہاں کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی حالات نے مجبور کیا کہ وہ ایک ایسی زبان کو پروان چڑھائیں جو ان کی حالات کے مطابق ضروریات کو پورا کر سکے۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور انگریزوں کے اردو زبان کے ارتقا میں کردار کو سامنے رکھتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اس پر دُنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے۔ ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو قوموں کے اتحاد کی یادگار ہے وہ غلطی پر ہیں۔ جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دُنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قائم رہے گی۔'' (۱۰۷)

مولوی عبدالحق اگرچہ اردو زبان کا باقاعدہ آغاز مسلمانوں کی آمد سے شمار کرتے ہیں اور ان کی یہی رائے ہے کہ دہلی کے نواح کی کھڑی بولی نے عربی فارسی اور دیگر زبانوں سے جب آمیزش پائی تو اردو وجود میں آئی لیکن اس کے باوجود ان کا گہرا لسانی شعور اس بات کا بھی پتہ دیتا ہے کہ زبانیں راتوں رات وجود میں نہیں آجایا کرتیں۔ یہ صدیوں کا عمل ہوتا ہے جو زبانوں کو اپنی تکمیل کے مراحل تک پہنچاتا ہے۔ اسی لیے کسی زبان کے بارے میں یہ حتمی رائے قطعاً نہیں دی جاسکتی کہ فلاں اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''وہ وقت بھی کیسا عجیب اور پُر اسرار ہوگا جب کہ زبان پہلی بار تقریر سے نکل کر تحریر میں سماتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ کوئی لڑکپن سے نکل کر بلوغت کی سرحد میں اوّل قدم رکھتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آیا۔ خود اسے بھی نہیں معلوم ہوتا جس پر گزرتی ہے۔ وہ عجیب

آن ہے جو نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ بیان میں سما سکتی ہے ۔ بعینہ یہی حال زبان کا ہے وہ آوازیں جو پہلی بار حروف میں منتقل ہوئیں ہمیشہ سے نظر سے پوشیدہ رہیں گی۔ لیکن زبان کا مورخ اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ اگر نقشِ اوّل نہیں تو نقشِ ثانی تو کہیں ضرور مل رہیگا۔ ایک زمانہ وہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دل کش انسانی آوازیں سینوں میں محفوظ رہتی ہیں اور ارثاً ایک نسل سے دوسری نسل کو پہونچتی ہیں ۔ لیکن اُردو کو وہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ گیتوں کی زبان اُردو نہیں ۔ اس لئے ابتدائی اُردو سینوں میں نہیں سفینوں میں تلاش کرنی پڑے گی ۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری کی زبان کا پتہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے لگتا ہے۔'' (۱۰۸)

چنانچہ کسی ایک لمحے کو کسی زبان کا جنم لحہ نہیں کہا جاسکتا کسی زبان کے آغاز کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب اس زبان کی تحریریں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن یہ طے ہے کہ وہ زبان تحریر سے پہلے تقریر کی صورت میں رواں دواں ہوتی ہے اور تقریر کی صورت میں آنے کے لیے بھی اسے صدیوں کا عمل چاہیے ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب 'اردو لسانیات' میں لکھتے ہیں:

''یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کی ابتدا کے کیا معنی ہیں؟ ابتدا کو استعارے کے طور پر اہل علم پیدائش اور اس کے ابھار دن کو جنم دن کہتے آئے ہیں۔ اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اُردو کسی خاص زمانے میں خاص وقت پر اس طرح پیدا ہوئی جیسے بطنِ مادر سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان کا آغاز اس کا ارتقا ہے۔ اس کا جنم اس کے خط وخال یعنی امتیازی خصوصیات کا ابھار یا نکھار ہے۔ اس ابھار یا نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی ۔ لیکن زبان کی زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب اس کے خط وخال نمایاں ہوکر اور اس کی امتیازی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں ۔ ہم اس دور کو زبان کا یومِ میلاد قرار دے سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا آغاز اس دور کے لگ بھگ ہوا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ زبان کا آغاز نہیں ارتقا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا کا سوال اس کے ارتقا سے وابستہ ہے۔'' (۱۰۹)

مولوی عبدالحق کے اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء کے حوالے سے نظریات کا جائزہ لینے سے جو

بات سامنے آتی ہے اس کے مطابق مولوی عبدالحق کے نظریہ کے دو پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیتے ہیں جو دہلی کے گردونواح کی مقامی پراکرت زبان میں دیگر زبانوں عربی، فارسی، ترکی، پنجابی وغیرہ کے الفاظ کی شمولیت سے بنی۔ جب یہ زبان یہاں سے برصغیر کے مختلف علاقوں میں پہنچی تو وہاں پر اس نے علاقائی اثرات قبول کیے اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں ہوتا چلا گیا۔ اس وجہ سے اردو کے اندر ایک رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق کے نظریے کا دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اردو کی اصل اسی پراکرت زبان ہی کو قرار دیتے ہیں جو دہلی کے گردونواح کی زبان تھی۔ دیگر زبانوں کے اثرات صرف اسماء اور صفات کی حد تک رہے۔ جبکہ زبان کا بنیادی ڈھانچہ اسی پراکرت کا رہا۔ اس طرح مولوی عبدالحق کے بیانات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ اردو زبان دراصل وہی قدیم پراکرت زبان ہی ہے جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کی شمولیت سے نکھار پیدا ہوا اور اردو زبان نے ان دیگر زبانوں کے ملاپ سے اپنی ارتقائی منزلیں طے کیں۔

حوالہ جات

(۱) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء، (حرف اول)

(۲) میر امن دہلوی، باغ و بہار (مرتبہ مولوی عبدالحق)، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۴ء، ص ۴۔۵

(۳) سر سید احمد خان، آثار الصنادید، دہلی، س ن، باب چہارم

(۴) محمد حسین آزاد، آبِ حیات، (مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری)، لاہور، مکتبہ عالیہ، ص ۳۱

(۵) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۴۳

(۶) شمس اللہ قادری، حکیم، اردوئے قدیم، اورنگ آباد، تاج پریس، ۱۹۲۵ء، ص ۱۴

(۷) نصیر حسین خاں خیالؔ، نواب، داستانِ اُردو، حیدر آباد دکن، ادارہ اشاعتِ اردو، س ن، ص ۳۰۔۳۱

(۸) محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو (حصہ اول)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۶

(۹) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۸

(۱۰) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۸

(۱۱) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۱۰

(۱۲) محی الدین قادری زور، ہندستانی لسانیات، لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۹۲ء، ص ۲۷

(۱۳) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۴۷

(۱۴) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۳۷

(۱۵) کیفی، برجموہن دتاتریہ، کیفیہ، لاہور، مکتبہ معین الادب اردو بازار، ۱۹۵۰ء، ص ۲۲

(۱۶) ـــــــــ ایضاً ـــــــــ، ص ۵۹

(۱۷) غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، چھٹی جلد، اردو ادب (اول)، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷

(۱۸) عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور، اورینٹ ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۸ء، ص ۹۳

(۱۹) سلمان ندوی، سید، نقوشِ سلمانی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱

(۲۰) جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو (جلد اول)، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۳

(۲۱) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔، ص ۷۔۸

(۲۲) نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۳۳

(۲۳) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔، ص ۳۵۔۳۶

(۲۴) سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۲۶۶

(۲۵) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔، ص ۳۴۹

(۲۶) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔، ص ۴۴۲

(۲۷) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۳۔۲۰۴

(۲۸) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، کراچی، مکتبہ تخلیقِ ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷

(۲۹) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، داستانِ زبانِ اردو، کراچی، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۹۳

(۳۰) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔، ص ۹۴

(۳۱) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء، حرفِ اول

(۳۲) مسعود حسین، ڈاکٹر، مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۶ء، ص ۳۵

(۳۳) منظور جنگ بہادر، نواب مولوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، لکھنو،
ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء، ۱۲۴

(۳۴) مولوی عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق (مرتبہ: عبادت بریلوی)،
لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۴ء، ص ۸۷

(۳۵) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی)،
کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۲ء، ص ۱۔۲

(۳۶) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔، ص ۲

(۳۷)۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۳۳

(۳۸) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۶۵۔۴۶۶

(۳۹) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۶۶۔۴۶۷

(۴۰) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۶۹۔۴۷۰

(۴۱) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۷۵۔۴۷۶

(۴۲) قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات (حصہ دوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء، ص۱۶۱

(۴۳) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً، ص۴۷۰

(۴۴) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو (پاکستان)، 1951ء، ۳

(۴۵) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،۳۔۴

(۴۶) مولوی عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق، ایضاً، ص۵۸

(۴۷) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً، ص۱۰۹۔۱۱۰

(۴۸) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۴۷

(۴۹) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۲۲۱

(۵۰) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۷۴

(۵۱) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۷۴۔۴۷۵

(۵۲) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۷۶

(۵۳) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۷۶

(۵۴) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۷۶

(۵۵) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۴

(۵۶) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۰۷۔۱۰۸

(۵۷) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۵۱

(۵۸) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص۴۰۴۔۴۰۵

(۵۹) ـــــــ ایضاً ــــــــ ،۱۹۵۲ء، ص ۵۱

(۶۰) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۷۱

(۶۱) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۷۳

(۶۲) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۲۲۱

(۶۳) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۲۲۲

(۶۴) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۴۲۶

(۶۵) مولوی عبدالحق، تنقیداتِ عبدالحق (مرتبہ: محمد تراب علی خان باز)،
فاضل حیدرآباد دکن، عزیز احمد منشی، طبع سوم (س ن)، ص ۱۰۸

(۶۶) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۰۸

(۶۷) حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو (حصہ اوّل)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء، ۶۴

(۶۸) مولوی عبدالحق، تنقیداتِ عبدالحق، ایضاً، ص ۱۱۲

(۶۹) حافظ محمود شیرانی، مکاتیب حافظ محمود شیرانی، (مرتبہ: مظہر محمود شیرانی)،
لاہور، مجلسِ یادگارِ حافظ محمود شیرانی، ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۳

(۷۰) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً، ص ۳۳۷

(۷۱) مولوی عبدالحق، تنقیداتِ عبدالحق، ایضاً، ص ۱۱۲

(۷۲) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً، ص ۱۸۵

(۷۳) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۹۲۔۱۹۳

(۷۴) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۹۶

(۷۵) مولوی عبدالحق، قدیم اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۱ء، ص ۱۷۱۔۱۷۲

(۷۶) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۷۱۔۱۷۲

(۷۷) مولوی عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق، ایضاً، ص ۱۱۵۔۱۱۶

(۷۸) ـــــــ ایضاً ــــــــ ، ص ۱۱۶

(۷۹) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۱۶۔۱۱۷

(۸۰) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۴۳۔۱۴۴

(۸۱) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً،ص۱۹۱۔۱۹۲

(۸۲) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۳۷

(۸۳) مولوی عبدالحق، اردو (سہ ماہی رسالہ)، کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء،ص۵

(۸۴) قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات (حصہ دوم)، اسلام آباد،
مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء،ص۷۴۔۷۵

(۸۵) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً،ص۸

(۸۶) مولوی عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق، ایضاً،ص۱۱۲

(۸۷) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً،ص۸۰

(۸۸) کیفی، برجموہن دتاتریہ، کیفیہ، لاہور، مکتبہ معین الادب اردو بازار، ۱۹۵۰ء،ص۳۹

(۸۹) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، ایضاً،ص۳۶

(۹۰) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، ایضاً،ص۲۰۴۔۲۰۵

(۹۱) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً،ص۱۱۔۱۲

(۹۲) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۲۶۔۲۷

(۹۳) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۸۰۔۸۲

(۹۴) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۸۲۔۸۳

(۹۵) مولوی عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق، ایضاً،ص۱۰۵

(۹۶) مولوی عبدالحق، خطباتِ عبدالحق، ایضاً،ص۴۵۹۔۴۶۰

(۹۷) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۲۲

(۹۸) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۲۰۔۱۲۱

(۹۹) ۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔۔،ص۱۸۶

(۱۰۰) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص ۱۸۷

(۱۰۱) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص ۱۹۰۔۱۹۱

(۱۰۲) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص ۴۰۸

(۱۰۳) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص ۴۵۳

(۱۰۴) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص ۴۵۴

(۱۰۵) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ۱۔۳

(۱۰۶) مولوی عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق، ایضاً، ص ۶۴۔۶۵

(۱۰۷) ۔۔۔۔۔۔۔ایضاً ۔۔۔۔۔۔۔،ص ۲۷

(۱۰۸) مولوی عبدالحق، قدیم اُردو، ایضاً، ص ۱۷۳

(۱۰۹) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، ایضاً، ص ۱۹۔۲۰

☆☆☆

مولوی عبدالحق کی اردو قواعد نویسی

مولوی عبدالحق کی اردو قواعد نویسی

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ترقی کی ہمیشہ خواہش کی اور اس کے فروغ کے لیے ہر وقت مصروف عمل رہے۔ اس حوالے سے انہوں نے بہت سے عملی کام کئے۔ خصوصاً جب انہیں محکمہ تعلیم کی اہم ذمہ داری بطور مہتمم تعلیمات اورنگ آباد ملی تو انہوں نے تعلیم کے میدان میں اردو کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش کی۔ اس حوالے سے نئے مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا اور پہلے سے موجود مدارس میں اردو کی تعلیم کے خصوصی مواقع پیدا کئے گئے ۔ تعلیمی نصاب کو پھر سے مرتب کیا گیا اور اس میں اردو کی تعلیم کو ترجیحی مقام دیا گیا۔ اسی موقع پر مولوی عبدالحق کو یہ بھی ذمہ داری دی گئی کہ وہ مدارس کے لیے اردو نصاب کو ازسرِ نو مرتب کریں۔ چنانچہ سکولوں کے تمام درجات کے لیے انہوں نے درسی کتابیں مرتب کر کے شائع کیں اور ان کو شاملِ نصاب کیا گیا۔ ان کتب میں خصوصیت کے ساتھ جس چیز کو اہمیت دی گئی وہ اردو صرف ونحو کا حصہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو اردو زبان کو صحت کے ساتھ بولنے اور لکھنے کی تربیت دی جائے کیونکہ اسی میں اس زبان کا فروغ اور تحفظ پوشیدہ ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ اردو قواعد کے لیے انہوں نے الگ کتابچے مرتب کر کے شائع کرائے اور مختلف سطح کے درسی نصاب میں شامل کئے گئے۔

دراصل مولوی عبدالحق اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے مختلف ذرائع کو بیک وقت استعمال کر رہے تھے۔ اس حوالے سے انجمن ترقی اردو کا پلیٹ فارم ان کے لیے بہترین محاذ ثابت ہوا۔ انہوں نے بہترین افرادی قوت کے ذریعے یہاں سے نہ صرف اردو مخالف سیاسی اور حکومتی چالوں کو ناکام بنایا بلکہ بہت سے ایسے عملی اقدامات کئے جن کے ذریعے وہ اردو کو اتنا طاقت ور بنا دینا چاہتے تھے کہ اس کے مقابل کوئی اور زبان ٹھہر نہ سکے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو کے تحت پریس قائم کر کے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ خصوصاً زبان وادب کی قدیم کتابوں کو سامنے لایا گیا تا کہ اردو زبان کی بنیادوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اسی طرح کئی اشاعتی سلسلے شروع کئے گئے جن میں اردو کے لیے ایک معیاری لغت مرتب کرنے کا بہت بڑا منصوبہ بھی شامل تھا۔ اسی طرح اردو میں اصطلاحات کی کمی کو پورا کرنے اور اس حوالے سے موجود مسائل کے حل کے لیے باقاعدہ پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اردو کے لیے باقاعدہ طور پر قواعد نویسی پر کام کرنا بھی اردو کے فروغ اور تحفظ کی انہیں کوششوں کا حصہ تھا۔

اگرچہ مولوی عبدالحق یہ سمجھتے تھے کہ ایک زندہ اور جدید زبان کے قواعد مرتب کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ خصوصاً بچوں کو زبان دانی کے لیے صرف ونحو پڑھانا ان کے لیے مضر ہوسکتا ہے اور وہ قواعد کی پیچیدگیوں میں الجھ کر اصل مقصد تک پہنچنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اردو قواعد نویسی کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا کی مختلف زبانوں میں قواعد نویسی کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب ان زبانوں کو اہلِ زبان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے سیکھنا چاہا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے اس زبان کے قواعد کی طرف توجہ دی۔ اس طرح مولوی عبدالحق کے بقول زبان کے سب سے پہلے علمی نحوی وہ لوگ تھے جنہوں نے سب سے اوّل علمی طور پر زبانوں کی تعلیم دی۔ صرف ونحو کے قواعد کی تدوین اُنہیں معلمین السنہ کا کام تھا۔ (۱)

چنانچہ اردو قواعد کی طرف بھی سب سے پہلے غیروں نے توجہ دی۔ انگریزوں نے جب یہاں تجارت کی غرض سے قدم رکھا تو ان کو یہاں کے لوگوں کے ساتھ رابطے میں دقت پیش آئی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہاں پر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا جس کے لیے ایسی زبان سیکھنا لازمی ہو گیا جس کے ذریعے وہ یہاں کے عوام کے ساتھ رابطہ کر سکیں۔ اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو ان کی ضرورت کو پورا کر سکتی تھی۔ لیکن اردو زبان انگریزی سے بالکل مختلف تھی اور اس نئی زبان کو سیکھنے کے لیے اس کے اصول وضوابط کو جاننا انتہائی ضروری تھا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر انگریزوں نے اردو قواعد نویسی کی طرف توجہ دی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''پہلا یورپین جس نے ہندُستانی زبان کے قواعد لکھے وہ جان جوشوا کٹلر تھا۔ جو پرشیا کے شہر ایل بجن میں پیدا ہوا۔۔۔اس نے ہندُستانی زبان کے قواعد اور لغت پر کتاب لکھی جو ڈیوڈ مل نے سنہ ۱۷۴۳ء میں چھاپ کر شائع کی۔ قیاس یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس نے ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ تالیف کی ہوگی۔ یہ کتاب لٹین زبان میں ہے لیکن ہندُستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں، البتہ حروف کے پٹیوں میں ہندُستانی الفاظ بعینہٖ لکھے ہیں اور ان الفاظ کا املا ڈچ زبان کے طریقے پر ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق بھی جان جوشوا کیٹلر ہی وہ پہلا یورپین شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان کی قواعد لکھی۔ اس وقت ولی کو دلی آئے ہوئے سات آٹھ سال ہوئے تھے اس لیے یہ قواعد اس زمانے کی اردو زبان کے مطابق ہے۔ (۳) یہاں پر 'قواعدِ اردو' کے تین ایڈیشنز کا موازنہ کرنے سے مولوی عبدالحق کے ہاں کیٹلر کے نام کی املا میں معمولی فرق ملتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں اس مقام پر کٹلر نام درج ہے (۴)،

انجمن ترقی اردو ہی کے ۱۹۵۱ء کے ایڈیشن میں کٹنلر لکھا گیا ہے (۵) جبکہ لاہور اکیڈمی لاہور، کی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں کیٹلر درج ہے۔ (۶) اس طرح تینوں ایڈیشنز میں اس مقام پر نام میں کسی حد تک اختلاف ہے لیکن آگے چل کر ہر جگہ وہ کیٹلر استعمال کرتے ہیں۔ دیگر قواعد نویسوں نے بھی یہ نام کیٹلر ہی لکھا ہے۔ (۷)

اس کے بعد متعدد یورپین ماہرین نے اردو قواعد پر کتابیں لکھیں۔ کیٹلر کی گریمر کی طباعت کے دوسرے سال (۱۷۴۴ء) ہی شلز کی ہندوستانی زبان کی قواعد پر کتاب شائع ہوئی۔ (۸) اس نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں کیٹلر کی کتاب کا ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ کتاب کافی متعارف ہو چکی تھی۔ شلز کی قواعد لاطینی میں ہے لیکن اس میں ہندوستانی الفاظ اردو کے رائج رسم الخط میں درج کئے گئے ہیں اور ان کا تلفظ لاطینی میں دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سالِ اشاعت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ۱۷۴۴ء لکھا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی بھی سالِ اشاعت ۱۷۴۴ء لکھتے ہیں (۹) جبکہ محمد عتیق صدیقی کے مطابق اس کا سالِ اشاعت ۱۷۴۵ء ہے۔ (۱۰) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان سب سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب شلز نے ۱۷۴۱ء میں لکھی۔ (۱۱)

اس کے بعد متعدد قواعد کی کتابیں لکھی گئیں لیکن یہ رجحان یورپینز کے ہاں رہا اور کسی ہندوستانی نے باقاعدہ طور پر اس طرف توجہ نہیں دی۔ اس حوالے سے سب سے اہم نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ جان گلکرسٹ کا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کتاب 'ہندوستانی زبان کے قواعد' ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی۔
اس سے قبل مرقومہ بالا کم از کم گیارہ کتابیں اور اس فن پر تالیف و شائع ہو چکی تھیں۔'' (۱۲)

لیکن اس سے قبل خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب یہ ذکر کر چکے تھے کہ ان گیارہ میں سے پہلی دو کتابیں قواعد کے بجائے اردو لغت کی تھیں۔ (۱۳) مولوی عبدالحق جان گلکرسٹ کو اردو زبان کا محسن شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خود اردو زبان کی لغت اور قواعد مرتب کئے بلکہ دوسرے لوگوں سے بھی اس حوالے سے کتابیں لکھوائیں۔ ان کا مقصد انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا تاکہ وہ یہاں کے لوگوں سے بات چیت کر سکیں اور کاروبارِ حکومت چلانا آسان ہو۔ لیکن اس مقصد کے پردے میں اردو زبان و ادب کی بے مثل کتابیں تیار ہو گئیں۔ اردو قواعد کے حوالے سے ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''ان کی کتاب قواعدِ اُردو سنہ ۱۸۰۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اگرچہ ان کی دو ایک

کتابیں جو اس سے چند سال قبل طبع ہوئی تھیں ان میں بھی اُردو زبان کے قواعد کا کچھ کچھ حصہ شریک تھا۔'' (۱۴)

خلیل الرحمٰن داؤدی کے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تصنیف:

"A-Grammar-of-the Hindustanee Language" (ہندوستانی زبان کے قواعد) کا سالِ اشاعت ۱۸۹۶ء قرار دیتے ہیں اس حوالے سے وہ مولوی عبدالحق کی تحقیق کو بھی درست نہیں سمجھتے جس کے مطابق اس کا سالِ اشاعت ۱۸۰۹ء ہے۔ مولوی عبدالحق کا بیان قلمبند کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''مولانا کی اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کی قواعدِ اردو پہلی بار ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ غلط ہے، ۱۸۰۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ مولانا نے سنِ طباعت دیکھا اور اس کو پہلی چھاپ سمجھے، ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ معلومات بھی کسی دوسری جگہ سے اخذ کی ہوں۔'' (۱۵)

گل کرسٹ کی کتاب کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسے اردو کی پہلی مفصل قواعد قرار دیتے ہیں:

''گل کرسٹ کے رسالے کے اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسے اردو کی پہلی مفصل قواعد کہنا درست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گل کرسٹ نے عام بول چال کی زبان سے زیادہ کتابی زبان کے نمونوں پر بھروسا کیا ہے اور میاں مسکین مشہور مرثیہ گو اور مرزا سودا کی زبان کو اردو کی تفہیم اور تشریح کے لیے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔'' (۱۶)

مولوی عبدالحق نے اپنی قواعدِ اردو میں اردو قواعد نویسی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے تقریباً بیس ایسے یورپینز کا ذکر کیا ہے جنہوں نے باقاعدہ طور پر اردو قواعد کی کتابیں لکھیں۔ وہ ان کتابوں کے سالِ اشاعت بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی مختصراً ان کتابوں کے انداز کو بیان کرتے ہیں لیکن اہم قواعد نویسوں کے حالاتِ زندگی کا بھی جامع انداز میں تذکرہ کر جاتے ہیں تا کہ ان حالات کا اندازہ ہو سکے جو ان کی قواعد نگاری کا باعث بنے۔

اس طرح اہلِ یورپ نے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے اردو قواعد نویسی کی طرف توجہ دی لیکن بلواسطہ طور پر وہ اردو کی ایک اہم خدمت سرانجام دے گئے۔ البتہ جب ان کی مرتب کردہ کتب لغت پر ہم بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو ان کی لغات اپنے معیار کے اعتبار سے وہاں تک نہیں پہنچتیں جس کا قواعد نویسی تقاضا کرتی ہے۔

دراصل انہوں نے اردو قواعد مرتب کرتے ہوئے یورپی زبانوں کو مدِ نظر رکھا جبکہ اردو کے اپنے تقاضے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قواعد نویسی میں کافی جھول نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی لکھتے ہیں:

''یورپ میں بارہویں، تیرہویں صدی میں برِ صغیر کی زبانوں کے علمی مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اردو بھی زیرِ مطالعہ زبانوں میں شامل تھی۔ جرمن، فرانسیسی، ولندیزی اور انگریز علمائے لسانیات نے اردو قواعد کی کتابیں تحریر کیں۔ ان کتابوں کا بڑا مقصد تبلیغ یا تجارت کے لیے ہندوستان جانے والوں کو قواعد کے ذریعہ اردو سکھانا تھا۔ یہ تمام کوششیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ہر یورپی قواعد نویس نے اپنی زبان کے حوالے سے قواعد لکھے اور اس طرح اپنی زبان کے بہت سے غیر متعلق مباحث کو قواعد میں داخل کر دیا جس کی وجہ سے یہ کتب اردو قواعد کا اچھا نمونہ نہیں بن سکیں۔'' (۱۷)

اہلِ ہند میں مشہور شاعر میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی نے سب سے پہلے اس حوالے سے قلم اٹھایا۔ انہوں نے اپنی کتاب 'دریائے لطافت' ۱۸۰۶ء میں تحریر کی۔ (۱۸) مولوی عبدالحق نے دریائے لطافت کے ترجمہ کو، جو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے کیا، مرتب کر کے انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع کیا اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''سید انشا پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اُس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے۔ علاوہ اس کے الفاظ و محاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور اُن کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفظ، مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا، ان سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کئے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنہیں زبان کا ذوق ہے۔ صرف و نحو کے قواعد بھی بڑی سلاست اور جامعیت سے بیان کئے گئے ہیں۔'' (۱۹)

یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ قواعد وضع کرنے سے مولوی عبدالحق کیا مراد لیتے ہیں کیونکہ ایک زندہ زبان کسی ایک شخص کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ایک شخص اس کے اصول وضوابط کا مقرر کرتا ہے بلکہ یہ ایک فطری عمل ہوتا ہے جس کے تحت کسی زبان کے قواعد تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے کسی قواعد نویس کے بارے میں یہ

کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اس زبان کی قواعد مرتب کی ہے یا اس زبان کے اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ دوسرے فارسی عربی کے چھوڑنے کا جہاں تک تعلق ہے تو بھی ان کی قواعد کا پورا ڈھانچہ بھی روایتی نظر آتا ہے اور کوخاص اچھوتا انداز نظر نہیں آتا۔ البتہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بقول انہوں نے قواعد کے مفہوم کو ذرا زیادہ وسیع کر دیا ہے اور ایسی بحثیں اٹھائی ہیں جو عام طور پر قواعد کی کتابوں میں شامل نہیں۔ ان میں اردو میں دخیل الفاظ اور مستعار الفاظ کی بحث، زبان میں مقامی محاورے کی اہمیت، محاورہ، بولی اور زبان کا فرق، فصاحت کا معیار اور اس کی حدود کی بحثیں ایسی ہیں جو اردو کے سلسلے میں پہلی مرتبہ دریائے لطافت میں نظر آتی ہیں۔ (۲۰)

سرسید احمد خان نے بھی اردو صرف ونحو پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ مولوی عبدالحق کے بقول اگرچہ یہ کتاب کچھ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں لیکن اس کے باوجود سرسید کی اردو زبان میں دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے (۲۱)۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۸۷ء میں اس کو ''قواعدِ صرف ونحوِ زبانِ اُردو'' کے نام سے شائع کیا۔

اس کے بعد مولوی عبدالحق نے مولوی احمد علی دہلوی، مولوی امام بخش صہبائی دہلوی اور مرزا محمد صالح کے نام لیے ہیں جنہوں نے اردو قواعد پر کتابیں لکھیں ان کی کتابیں مولوی عبدالحق کے مطابق بالترتیب ۱۸۴۵ء، ۱۸۴۹ء اور ۱۸۲۳ء میں شائع ہوئیں اسی طرح ایک کتاب محمد ابراہیم کی ۱۸۲۳ء میں شائع ہوئی، (۲۲)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کے علاوہ ایک اور قواعد نویس روشن علی انصاری کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا تذکرہ مولوی عبدالحق نے نہیں کیا:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں اکثر مصنفینِ اردو، اردو کی قواعد کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ انشاء کی ''دریائے لطافت'' کو لکھے مشکل سے چند سال گزرے تھے کہ روشن علی انصاری نے ۱۸۱۰ء میں ''رسالہ صرف ونحو'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔'' (۲۳)

اس کے بعد درسی ضرورتوں کے پیشِ نظر کئی نصابی کتابیں قواعدِ اردو پر لکھی گئیں لیکن ان میں تقریباً یکسانیت نظر آتی ہے اور تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ ایک ہی انداز میں قواعدِ اردو کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس حوالے سے چند اہم ناموں کا ذکر کیا ہے ان میں مولوی کریم الدین پانی پتی، حیدر جنگ بہادر، محمد علی، شیو پرشاد، رائے درگاہ پرشاد، منشی صاحب، مولوی محمد احسن اور شیخ برکت علی شامل ہیں۔ ان سب میں انہوں نے مولوی فتح محمد خاں جالندھری کی ''مصباح القواعد'' کو خاص اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ان کتابوں میں مولوی فتح محمد خاں جالندھری کی ''مصباح القواعد'' ایک ممتاز کتاب

ہے۔ یوں تو اس کے کئی نسخے شائع ہوئے ہیں، لیکن اشاعت خانہ رامپور نے ۱۹۴۵ء میں ناظم برقی پریس رامپور سے اس کا ایک نسخہ مصنف کے صحیح کیے ہوئے نسخے سے مقابلہ کر کے شائع کیا تھا۔ عصرِ حاضر کے اکثر و بیشتر قواعد نویسوں نے فتح محمد جالندھری کی ''مصباح القواعد'' سے استفادہ کیا ہے۔'' (۲۴)

مصباح القواعد ۱۹۰۴ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کی اکثر اہلِ علم نے تعریف کی ہے اور اس کو ایک گراں قدر کاوش قرار دیا ہے۔ سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

''۔۔۔ اہلِ علم نے عربی و فارسی قواعد کا تتبع کرتے ہوئے کچھ کتابیں لکھیں جن کا زیادہ تر مقصد طلبا کی رہنمائی تھا۔ مولوی فتح محمد جالندھری کی کتاب ''مصباح القواعد'' سب سے زیادہ جامع تسلیم کی گئی اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔ اگرچہ تحقیق اور زبان کے مزاج و منہاج کی تبدیلی نے بہت سے امور بدل ڈالے ہیں۔ مگر مصباح القواعد کا مطالعہ آج بھی افادیت سے خالی نہیں۔'' (۲۵)

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی مولوی عبدالحق کی 'قواعدِ اردو' ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (۲۶) مولوی عبدالحق اپنی کتاب قواعدِ اردو کی اشاعت کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ اہلِ زبان کو اردو قواعد سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اب چونکہ اردو ایسے خطوں میں بھی بولی جاتی ہے جہاں کی مادری زبان اردو نہیں ہے اس لیے وہاں کے لوگوں کو صحیح اردو بولنے کے لیے اردو قواعد جاننے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اردو زبان بگڑنے نہ پائے۔ اس طرح مولوی عبدالحق کی 'قواعدِ اردو' اردو کے فروغ اور اس کے تحفظ کی کوششوں کا حصہ ہے۔

مولوی عبدالحق اس سے پہلے لکھی گئی قواعد کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کتابوں میں قواعد نویسوں نے اردو کے مزاج کو سمجھے بغیر عربی اور فارسی کی قواعد کا تتبع کرتے ہوئے اردو کی قواعد لکھنے کی کوشش کی ہے جبکہ ایسا کرنا کسی طور پر جائز نہیں:

''ہمارے ہاں اب تک جو کتابیں قواعد کی رائج ہیں ان میں عربی صرف و نحو کا تتبع کیا گیا ہے۔ اُردو خالص ہندی زبان ہے اور اس کا شمول آریاوی السنہ میں ہے، بخلاف اس کے عربی زبان کا تعلق سامی السنہ سے ہے۔ لہٰذا اُردو زبان کی صرف و نحو لکھنے میں عربی زبان کا تتبع کسی طرح جائز نہیں۔ دونوں زبانوں کی خصوصیات بالکل الگ ہیں، جو غور کرنے سے صاف معلوم

ہو جائے گا۔ ۔۔ اُردو زبان کی صرف و نحو میں سنسکرت کے قواعد کا تتبع بھی نہیں کیا جاسکتا۔'' (۲۷)

مولوی عبدالحق اردو زبان کی قواعد کے تقاضوں سے واقف تھے اور وہ اس کو جدید لسانیاتی اصولوں کے مطابق مرتب کرنا چاہتے تھے۔ان کے مطابق اردو کا اپنا ایک مزاج ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر ہی اس کو صحیح انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔اس حوالے سے سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

''اردو زبان ایک قایم بالذات زبان ہے۔ میں نے اپنے مضامین میں اس کا متعدد بار اظہار کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اردو زبان کی قواعد، زبان کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی۔ وہی عربی و فارسی کے اصول وضوابط کی تطبیق کردی گئی ہے یا پھر انگریزی امور کے زیرِ اثر کچھ اظہار کردیا گیا ہے۔ اردو کے اپنے تقاضے کیا ہیں اس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔اس کم توجہی کی متعدد وجوہ ہیں۔ ایک وجہ زبان کے مزاج و آہنگ کو سمجھنا اور اس کے اصول وضوابط اخذ کرنا ہے۔ یہ کام سہل نہیں بڑا کٹھن ہے گویا اس پر کاربند ہو کر اردو قواعد لکھی جائے تو الف سے لے کر ''ی'' تک سب کچھ از سرِ نو جائزہ لے کر لکھنا پڑے گا۔ یہ پِتّا ماری کا کام ہر ایک کے بس کا نہیں ہے۔'' (۲۸)

لیکن وہ مولوی عبدالحق کے سلسلہ میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان کے قواعد مرتب کرتے ہوئے درست انداز اختیار کیا۔ لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق کی ایک اہم کتاب قواعدِ اُردو ہے جس میں اردو کے متعلق بعض امور بالکل نئے اور اچھوتے بیان کئے گئے ہیں اور قواعد کو اردو کے مزاج و منہاج کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' (۲۹)

مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں ایسا طرز اختیار کیا ہے جس کو اس سے قبل قواعد نویسوں نے نہیں اپنایا۔ دراصل وہ قواعد نویسی کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اسی لیے انہوں نے قواعد کی کتابوں کی خامیوں اور ان میں موجود کمی کو پیشِ نظر رکھا اور اپنے طور پر ایک مکمل اور اردو زبان کے جدید تقاضوں کے مطابق قواعد اردو لکھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق نے اپنی قواعدِ اردو میں ایک اور طرز اختیار کیا جس کو ان سے پہلے اردو کے کسی اہلِ زبان قواعد نویس نے اختیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مصباح القواعد سے بالکل

جدا راہ اختیار کی اور عربی اصول پر قواعد کو مرتب نہیں کیا۔ ان کی قواعد اُردو بڑی حد تک مستشرق قواعد نویسوں کے اصول پر لکھی گی ہے مگر چونکہ وہ اُردو کے بہترین مزاج شناس ہیں اس لیے انہوں نے جدید مغربی اصول قواعد نویسی سے استفادے کے ساتھ انفرادیت کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ جہاں تک ترتیبِ مباحث کا تعلق ہے اُن کی قواعد میں حصہ نحو کیلاگ کی ہندی گرامر کے حصہ نحو سے بہت کچھ مستفاد و مماثل ہے، مگر اہم نحوی مسائل پر دسترس اور اصابت رائے کے لحاظ سے مولوی صاحب بہت آگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 'قواعدِ اردو' مولوی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس معیار کی کتابیں دوسری آریائی زبانوں میں بھی مشکل سے ملیں گی کیونکہ وہ زبان کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔'' (۳۰)

اس کے باوجود جب مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو شعوری یا لاشعوری طور پر وہ عربی، فارسی قواعد کی تقلید کر جاتے ہیں ساتھ ہی جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے انگریزی قواعد کا بھی سہارا لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان سب کتابوں میں مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں عربی کا تتبع کیا نہ سنسکرت کا اور انگریزی قواعد کی پیروی میں بھی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ انہوں نے ان تینوں سرچشموں سے استفادہ ضرور کیا ہے۔'' (۳۱)

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کی قواعد کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ماہرینِ لسانیات اردو میں ایک ایسی قواعد کی کمی کو محسوس کرتے ہیں جو صرف اردو کے مزاج کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہو۔ اس حوالے سے مشفق خواجہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا بیان قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو قواعد کی جتنی بھی کتابیں موجود ہیں، وہ عربی، فارسی یا انگریزی قواعد کے تتبع میں لکھی گئی ہیں، کسی نے اردو زبان کے مزاج و منہاج کو سامنے رکھ کر اس کے اصول و قواعد مرتب نہیں کئے۔ میں قواعد کی ایسی ہی کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔'' (۳۲)

یہی وجہ ہے کہ وارث سرہندی نے مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو کے بارے میں اس قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے:

''اگر چہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو قواعد لکھ کر کچھ آگے قدم بڑھایا لیکن وہ

بھی لسانیات کے خطوط پر اپنی کتاب مرتب نہیں کر سکے۔'' (۳۳)

سید قدرت نقوی بھی جدید اردو قواعد کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری تحقیق میں بنیادی بات تو یہ ہے کہ اردو قواعد صحیح معنی میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ گل کرائسٹ اور مولانا صہبائی سے لے کر مولوی عبدالحق تک یہ ہوتا رہا کہ عربی و فارسی کی کتبِ قواعد کو سامنے رکھ کر اردو قواعد لکھ دی۔ مولوی عبدالحق نے یہ کیا کہ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی گرامر کو بھی سامنے رکھا۔ اردو زبان کے اپنے تقاضے کیا ہیں؟ اس کو اصل اصول بنا کر قواعد نہیں لکھی گئی۔ اس لیے بعض مسائل ومباحث تا حال زیرِ غور نہیں آئے۔'' (۳۴)

مولوی عبدالحق اپنی قواعد کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے زبان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ تحریر کی بجائے تقریر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی لیے کسی بھی زبان کا جائزہ لینے کے لیے اس کی تحریری صورت کی بجائے اس کی بول چال کو بنیادی اہمیت دینی چاہیے اور اسی سے اس زبان کے اصول وضوابط کا تعین کرنا چاہئے۔

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب قواعدِ اردو کی فصلِ اول میں ہجا کے حوالے سے حروف اور ان کی اشکال پر بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک حرف کی تعریف ''سادہ آوازوں کو تحریری علامات میں لانے کا نام حرف ہے۔ (۳۵)

حروف کا ذکر کرتے ہوئے اردو میں استعمال ہونے والے حروف کا دیگر زبانوں کے حروف کے ساتھ انہوں نے تقابل کیا ہے۔ مختلف حروف درج کرنے کے بعد وہ اردو حروف کی کل تعداد پچاس بیان کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان حروف کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا۔ (۳۶) جبکہ کہ مولوی فتح محمد خان جالندھری اپنی کتاب مصباح القواعد میں لکھتے ہیں:

''اردو میں حروفِ تہجی اِکاون ہیں اب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ث ج جھ چ چھ ح خ د دھ ڈ ڈھ ذ ر رھ ڑ ڑھ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک کھ گ گھ ل لھ م مھ ن نھ و ہ ء ی۔ (۳۷)''

دراصل مولوی عبدالحق نے 'ٹھ' کو حروف کی فہرست میں شامل نہیں کیا جبکہ مولوی فتح محمد خان جالندھری ''مصباح القواعد'' میں اور انشاء اللہ خان انشا اپنی کتاب ''دریائے لطافت'' میں اس کو علیحدہ لفظ شمار کرتے ہیں۔ البتہ انشاء نے اردو حروف کی تعداد پچاسی بتائی ہے۔ (۳۸) دراصل انہوں نے 'نون' 'ی' اور 'واؤ' کے ساتھ

مخلوط حروف کو بھی الگ حرف شمار کیا ہے۔لیکن ان کی یہ تقسیم درست نہیں انہوں نے اس حوالے سے مصوتوں کا خیال نہیں رکھا اور صحیحوں اور مصوتوں کی تفریق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پنڈت برج موہن دیا تر یہ کیفی اپنی کتاب ''کیفیہ'' میں اردو کے حروف تہجی کی تعداد سینتالیس (۴۷) لکھتے ہیں جن میں اب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ث ج جھ چ چھ ح خ د دھ ڈ ڈھ ذ ر رھ ڑ ڑھ ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک کھ گ گھ ل لھ م ن و ہ ی شامل ہیں۔(۳۹) یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولوی فتح محمد جالندھری نے اپنی کتاب مصباح القواعد میں اور دیگر قواعد نویسوں نے 'ء' کو ایک الگ حرف قرار دیا ہے لیکن مولوی عبدالحق اس کو تسلیم نہیں کرتے اور لکھتے ہیں کہ اسے غلطی سے حروف میں شامل کر لیا گیا ہے۔ (۴۰) اسی طرح پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی لکھتے ہیں:

''بعضوں نے فارسی اور اردو کے قدیم قاعدوں میں ہمزہ (ء) کو بھی ایک حرف قرار دے کر حروف تہجی میں شامل کر دیا ہے۔مگر حقیقت میں وہ حرف ہے نہیں۔اس کی حیثیت پہلے چاہے جو کچھ ہو مگر اب اعراب کی علامت سے زیادہ نہیں۔'' (۴۱)

یہاں پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اس بیان کی وضاحت ضروری ہے جس کے مطابق وہ یہ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے تھ کو اپنی حروف کی فہرست میں شامل نہیں کیا (۴۲)۔ان کی یہ بات درست نہیں تھ مولوی عبدالحق کی فہرست میں با قاعدہ طور پر موجود ہے۔(۴۳)

مولوی عبدالحق نے مختلف حروف کی اشکال پر بحث کرتے ہوئے انہیں تصویری علامتیں قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک زمانہ قدیم میں تحریر کی ابتدائی صورت اشکال کے انداز میں تھی اور شکلوں کے ذریعے کسی چیز کو ظاہر کیا جاتا تھا۔بعد میں انہی شکلوں نے حروف کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح موجودہ حروفِ تہجی وجود میں آئے۔مثلاً وہ الف کو بیل کے سر کی علامت قرار دیتے ہیں کیونکہ الف کے معنی بیل کے سر کے ہیں۔ چنانچہ جب الف کی آواز کو ظاہر کرنا چاہیے ہوتا تھا تو بیل کا سر بنا دیتے۔موجودہ عربی الف کی صورت اب بھی کافی حد تک بیل کے سر سے ملتی ہے۔ مولوی عبدالحق دیگر حروف کی اس حوالے سے وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''اسی طرح ب درحقیقت بیت ہے جس کی ابتدائی شکل ایک مستطیل مکان کی سی تھی اور اس کے نیچے نقطہ ایک شخص تھا جو مکان کے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔اب رفتہ رفتہ اس کی شکل ایک پڑی لکیر ہوگئی اور وہ آدمی نقطہ رہ گیا۔

ج جمل یعنے اونٹ ہے۔اگر کوئی شخص اونٹ پر سوار ہو اور اس کی نکیل زور سے کھینچے تو

اس کے سر اور گردن کی شکل بعینہ ج کی سی ہو جائے گی۔

پ (ف) عبرانی میں منہ کے معنی میں ہے۔

د (عبرانی دالت) دروازہ۔

ہ دریچہ۔

ع (عین) کے معنے آنکھ کے ہیں چناں چہ (ع) کا سرا بالکل آنکھ کے مشابہ ہے۔

ن (نون) مچھلی۔ مشابہت ظاہر ہے۔

ک (کف، ہتھیلی) اگر ہتھیلی پھیلائی جائے تو اُنگلیاں انگوٹھے کے ساتھ مل کر بالکل (ک) کی صورت بن جاتی ہیں۔

م (میم پانی کی لہر) صورت سے ظاہر ہے۔

س عبرانی میں دانت کو کہتے ہیں (س) کا دندانہ بالکل دانت کے مشابہ ہے۔

و (واؤ) کے معنے آنکڑے کے ہیں جس کی صورت و سے ملتی ہے۔'' (۴۴)

اس طرح مولوی عبدالحق کے مطابق ہمارے حروف ان شکلوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے نام بھی متعلقہ اشیا کے ناموں پر رکھے گئے ہیں اس لیے بولنے میں یہ الفاظ ہیں جو دو یا دو سے زیادہ آوازوں سے مرکب ہیں اور ہر حرف ان میں سے پہلی آواز کی نمائندگی کرتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے حروف کو علاقوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ہر ملک کے حروف اس ملک کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ ان کی آوازیں آب و ہوا کی مناسبت سے وہاں کے لوگ بہ آسانی نکال سکتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ بیان بعینہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک ہی علاقے میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کے حروف میں آپس میں اختلاف موجود ہوتا ہے۔ نیز جب ایک ہی زبان دنیا کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہے تو اس کے حروف تہجی میں علاقائی اثرات اور آب و ہوا کے باعث اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح انہوں نے اسی بحث کے تحت یہ بھی کہا ہے کہ انسانی گلہ آلہ موسیقی کے اصول پر تاروں پر مشتمل ہے۔ جب کہ جب انسانی گلے کی ساخت پر غور کیا جائے تو یہ تاروں کی بجائے ووکل کارڈز (Vocal Cards) پر مشتمل ہے جن کی صورت قطعاً تاروں کی نہیں۔

اس موقع پر مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں ایک عنوان ''اعراب (یا حرکات و سکنات)'' کے تحت اردو اعراب کی تفصیل لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سادہ آوازوں کو ہم بلا تکلف ہونٹ اور زبان کی امداد سے ملا کر مرکب کر لیتے ہیں اور اس طرح فراٹے سے باتیں کرتے چلے جاتے ہیں جیسے کسی نے کل کوک دی۔ زبان اور لب کی ذرا سی جنبش سے آواز کی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آواز کا پھیلنا، تند ہونا، بڑھنا، گھٹنا، گھومنا، گول ہو جانا، سب اسی پر منحصر ہے۔'' (۴۵)

مولوی عبدالحق کا یہ بیان بھی بحث طلب ہے۔ کیونکہ آوازوں کا پھیلنا، تند ہونا، بڑھنا، گھٹنا، گھومنا، گول ہو جانا، سب صرف زبان اور لب کی ذرا سی جنبش پر منحصر نہیں بلکہ اس میں اور بھی کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور زبان اور لبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی آواز میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔

حرکات و سکنات کے ہی ذیل میں مولوی عبدالحق نے حروفِ علت کا ذکر کیا ہے جو 'ا، و، ی' ہیں۔ حروفِ علت کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''وہ حروف جو دوسرے حروف کو ملا کر آواز قائم کرنے کے لیے آتے ہیں جنہیں عربی میں حروفِ علت کہتے ہیں ۔۔۔ اُردو میں مثل عربی کے حروفِ علت دو قسم کے ہیں۔ ایک محض علامات (یا اعراب) دوسرے اصل حروف ا، و، ی۔ اعرابی علامات بھی درحقیقت انہیں حروف کی مختصر صورتیں ہیں۔'' (۴۶)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق حروفِ علت کا استعمال صرف عربی کے لیے صحیح اور مناسب ہے۔ اردو قواعد نویسوں نے عربی کے قواعد نویسوں سے حروف علت اور حرکت کی اصطلاحات مستعار لے لی ہیں۔ یہ تین حروف دراصل عربی میں مصوتوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ عربی میں شروع میں مختصر مصوتوں کے لیے کوئی علامت نہ تھی اس وجہ سے حروفِ علت کا استعمال کیا گیا۔ (۴۷)

ڈاکٹر سہیل بخاری بھی اردو میں حروفِ علت کی اہمیت اور ان کے کردار کو وہ مقام نہیں دیتے جو یہ عربی میں ادا کرتے ہیں:

''آج تک اردو زبان کی جتنی بھی چھوٹی بڑی گرامریں لکھی گئی ہیں ان سب میں بلا استثنا جہاں عربی گرامر کی نقل کی گئی ہے اور اس کی اصطلاحات جوں کی توں مستعار لے لی گئی ہیں وہاں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اردو میں تین حرکات (زیر، زبر، پیش) اور تین حروفِ علت و، ا، ی ہوتے ہیں لیکن یہ نام نہاد حروفِ علت ایسے ہیں کہ حرکات کی مدد کے بغیر خود بھی کام نہیں

کرتے حالانکہ دنیا کی دوسری لپیوں (دیوناگری رومن وغیرہ) میں حروفِ علت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ حروفِ صحیحہ کو آواز ادا کرنے میں سہارا دیں۔ایسی صورت میں ان کے دوسرے حروفِ صحیحہ کو مدد دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' (۴۸)

اردو میں اعراب کے سلسلہ میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ زبر کی علامت الف کی خفیف آواز، زیر کی علامت ی کی خفیف آواز اور پیش کی علامت واؤ کی خفیف آواز دیتی ہے۔اسی موقع پر انہوں نے ا، و، ی کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ یہ حروفِ علت کے علاوہ حروفِ صحیح کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔الف جب کسی لفظ کے شروع میں آتا ہے تو ہمیشہ حرفِ صحیح ہوتا ہے۔واؤ اور ی کے حرف جب لفظ کے شروع میں یا درمیان میں آئیں اور متحرک ہوں تو حروفِ صحیح ہونگے۔لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس کو غلط قرار دیا ہے ان کے مطابق الف اگر لفظ کے شروع میں بھی آئے تو مصوتہ ہوتا ہے کیونکہ اردو میں اکثر الفاظ مصوتوں سے شروع ہوتے ہیں۔اس حوالے سے انہوں نے الطاف (م ص + ص م ص) ایثار (م + ص م ص) اوباش (م + ص م ص) الٹا (م ص + م ص) کی مثالیں دی ہیں۔(۴۹)

ہمزہ (ء) کے بارے میں مولوی عبدالحق نے یہ کہا ہے کہ یہ ی اور واؤ کے ساتھ وہی کام سرانجام دیتا ہے جو مد الف کے ساتھ یعنی ان آواز کو کھینچتا ہے۔عربی میں اس کو خفیف ع کے طور پر لیا جاتا ہے اور اسی لیے اس کی شکل بھی ع سے مماثل ہے۔ایک ی پر جو آخر میں آتی ہے ہمزہ لکھنا درست نہیں جیسے رای، رائے لیکن آئے، جائے، آیئے، جایئے میں ہمزہ لکھنا لازم ہے کیونکہ یہ اس کے بغیر صحیح تلفظ ادا نہیں کرتے۔لیکن جب مولوی عبدالحق کے اس بیان کا جائزہ لیا جائے تو جہاں الف ممدودہ موجود ہو وہاں پر بھی ہمزہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

مولوی عبدالحق نے اپنی قواعدِ اردو میں ساتھ ساتھ مختلف وضاحتی نوٹ بھی دیے ہیں اور مختلف علامات کے نام رکھے جانے کی وجوہات بیان کی ہیں جیسا کہ حروفِ تہجی کے ناموں کے بارے میں انہوں نے جو تفصیل درج کی ہے۔اسی طرح 'اعراب' کے بارے میں وہ یوں لکھتے ہیں:

''ان علامات کو اعراب اس لیے کہتے ہیں کہ اہلِ عرب کی ایجاد سمجھے جاتے ہیں۔ اعراب سے یہ مطلب ہے کہ کسی پر ان میں سے کسی علامت کا لگانا۔انہیں حرکات بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان علامات سے آواز میں حرکت پیدا ہوئی ہے۔لیکن چوں کہ جزم سے سکون پیدا ہوتا ہے اس لیے پورا نام حرکات وسکنات ہے۔اعراب کا لفظ مختصر ہونے کی وجہ سے زیادہ مناسب

ہے۔جس حرف پر کوئی حرکت ہوتی ہے اسے متحرک کہتے ہیں۔'' (۵۰)

واوٴ معدولہ کے بیان میں انہوں نے لکھا ہے کہ بعض فارسی کے الفاظ ایسے ہیں جن میں واوٴ لکھی تو جاتی ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آتی اور یہ واوٴ ہمیشہ خ کے بعد آئی ہے۔مولوی عبدالحق کے بقول اس قسم کی واوٴ کے نیچے ایک چھوٹا سا خط کھینچ دیتے ہیں۔دراصل قدیم رسم الخط میں اس کے لیے کوئی علامت نہ تھی لیکن بعد میں ایک خط واوٴ کے نیچے لگا دیا گیا لیکن اس وقت عام طور پر یہ خط بھی نہیں کھینچا جاتا۔

واوٴ کے بطور پیش استعمال ہونے کے بارے میں مولوی عبدالحق قواعدِ اردو میں لکھتے ہیں کہ اردو میں بعض الفاظ ایسے ہیں جہاں واوٴ بجائے پیش کے استعمال ہوتی ہے، لیکن اب وہ متروک ہوتی جاتی ہے۔اس کی مثالیں انہوں نے یہ دی ہیں: اوس (بجائے اُس)، پہونچنا (بجائے پہنچنا)، پورانا (بجائے پرانا)، چورانا (بجائے چرانا) (۵۱)۔لیکن جہاں تک واوٴ کا یہ استعمال ہے مولوی عبدالحق کے بیان کے برعکس اس وقت تک متروک ہو چکا ہے۔

مولوی عبدالحق نے ھ سے مخلوط آوازوں کو علیحدہ حروف شمار کیا ہے لیکن انہوں نے نون غنہ اور ی کے ساتھ مخلوط آوازوں کو علیحدہ حروف قرار نہیں دیا جیسا کہ انشاء اللہ خان انشا اپنی کتاب 'دریائے لطافت' میں نون غنہ، ی اور واوٴ کے ساتھ مخلوط حروف کو علیحدہ حرف شمار کیا ہے۔لیکن انہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ نون غنہ جب الفاظ کے بیچ میں آتا ہے تو اپنے سے پہلے حرف سے مل کر ایسی آواز پیدا کرتا ہے کہ بھ، پھ، وغیرہ کی طرح ایک آواز معلوم ہوتی ہے ۔جیسے ہنسنا، کنور وغیرہ۔اسی طرح ان کے مطابق بعض الفاظ میں ی بھی اپنے پہلے حرف کے ساتھ اس طرح مل کر پڑھی جاتی ہے کہ وہ دونوں ایک آواز معلوم ہوتے ہیں۔جیسے کیا، کیاری، پیارا، دھیان، چیونٹی، گیارہ۔نہ صرف یہی بلکہ انہوں نے اس ی کو اپنی طرف سے الگ نام بھی دے دیا اور علامت بھی تجویز کر دی:

> ''اس کا نام ہم نے یاے معدولہ رکھا ہے۔امتیاز کے لیے ایسی ی کے اوپر یہ ( ) نشان لگا دیتے ہیں'' (۵۲)

لیکن اس قسم کی اختراعات کو قواعد نویس قبول نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ بعد کی کتب قواعد میں ہمیں یہ اصطلاحات یا ان کا اس طور استعمال نظر نہیں آتا۔

الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی بحث میں وہ یہ لکھتے ہیں کہ بعض عربی الفاظ ایسے ہیں جن میں الف ی کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔جیسے عقبیٰ اور دعویٰ میں۔اس کے حاشیے میں وہ وضاحت کرتے ہیں کہ اردو میں ایسے لفظ

ا سے لکھنے چاہییں ۔جیسے دعوا، اعلا، ادنا۔ (۵۳) چنانچہ انہوں نے جہاں بھی ان الفاظ کو درج کیا اسی املا کے ساتھ درج کیا (۵۴) لیکن اردو لغت نویسوں نے ان الفاظ کو عربی طرز پر ہی لکھا ہے مثلاً دعویٰ کو فرہنگِ آصفیہ (۵۵) اور نور اللغات (۵۶) میں دیکھیے۔ اردو میں ان الفاظ کا عام طور پر رواج بھی عربی طرز پر ہی ہے۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کے حوالے سے ہمیشہ احساسِ تفاخر کا شکار رہے۔ وہ اس کو دنیا کی کسی بھی زبان سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔ اردو رسم الخط کا ذکر کرتے ہوئے اس کی خوبی کا اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اُردو تحریر میں (مثل عربی فارسی کے) یہ عجیب بات ہے کہ الفاظ میں حروف پورے نہیں لکھے جاتے بلکہ ہر حرف کے لیے صرف چھوٹا سا نشان بنا دیتے ہیں، اس طور پر الفاظ نہایت مختصر ہو جاتے ہیں۔ بخلاف دوسری زبانوں کے جن کے لکھنے میں بہت طول ہو جاتا ہے اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے۔ یہ طرزِ تحریر نہایت شائستہ اور مہذب ہے۔ مختصر نویسی جس کا رواج یورپ میں اب تھوڑے زمانے سے ہوا ہے وہ ہمارے یہاں صدہا سال سے موجود ہے۔ ایک مشاق لکھنے والا مقرر کی تقریر کو بخوبی قلمبند کر سکتا ہے۔ یہ خوبی درحقیقت بہت لائق قدر اور دوسری زبانوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔'' (۵۷)

اردو حروف کے سلسلہ میں انہوں نے حروفِ قمری اور حروفِ شمسی کو درج کیا ہے۔ ان حروف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''عربی میں امتیاز و خصوصیت کے لیے اسما پر (ال) لگا دیتے ہیں۔ بعض حروف ایسے ہیں کہ اگر ان کے پہلے ال آتا ہے تو تلفظ میں ظاہر نہیں کیا جاتا اور لفظ کا اول صرف مشدد پڑھا جاتا ہے۔ جن حروف کے شروع میں ال نہیں پڑھا جاتا انہیں حروفِ شمسی کہتے ہیں۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ جب شمس کے پہلے ال لگایا جاتا ہے تو لام کی آواز ظاہر نہیں کی جاتی (الشمس) اور جن حروف میں ل کی آواز تلفظ میں ظاہر کی جاتی ہے انہیں حروفِ قمری کہتے ہیں، کیونکہ قمر پر جب ال لگائیں گے تو ل کی آواز ظاہر کی جائے گی (القمر)۔ اس کا استعمال صرف عربی الفاظ کے ساتھ عربی قواعد کی رو سے ہوتا ہے۔ چوں کہ اُردو میں ایسے الفاظ اکثر آتے ہیں لہٰذا اس کی تصریح یہاں کر دی جاتی ہے۔'' (۵۸)

چنانچہ حروفِ قمری کے تحت انہوں نے پندرہ حرف درج کیے ہیں جو ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ،

ف، ق، ک، ل، م، و، ہ، ی ہیں۔لیکن باقی تمام قواعد نویسوں اور لغت نویسوں نے ان کی تعداد چودہ بتائی ہے۔مولوی فتح محمد خان جالندھری مصباح القواعد میں چودہ حروفِ قمری کی تفصیل میں ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ہ، ی درج کرتے ہیں۔(۵۹) یہاں پر انہوں نے ل کو حروفِ قمری میں شمار نہیں کیا۔اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جامع القواعد میں حروفِ قمری میں ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ی، ن کو درج کرتے ہیں۔ ل کو انہوں نے بھی درج نہیں کیا لیکن ایک اور تبدیلی جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ ہ کی بجائے انہوں نے ن کا اندراج حروفِ قمری میں کر دیا جو درست نہیں۔(۶۰) المنجد میں بھی حروفِ قمری کی تعداد چودہ درج ہے۔(۶۱) اس طرح مولوی عبدالحق نے ل کو حروفِ قمری میں شامل کیا ہے جس پر دیگر لوگ متفق نہیں۔

اسی طرح مولوی عبدالحق نے حروفِ شمسی لکھتے ہوئے بھی ان کی تعداد کم کر دی ہے۔انہوں نے گیارہ حروفِ شمسی درج کیے ہیں جو د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، اور ن ہیں۔جبکہ مولوی فتح محمد خان جالندھری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی چودہ حروفِ شمسی لکھتے ہیں جن میں ت، ث، اور ل بھی شامل ہیں۔دراصل مولوی عبدالحق حروفِ شمسی اور حروفِ قمری دونوں میں کمی بیشی کا شکار ہو گئے ہیں۔

مولوی عبداحق نے 'قواعدِ اردو' کی فصلِ دوم تحت 'صرف' کی تعریف کے تحت لکھا ہے کہ صرف میں الفاظ سے بحث کی جاتی ہے۔الفاظ گفتگو میں آتے ہیں اور اس کی نقل لکھنے میں کی جاتی ہے۔ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قواعد میں صرف بامعنی الفاظ سے بحث کی جاتی ہے۔(۶۲) جامع القواعد میں صرف کی یہ تعریف کی گئی ہے:

> ''جس علم میں کلمات کے تغیر و تبدل اور ان کے بنانے اور بننے کے طریقوں اور اصولوں کا بیان ہوا سے قواعد کی اصطلاح میں علمِ صرف کہتے ہیں۔'' (۶۳)

مولوی عبدالحق نے لفظ کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔مستقل اور غیر مستقل۔مستقل وہ جو اپنی ذات سے پورے معنی رکھتے ہوں۔غیر مستقل وہ جو اپنی ذات میں پورے معنی نہ رکھتے ہوں اور جب تک کسی دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر نہ آئیں مکمل مفہوم ادا نہیں کرتے۔ڈاکٹر محمد صدیق شبلی اس تقسیم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قواعد اردو میں صرف کا آغاز مستقل اور غیر مستقل الفاظ سے کیا گیا ہے۔اسم، صفت، ضمیر، فعل، تمیز کو مستقل الفاظ کے تحت اور حروف کو غیر مستقل کے تحت رکھا گیا ہے۔اردو قواعد نویس عربی کی پیروی میں کلمہ کو اسم، فعل اور حرف میں تقسیم کرتے چلے آئے ہیں اور کلمہ کی تمام اقسام کو ان تینوں کے تحت زیرِ بحث لاتے رہے ہیں۔مولوی صاحب نے اردو کے مزاج کا

خیال کرتے ہوئے اس تقسیم کو رواج دینے کی کوشش کی۔ان کے بعد لکھی جانے والی قواعد کی بیشتر علمی کتابوں میں تقسیم کے اسی اصول کو اپنایا گیا ہے۔قواعد کی درسی کتابیں البتہ اب تک اسم، فعل اور حرف کی تقسیم پر کاربند ہیں۔'' (۶۴)

مستقل اور غیر مستقل کی مزید تقسیم مولوی عبدالحق نے اس طرح کی ہے کہ مستقل الفاظ کی پانچ قسمیں ہیں۔(۱)اسم (۲)صفت (۳)ضمیر (۴)فعل (۵)تمیز جبکہ غیر مستقل الفاظ کی چار قسمیں بیان کی ہیں (۱)ربط (۲)عطف (۳)تخصیص (۴)فجائیہ

مولوی فتح محمد جالندھری نے مستقل اور غیر مستقل کی تقسیم نہیں کی بلکہ انہوں نے کلمہ کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: (۱)اسم (۲)فعل (۳)حرف (۶۵)

جبکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفت اور ضمیر کو اسم کی باعتبارِ نوعیت قسموں میں شمار کیا ہے۔(۶۶)

اسم کی تعریف مولوی عبدالحق نے یہ کی ہے:

''اسم وہ لفظ ہے جو کسی جان دار یا شے یا کیفیت کا نام ہو۔'' (۶۷)

اسم کی اس تعریف کو جامع نہیں سمجھا گیا اور مختلف قواعد نویسوں نے مزید واضح تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔اس حوالے سے مولوی فتح محمد خاں جالندھری اسم کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''اسم وہ کلمہ ہے جو اکیلا اپنے معنی دے اور اس میں کوئی زمانہ (حال، ماضی، مستقبل) نہ پایا جائے۔'' (۶۸)

مولانا محمد حسین نے اسم کی تعریف اس طرح کی ہے:

''اسم وہ کلمہ ہے جو کسی چیز، شخص، از قسم جنس جاندار و بے جان اشیاء کا نام ہو اور اس میں کوئی زمانہ نہ پایا جاتا ہو۔'' (۶۹)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نزدیک اسم کی تعریف یہ ہے:

''منصرف یا تغیر پذیر کلمہ 'اسم' ہے جو تنہا زمانے کے بغیر اپنے معنی بتاتا ہے۔یہ معنی محسوس بھی ہو سکتے ہیں۔جیسے آگ، پانی، مٹی، درخت، گھر، گھوڑا، گرمی، سردی اور غیر محسوس بھی جیسے ڈر، امید، شرم، ہمت، قسمت، آس، نراس، علم، رعایت۔'' (۷۰)

ان تمام تعریفوں پر نظر ڈالنے کے بعد مولوی عبدالحق کی تعریف میں جامعیت نظر آتی ہے اور اگر ان

کی تعریف میں یہ اضافہ کر دیا جائے کہ اسم ایک ایسا کلمہ ہے جو کسی جاندار یا شے یا کیفیت کا نام ہو جو تنہا زمانے کے بغیر اپنے معنی دے، تو ایک زیادہ واضح تعریف سامنے آتی ہے۔

اردو کے بعض قواعد نویسوں نے ساخت کے لحاظ سے اسم کی تین قسمیں بیان کی ہیں جن کا بیان باقاعدہ طور پر مولوی عبدالحق کے ہاں موجود نہیں۔ یہ قسمیں اس وجہ سے ہیں کہ اردو کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اشتقاق ہوتا ہے یعنی ایک کلمہ سے دوسرا کلمہ بنا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس حوالے سے ان قسموں کو بیان کرتے ہیں:

''جس کلمہ سے دوسرے کلمے بنائے جاسکیں اس کو مصدر کہتے ہیں اور جو کلمے اس طرح بنائے جائیں وہ مشتق کہلاتے ہیں۔ چند کلمات ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ تو کسی دوسرے کلمے سے بنائے جاتے ہیں اور نہ ان سے کوئی دوسرا کلمہ بنتا ہے۔ ایسے کلمے کو جامد کہتے ہیں۔'' (۱۷)

دراصل مولوی عبدالحق نے مصدر کے بجائے مادۂ فعل کا ذکر کیا ہے جس سے افعال بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مصدر کا حوالہ دے گئے ہیں کہ مصدر کے آخر میں نا آتا ہے جس کو ہٹانے سے مادۂ فعل بنتا ہے۔ اس طرح وہ باقاعدہ مصدر کو بیان نہ کرنے کے باوجود مصدر کے اردو میں وجود کو مانتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اسم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ (۱) خاص (۲) عام

اسم خاص کی وہ تعریف لکھتے ہیں کہ کسی خاص شخص یا شے یا مقام کا نام ہے۔ پھر وہ اس حوالے سے مزید تقسیم اس طرح کرتے ہیں کہ اشخاص کے اسم خاص بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی تقسیم انہوں نے اس طرح کی ہے۔ (۱) خطاب (۲) لقب (۳) عرف (۴) تخلص اور اس کے علاوہ ممالک، دریاؤں اور پہاڑوں کے اور دیگر جغرافی اسما اور علوم وفنون وامراض وغیرہ سب اسم خاص ہوں گے۔

جب ہم مولوی عبدالحق کی اس تقسیم پر نظر ڈالتے ہیں تو ان تمام قسموں میں کسی شخص کے نام (احمد، حامد، محمود وغیرہ) کے لیے انہوں نے کوئی قسم مقرر نہیں کی۔ اس لیے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اسے اسم خاص کی کس قسم میں رکھیں گے۔ مولوی فتح محمد جالندھری نے اسم معرفہ کی چار اقسام علم، اسم ضمیر، اسم اشارہ، اسم موصول بیان کی ہیں۔ اسم علم کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے بھی مولوی عبدالحق کی طرح بات کو الجھا دیا ہے:

''بچے کا نام جو ماں باپ نے رکھا ہو یا کسی چیز کا نام جو لوگوں نے قرار دیا ہو اُسے علم کہتے ہیں۔ جیسے حامد، محمود، احمد، گنگا، جمنا، چاند، سورج۔۔۔ خطاب، لقب، کنیت، عرف، تخلص

یہ سب علم کی قسمیں ہیں۔بعض اہلِ قواعد نے نام کو علم کی علیحدہ قسم قرار دیا ہے۔مگر یہ تکلف ہے۔ (۷۲)''

اسی طرح اسم خاص کی ایک اور قسم جو دوسرے قواعد نویسوں نے لکھی ہے کنیت ہے اس کا ذکر بھی مولوی عبدالحق نے نہیں کیا جبکہ اردو میں عربی کی طرح اس کا بھی استعمال موجود ہے۔مثلاً گڈو کا ابا، منے کی ماں وغیرہ۔

فتح محمد خاں جالندھری کی طرح مولوی عبدالحق نے اسم خاص کی اقسام کے حوالے سے اسم ضمیر، اسم اشارہ اور اسم موصول کا ذکر نہیں کیا جبکہ گل کرسٹ بھی اپنی قواعد میں ان کو تفصیلاً بیان کرتے ہیں۔(۷۳) چنانچہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق نے اسم خاص (معرفہ) کی ایسی کوئی تقسیم نہیں لکھی اور یہ اچھا ہی کیا کیونکہ اسم اشارہ اور اسم موصول ایک ضمیر ہی کی قسمیں ہیں اور ضمیر اس بول کو کہتے ہیں جو اسم کی جگہ بولا جاتا ہے۔ میں، ہم، تو اور تم کسی کے نام نہیں ہیں۔ناموں کی جگہ بولے جانے والے بول ہیں۔اس لیے انہیں اسم نہیں کہا جا سکتا اور ضمیر کو اسم کی قسم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔'' (۷۴)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اسم خاص کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں جو جامع ترین اور اسم خاص کا مکمل طور پر احاطہ کرتی ہیں۔ان کے مطابق اسم خاص کی اقسام یہ ہیں: (۱) نام (۲) کنیت (۳) خطاب (۴) لقب یا عروف (۵) تخلص۔ (۷۵)

انہوں نے لقب اور رعرف کو ایک ہی جگہ اکٹھا کر دیا ہے جبکہ مولوی عبدالحق نے انہیں الگ الگ قسم کے ذیل میں رکھا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اسم عام کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔(۱) عام نام (۲) اسم کیفیت (۳) اسم جمع۔

ڈاکٹر سہیل بخاری ان میں سے پہلی دو قسموں کو تو درست قرار دیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک تیسری قسم بیکار ہے۔فوج، انجمن، قطار اور جھنڈ چاہے کتنے ہی آدمیوں کی گنتی کے لیے بولے جائیں اردو میں واحد ہی سمجھے جائیں گے۔نہیں تو پھر ان میں ''بول'' اور ''جملے'' کو ملانا پڑے گا کیونکہ بول آوازوں کا اور جملہ بولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔جوڑا دو آدمیوں یا دو چیزوں کا ہوتا ہے۔درجن بارہ کی کوڑی بیس کی اور سینکڑا سو کی ڈھیری کو کہتے ہیں اور جوڑا، درجن، کوڑی اور سینکڑا واحد ہی بولے جاتے ہیں۔اس طرح مولوی عبدالحق اگر اسم عام کو دو قسموں میں تقسیم

کرتے تو مناسب تھا۔(۷۶)

مولوی عبدالحق نے جنس، تعداد اور حالت کو لوازمِ اسم قرار دیا ہے اور ان پر الگ الگ بحث کی ہے۔ چنانچہ جنس کے حوالے سے اسما کی تذکیر و تانیث کی اردو میں دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ حقیقی اور غیر حقیقی۔ اردو کے تقریباً تمام قواعد نویس اسی تقسیم پر متفق ہیں۔ تذکیر و تانیثِ حقیقی کی مزید دو قسمیں ہیں، نر (مذکر) اور مادہ (مونث)۔ یہ تذکیر و تانیث جانداروں کے حوالے سے کی گئی ہے۔ جہاں تک بے جان چیزوں کا تعلق ہے تو ان میں نر اور مادہ نام کی کوئی شے نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود جب ہم ان کے نام بولتے ہیں تو ان کو کسی جنس کے ذیل میں لے آتے ہیں۔ یہاں پر مولوی عبدالحق نے مختلف زبانوں میں تذکیر و تانیث پر مختصراً بحث کی ہے۔ ان کے مطابق کسی زبان میں جنس کی تین قسمیں ہیں کسی میں دو اور بعض ایسی خوش قسمت ہیں کہ ان میں سرے سے یہ جھگڑا ہی نہیں ۔سنسکرت اور بعض آریائی زبانوں میں جنس کی تین قسمیں ہیں۔ مذکر، مونث اور تیسری قسم بے جان اشیا کی ہے۔ لیکن اس کے برعکس سامی زبانوں میں جنس کی دو قسمیں ہیں جس کے باعث پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جانداروں کی تذکیر و تانیث میں آسانی یہ ہے کہ ان میں قدرتی طور پر نر اور مادہ کا امتیاز موجود ہوتا ہے اس لیے ان کی تذکیر و تانیث کو تذکیر و تانیثِ حقیقی کہا جاتا ہے۔ ان زبانوں میں بے جان اشیا کی بھی تذکیر و تانیث موجود ہے چوں کہ یہ قدرت کے خلاف ہے اس لیے اس کو تذکیر و تانیثِ غیر حقیقی کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کا شمار زبانوں کی اسی قسم میں ہوتا ہے اس لیے یہاں پر تذکیر و تانیثِ حقیقی اور غیر حقیقی دونوں موجود ہیں۔

مولوی عبدالحق جانداروں کی تذکیر و تانیث کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ جانداروں کی تذکیر و تانیث میں بظاہر کسی قاعدے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ان کی تذکیر و تانیث قدرتی اور حقیقی ہے لیکن کیونکہ زبان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے اور اس میں الفاظ سے بحث کی جاتی ہے چنانچہ جانداروں کی تذکیر و تانیث کے لیے بھی قواعد مقرر کیے گئے ہیں البتہ ان میں کچھ مستثنیات ہیں جن کا مولوی عبدالحق نے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ مذکر الفاظ سے جو مونث بنائے گئے ہیں وہ بھی چونکہ سماعی ہیں اس لیے بھی قاعدوں کا تعین مزید ضروری ہو جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق تذکیر و تانیثِ حقیقی کے قاعدوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن ہندی الفاظ کے آخر میں الف ہوگا وہ مذکر ہوں گے۔ اسی طرح فارسی عربی کے وہ لفظ جن کے آخر میں الف یا ہ ہوتی ہے وہ بھی مذکر ہونگے۔ لیکن مستثنیات میں عربی کے وہ لفظ ہیں جن کے آخر میں ہ تانیث کی ہوتی ہے اسی طرح ہندی کے وہ لفظ جن

کے آخر میں یا تانیث کی ہوتی ہے اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔

جن ہندی الفاظ کے آخر میں (ی) معروف ہوتی ہے وہ مونث ہوتے ہیں۔ یا وہ الفاظ جن کے آخر میں یائے نسبتی ہوتی ہے۔ جیسے پنجابی، بنگالی، پہاڑی۔

مولوی عبدالحق نے ایسے اسما کو مذکر قرار دیا ہے جن کے آخر میں یائے نسبتی ہو۔ لیکن انہوں نے اس بات کو مدِ نظر نہیں رکھا کہ نسبت کے ساتھ جب تک صاحبِ نسبت نہ ہو اس وقت تک نسبت کوئی مقام نہیں رکھتی اسی لیے نسبت کی تذکیر و تانیث کا صاحبِ نسبت پر انحصار ہوتا ہے۔ اس حوالے سے احسان دانش وضاحت کرتے ہیں:

''جب پنجابی یا ملتانی یا فارسی سے مراد ان علاقوں کی زبان ہو تو یہ مونث ہیں۔ مثلاً پنجابی بہت مشکل زبان ہے۔ فارسی آسان ہے۔ ہندی میرے لیے مشکل تھی۔ لیکن اگر صاحب نسبت مذکر ہو تو یہ الفاظ مذکر کہلائیں گے۔ مثلاً ایک ایرانی آیا۔ پنجابی بہت بہادر نکلا۔ سلمان فارسی رسول پاکؐ کے خادم تھے۔ اکثر صحابی میدانِ جنگ سے ٹل گئے۔ اگر ان کی تانیث ظاہر کرنا ہو تو صاحبِ نسبت کو ساتھ لگانا ہوگا۔ مثلاً ملتانی مٹی زرد ہوتی ہے۔ ایرانی عورت، فرانسیسی شراب، دیسی ململ، مشہدی لنگی وغیرہ۔'' (۷۷)

تذکیر و تانیث کے حوالے سے قواعد نویسوں کے ہاں زیادہ تر اتفاق پایا جاتا ہے۔ دراصل زبان جب طویل ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے تو مختلف چیزوں کے لیے مختلف نام خود بخود وجود پا جاتے ہیں۔ اس لیے ایک بہت بڑی تعداد میں اردو اسم ایسے ہیں جن کے مذکر اور مونث کے لیے علیحدہ مخصوص نام ہیں اور یہ نام کسی قسم کے اصول وضوابط کے تحت نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان پر قواعد کے حوالے سے کسی قسم کی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح بے جان اشیا کے لیے اردو زبان میں مذکر یا مونث استعمال مخصوص ہو چکا ہے۔ پھر یہ کہ جو تذکیر و تانیث اصول وضوابط کے تحت ہوتی ہے اس میں بھی بہت زیادہ مستثنیات ہیں جو طے شدہ ہیں۔

مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں جاندار اور بے جان کی تذکیر و تانیث کے اصول وضوابط کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تذکیر و تانیث کے حوالے سے اردو زبان کی پیچیدگی ان کے اس بیان سے واضح ہوتی ہے:

''یہ عام قاعدہ ہے کہ مذکر کے آخری ی، ا، یا، ہ، کو یائے معروف سے بدل دینے سے مونث بن جاتا ہے۔ یا جہاں پیشہ وروں کے نام کے آخر میں ی (معروف) ہوتی ہے اگر اسے (ن) سے بدل دیا جائے تو وہ مونث ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں آخر میں الف یا ی نہ ہو تو وہاں

مشکل پڑتی ہے۔'' (۷۸)

چنانچہ مولوی عبدالحق اردو میں جانداروں کی تذکیر و تانیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جانداروں کی تذکیر کی دو صورتیں ہیں۔ اول مذکر اور مونث کے الگ الگ الفاظ ہیں، ایک کو دوسرے بظاہر کچھ تعلق نہیں۔ دوم آخر علامت کے بدلنے یا آخر میں کسی حرف یا حروف کے اضافے سے مونث بنایا جاتا ہے۔

مذکر اور مونث کے لیے الگ الگ اسما کی مثالیں درج کرنے کے بعد وہ مختلف علامات بدلنے یا علامات کا اضافہ کرنے سے تذکیر و تانیث کا ذکر کرتے ہیں اور مثالوں سے وضاحت کرتے ہیں۔ پہلا اصول انہوں نے یہ درج کیا ہے کہ مذکر کے آخر کا الف یا ہ مونث میں ی (معروف) سے بدل دی جاتی ہے۔ اسی طرح آخر میں یائے معروف بڑھانے سے بعض مذکر اسم مونث بن جاتے ہیں۔ اس اصول کے مطابق مولوی عبدالحق تیتر، لوہار، سنار، چمار، کی مونث تیتری، لوہاری، سناری، چماری لکھتے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' تیتری، تیتر کا مونث نہیں۔ ایک الگ پرندہ ہے۔ چماری مستعمل ہے لیکن کمتر، چمارن زیادہ عام ہے۔ لوہاری اور سناری بطور مونث شاذ ہیں۔'' (۷۹)

بعض اسما کے آخر میں (ن) کا اضافہ کردینے سے یا آخری حرف کو (ن) سے بدل دینے سے مذکر اسم مونث میں بدل جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت انہوں نے بھائی کی مونث بہن لکھی ہے جبکہ بعض قواعد نویس بھابھی لکھتے ہیں۔ آخری حرف کو حذف کرکے یا بلا حذف (نی) یا (انی) کے اضافے سے مذکر مونث میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور اصول بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات اخیر حرف میں کچھ تبدیلی کے بعد یا بغیر تبدیلی کے (یا) اضافہ کرنے سے مونث بنتا ہے۔ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے اسم کثرت کے ساتھ موجود ہیں چنانچہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ بعض غیر زبانوں کے مذکر و مونث بعینہ اُردو میں مستعمل ہیں۔ بعض اوقات مذکر اسم خاص سے بھی مونث بنا لیتے ہیں اس کی مثالیں نور، نورن، کریم کریمن وغیرہ دیتے ہیں۔ ایک اور اصول وہ یہ درج کرتے ہیں کہ بعض اوقات اسمائے خاص میں حرف واو کے مجہول و معروف ہونے سے مونث مذکر کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ واؤ معروف سے مذکر اور مجہول سے مونث ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع پر انہوں نے ایک تذکیر و تانیث کی صورت یہ بتائی ہے کہ عموماً مونث مذکر سے بنتا ہے لیکن بعض مذکر ایسے بھی ہیں جو مونث سے بنتے ہیں جیسے بھینسا، بھینس سے، رنڈوا، رانڈ سے، بلاؤ بلّی سے، سُسر یا سُسرا ساس سے۔ ان کا یہ اصول بحث طلب ہے۔ اس حوالے سے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے دلچسپ توجیہ پیش کی ہے

۔وہ لکھتے ہیں:

''بھینس کو لیجیے، گھر میں دودھ کی ضرورت ہوئی۔ایک جانور لایا گیا جس کو دیکھا کہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہا ہے۔اس کا دودھ نکالا گیا اور مزے سے استعمال ہونے لگا۔اس دودھیل جانور کی آواز بھیں بھیں کے سوا کچھ نہ تھی لہٰذا اسے بھینس کہنے لگے۔بھینس دودھ دیتی گئی۔رفتہ رفتہ دودھ کم ہوتا گیا اور بچہ بڑا ہوتا گیا۔وہ بچہ نر تھا،معلوم ہوا کہ اس کے دودھ سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیے۔خیر چونکہ مذکر کی عام شناخت الف آخر کلمہ تھا اسے بھینسا کہنے لگے۔''(۸۰)

شائد مولوی عبدالحق کے ذہن میں بھی اس قسم کی توجہات تھیں جس کی بنا پر انہوں نے درج بالا اصول بیان کیا اور مونث سے مذکر اسم بننے کی مثالیں پیش کیں۔تذکیروتانیث میں اس صورت کا ذکر کرتے ہوئے احسان دانش لکھتے ہیں:

''اسما کے اختراع کے سلسلے میں تو یہ بات اپنے مفہوم پر پوری اتر سکتی ہے لیکن تذکیرو تانیث کے معاملے میں اس کا جوڑ کچھ کھپ نہیں سکا۔اس طرح تو ہمیں کبڑی سے کبڑا،بچھڑی سے بچھڑا اور چاند سے چندوا اور بھاڑ سے بھڑوا وغیرہ تمام کو اسی قبیل میں لینا پڑے گا اور پیچیدگیاں بڑھ جائیں گی۔ہمیں بات کو وہیں تک رکھنا چاہیے کہ چونکہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے اس لیے یہاں عموماً اسما تذکیر سے تانیث بنتے ہیں اور اگر جی چاہے تو مستثنیات کا خانہ بھی رہنے دیجیے تاکہ وقتِ ضرورت کام دے۔''(۸۱)

مولوی عبدالحق مزید لکھتے ہیں کہ جانداروں میں بعض اسما ایسے ہیں جو یا تو صرف مذکر استعمال ہوتے ہیں یا مونث مذکر کا مونث اور مونث کا مذکر نہیں بولا جاتا۔اس سلسلہ میں مذکر اور مونث کی ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں میں سے مولوی عبدالحق نے مثالیں دی ہیں۔مذکر کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے بلبل کی مثال دی ہے۔مولوی فتح محمد خاں جالندھری لکھتے ہیں کہ بلبل کی تذکیروتانیث میں اختلاف ہے اکثر اس کو مونث بولتے ہیں اور بعضے مذکر۔(۸۲)

اسی طرح مولوی عبدالحق نے ایک اور بات جانداروں کی تذکیروتانیث کے حوالے سے یہ بیان کی ہے کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں میں اکثر صرف ایک ہی جنس مستعمل ہے۔پھر جانوروں میں اکثر اوقات ان کے نام

کے ساتھ نر اور مادہ کے الفاظ لگا کر مذکر و مونث بنائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات مذکر لفظ مونث کے لیے استعمال کر جاتے ہیں مثلاً بیٹی کو پیار سے بیٹا کہا جائے۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ بعض لفظ مشترک ہیں مذکر اور مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں مثلاً بچے کا لفظ یا گھوڑی کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ کیا اچھا جانور ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق اسے قواعد میں تغلیب کہتے ہیں:

''اردو میں مشترک یا عام جنس (Common Gender) نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مذکر کا اطلاق مونث پر کیا جائے یا مذکر سے مونث مراد لی جائے اور بچی کو بچہ سے اور گھوڑی کو جانور سے تعبیر کر کے کہا جائے: یہ میرا بچہ ہے، کیسا اچھا جانور ہے۔ اس صورت میں بھی 'بچہ' اور 'جانور' مذکر ہی رہیں گے۔ یہ مجازی استعمال ہے جسے قواعد میں تغلیب (مذکر کو مونث پر غلبہ کرنا) کہتے ہیں۔'' (۸۳)

بے جان اسما کی تذکیر و تانیث کو مولوی عبدالحق نے قیاسی قرار دیا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو ارثاً و روایتاً ملتی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''بے جان اسما کی تذکر و تانیث قیاسی ہوتی ہے۔ یعنے الفاظ کی تذکیر و تانیث ایک دور سے دوسرے دور کو یا ایک نسل سے دوسری نسل کو ارثاً و روایتاً پہنچتی ہے اور جس طرح پہنچتی ہے ویسے ہی بولی جاتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خاص وجوہ سے بعض الفاظ میں تذکیر و تانیث کا اختلاف ہو گیا ہے جو پہلے مذکر تھے اب مونث ہیں اور جو مونث تھے اب مذکر بولے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ نسلاً بعد نسلٍ جس طرح یہ الفاظ پہنچتے ہیں ویسے ہی بولے جاتے ہیں۔'' (۸۴)

لیکن دیگر قواعد نویسوں نے بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کو قیاسی اور سماعی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری قیاسی اور سماعی تذکیر و تانیث کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''جنس غیر حقیقی کی قیاسی اور سماعی دو قسمیں ہیں جو اسما لاحقہ تذکیر و تانیث کی بنا پر مذکر یا مونث قرار دیے گئے ان کی جنس قیاسی اور جو جنس علامت کے بغیر مذکر یا مونث بولے جاتے ہیں ان کی جنس سماعی ہوگی۔'' (۸۵)

تذکیر و تانیثِ غیر حقیقی میں اِن اسما کو مولوی عبدالحق نے مذکر قرار دیا ہے۔ ہندی اور مخلوط سنسکرت

کے وہ الفاظ جن کے آخر میں ا یا ہ ہوتی ہے یا فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں ہ الف کی آواز دیتی ہے لیکن یہاں پر انہوں نے مستثنیات کی بھی فہرست دی ہے جن پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا۔ ان مستثنیات میں تمام ہندی اسمائے تصغیر جن کے آخر میں یا ہوتا ہے۔ تمام عربی کے سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں ا ہوتا ہے۔ عربی کے بعض اسما جو فُعلیٰ کے وزن پر ہوتے ہیں۔ بعض ہندی لفظ جو خالص سنسکرت کے ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق کا یہ بیان درست نہیں کہ عربی کے تمام سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں ا ہوتا ہے، مونث ہوتے ہیں۔ سہا، عنا، غنا، زنا، ابا، درا، ابا، عصا، طلا، عطا یہ سب الفاظ مذکر ہیں۔

اس کے علاوہ مولوی عبدالحق نے ان اسما کو مذکر قرار دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ مستثنیات کا بھی ذکر کرتے جاتے ہیں۔ دنوں اور مہینوں کے نام سوائے جمعرات کے۔ دھاتوں اور جواہرات کے نام سوائے چاندی کے۔ پہاڑوں کے نام۔ ستاروں اور سیاروں کے نام۔ برتاؤ اور بچاؤ کے وزن پر جو حاصل مصدر آتے ہیں یا اس وزن پر آنے والے اسمائے کیفیت اور دیگر الفاظ۔ وہ اسمائے کیفیت جو اسم یا صفت کے آخر میں ''پن'' لگانے سے بنتے ہیں۔ ہندی مصدر مذکر استعمال ہوتے ہیں۔ عربی الفاظ جو اِفعال، اِفتعال، اِنفعال، اِستفعال، تفعُّل، تفاعُل، تفعلہ اور مفاعلہ کے اوزان پر آتے ہیں۔ عربی فارسی کے وہ الفاظ جن کے آخر میں ہ اضافی (مختفی) ہوتی ہے اکثر مذکر ہوتے ہیں۔ جن الفاظ کے آخر میں بند، آب، بان، دان، ستان، سار، زار ہوتا ہے مذکر استعمال ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ستاروں کے تمام ناموں کی بجائے اکثر ناموں کو مذکر قرار دیا ہے اور زہرہ، ناہید، برجیس اور مشتری کو مونث کہا ہے۔ (۸۶)

مونث اسما کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن ہندی یا غیر ہندی الفاظ کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے مونث کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مستثنیات میں جی، گھی، موتی، پانی، دہی، شامل ہیں۔ مزید مونث اسما میں زبانوں کے نام، ایسے اسما جو آواز کی نقل ہیں، نمازوں کے نام، ہندی حاصل مصدر اور اکثر اسمائے کیفیت جو اُسی وزن پر ہوں۔ عربی کے وہ اسمائے کیفیت جن کے آخر میں ت ہوتی ہے۔ مفاعلت، تفعیل مِفعال کے وزن پر آنے والے الفاظ، تمام فارسی حاصل مصدر جن کے آخر میں ش ہے مونث ہوتے ہیں۔ جن الفاظ کے آخر میں ''گاہ'' لگا ہوتا ہے وہ بھی مونث ہیں۔ حروفِ تہجی میں ب بھ پ پھ ت ٹ ٹھ ج جھ چ چھ ح خ د ذ ڑ ر ز ژ ط ظ ف ہ وی مونث ہیں۔ جیم اور میم مختلف فیہ ہیں۔ لیکن ڈاکٹر شوکت سبزواری ڈال کو بھی مونث لکھتے ہیں اور واؤ کو وہ مولوی عبدالحق کے برعکس مذکر قرار دیتے ہیں۔ (۸۷) اسی طرح مولوی فتح محمد خاں جالندھری ج، جھ اور و کو مذکر کی فہرست میں شمار کرتے ہیں

البتہ حاشیے میں انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بعض واؤ کو مونث بولتے ہیں۔(۸۸)

مرکب الفاظ کی تذکیرو تانیث کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جو دو لفظ افعال یا ایک اسم اور ایک فعل سے مل کر بنتے ہیں وہ اکثر مونث ہوتے ہیں البتہ اس حوالے سے بھی یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک مونث اور دوسرا مذکر ہے (مع حرف عطف یا بلا حرف عطف) تو فعل کی تذکیرو تانیث آخری لفظ کے لحاظ سے ہوگی۔ جب دو جز مذکر ہوں تو مذکر اور دونوں مونث ہوں تو لفظ مونث ہوگا۔ شیر برنج اور نیشکر کو مستثنیات میں شمار کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شیر برنج کے دونوں جز مذکر ہیں لیکن پھر بھی مونث ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فرنی اور کھیر دونوں مونث ہیں لہٰذا شیر برنج بھی ان کا مترادف ہونے کی وجہ سے مونث استعمال ہوتا ہے۔ نیشکر جس کے دونوں جز مونث ہیں مذکر آتا ہے، اس لیے کہ گنے کا مترادف ہے۔ چوں کہ گنا مذکر مستعمل ہے اس لیے نیشکر بھی مذکر بولا جانے لگا۔ یہاں پر ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے ساز باز کو قواعدِ اردو میں مذکر لکھا ہے۔(۸۹)

یہ بات درست نہیں۔ مولوی عبدالحق ساز باز کو مونث ہی شمار کرتے ہیں۔(۹۰)

مولوی عبدالحق نے ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے جو بعض معنوں میں مذکر اور بعض معنوں میں مونث ہوتے ہیں۔ اس میں دوپہر، گزر، تکرار، آب، مد، ترک، عرض، کف، تاک، آہنگ، تال، نال، بیل، مثل، لگن، مغرب کو درج کیا ہے۔

عربی الفاظ کی جمع کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ عربی الفاظ کی جمع جب عربی قواعد کے مطابق بنائی جاتی ہے تو اس کی تذکیرو تانیث میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو حالت واحد کی ہے وہی جمع کی ہوگی۔ البتہ چند الفاظ مستثنیات میں ہیں۔ معرفت، حقیقت، قوت، شفقت مونث ہیں مگر ان کی جمع معارف، حقائق، قویٰ اور اشفاق مذکر مستعمل ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ بعض متاخرینِ اہلِ لکھنو کا یہ قول ہے کہ ہر لفظ کی عربی جمع مذکر ہی آتی ہے۔ لیکن ان کی اس بات کو اصول نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ اہلِ دہلی اور بعض اور مقامات کے لوگ بجز بعض مستثنات کے ہمیشہ مونث کی جمع مونث اور مذکر کی جمع مذکر ہی استعمال کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ ہر عربی لفظ کی عربی جمع مذکر بولنی چاہیے اُنہیں یہ دھوکا اس وجہ سے ہوا ہے کہ بعض الفاظ جو مونث ہیں ان کی جمع بھی اسی وزن پر آتی ہے جو واحد میں مذکر ہیں مثلاً حادثہ مذکر ہے اس کی جمع حوادث ہے لہذا یہ بھی مذکر ہے اور مذکر بولا جاتا ہے۔ چونکہ حقائق بھی اسی وزن پر ہے دھوکے میں اُسے بھی مذکر بولنے لگے۔ لیکن چند الفاظ مستثنیات میں سے ہیں،

اس پر سے یہ قیاس قائم کر لینا کہ ہر عربی لفظ کی (خواہ مونث ہو یا مذکر) جمع مذکر ہی ہو گی صحیح نہیں ہے۔ واحد میں جب ہم ایک لفظ کو جو مونث غیر حقیقی ہے مونث تسلیم کرتے ہیں تو افعال اور صفات بھی اس کے لیے مثل مونث حقیقی کے استعمال کرتے ہیں اور کوئی فرق اس میں نہیں کرتے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ مونث حقیقی کی عربی جمع کو مونث بولیں اور مونث غیر حقیقی کی جمع کو مذکر۔ جب ایک بار بے جان شے مونث قرار پا چکی تو پھر اس میں اور حقیقی مونث میں کسی قسم کا فرق اور امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس لیے مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ حتی الامکان اس قسم کے الفاظ کی اردو جمع استعمال کرنا زیادہ فصیح ہے۔ پنڈت دتا تریہ کیفی نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''میں کہتا ہوں کہ عربی یا کسی غیر زبان کا کوئی لغت ایسا نہیں جس کی جمع اردو کے قاعدے سے نہ بن سکے۔ اردو کے قاعدے کی پابندی فصاحت کیا صحت کی اول شرط ہے۔ اس میں کسی مستثنیٰ کی گنجائش نہیں۔ قاعدے کا جب سوال آ جائے تو سب غیر زبانیں ہمارے نزدیک برابر ہیں، عربی ہو یا سنسکرت، فارسی ہو یا انگریزی۔ انگریزی کو لیجئے جس کے بہت سے لفظ اُردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ بتایئے آپ ان جملوں میں کس کو پسند کریں گے اور صحیح بتائیں گے:۔

(۱)۔ یہ کمرہ فیٹ میں کتنا لمبا ہے۔

(۲)۔ یہ کمرہ فٹوں میں کتنا لمبا ہے۔

اور

(۱)۔ ٹگور کے انتقال کی خبر سُن کر سارے سکولز میں چھٹی ہو گئی۔

(۲)۔ ٹگور کے انتقال کی خبر سُن کر سارے سکولوں میں چھٹی ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ دونوں جگہوں میں (۲) ہی صحیح اور فصیح ہے اور (۱) غلط ہے۔'' (۹۱)

اس مسئلے پر احسان دانش نے بھی تفصیلی بحث کی ہے اور وہ بھی اس بات کو نہیں مانتے کہ مونث کی جمع مذکر بولی جائے۔ ان کے نزدیک عجیب بات ہے کہ جب ایک تانیث ہو تو مونث اور دس ہوں تو مذکر۔ یہ بات ہر ذی شعور کی سمجھ سے باہر ہے کہ جب ایک عورت ہو تو خود کو عورت کہے یا لوگوں کو عورت دکھائی دے اور تین ہو جانے پر وہ خود کو مرد محسوس کرنے لگیں یا لوگوں کو مرد دکھائی دینے لگیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''میں قاعدے میں ہرگز مونث کو مذکر اور مذکر کو مونث کہنے کے لیے تیار نہیں بلکہ میں تو ان کی جمعوں ہی کو بے قاعدہ کہتا ہوں۔ اس قسم کے نام اور القاب تو علم کی صف میں شامل ہیں۔

اُردو زبان اور ہمارے معاشرے کے مطابق سیدھی سادی سی بات ہے کہ جو واحد میں مونث ہے، وہ جمع میں بھی مونث ہی ہونا چاہیے۔اسی طرح واحد مذکر کو جمع کی صورت میں تبدیلی جنس پر مجبور کر دینا کہاں کی دانائی ہے۔حدود، قیود، رسوم وغیرہ کو مونث ہی کہنا مناسب ہے۔'' (۹۲)

ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی یہی لکھتے ہیں کہ جو عربی الفاظ اردو میں مونث ہیں عربی قاعدے سے ان کی جمع مونث ہوگی اور جو مذکر ہیں ان کی جمع مذکر ہوگی۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''وہ الفاظ اس حکم سے مستثنٰی ہیں جو علامت تانیث ''ت'' کی وجہ سے مونث تھے اور جب ان کی جمع بنی تو علامتِ تانیث باقی نہ رہی۔معرفت، حقیقت، قوت کی جمع معارف، حقائق، قویٰ اردو میں مذکر ہیں۔اس لیے نہیں کہ عربی ہیں اور عربی جمعیں مذکر ہوتی ہیں بلکہ اس لیے مذکر ہیں کہ ان کا انداز تذکیر کا ہے اور ان میں تانیث کی وہ علامت اب نہیں رہی جو واحد میں تھی۔'' (۹۳)

ایک اور مسئلہ جس پر مولوی عبدالحق نے بحث کی ہے وہ یہ کہ جو نئے لفظ غیر زبانوں کے اردو میں داخل ہو گئے ہیں یا آئندہ ہوں گے ان کی تذکیر و تانیث کیسے ہوگی۔ان کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کی تذکیر و تانیث پہلے سے موجود ان کے ہم معنی الفاظ پر قیاس کر کے کرنی چاہیے۔مثلاً ریل کو مونث کہیں گے کیونکہ گاڑی مونث ہے۔اسی طرح جن الفاظ کے آخر میں الف کی آواز ہے اس کو عام قاعدے کے مطابق مذکر اور جن کے آخر میں ی معروف ہے ان کو مونث استعمال کریں گے۔تذکیر و تانیث کی بحث کے آخر میں انہوں نے ان الفاظ کا ذکر کیا ہے جن کو اہلِ زبان بعض اوقات مذکر اور بعض اوقات مونث بولتے ہیں۔دراصل اس اختلاف کی بڑی وجہ زمانے کا اختلاف ہے پہلے ایک لفظ مونث بولا جاتا تھا تو آج مذکر یا پہلے ایک لفظ مذکر بولا جاتا تھا تو آج مونث۔اس اختلاف کی ایک وجہ ڈاکٹر شوکت سبزواری لفظ کی ظاہری بناوٹ سے فریب کھانا قرار دیتے ہیں:

''لفظ کی ظاہری بناوٹ اور شکل و شباہت سے فریب کھا کر بھی اہلِ زبان نے لفظ کی جنس میں اختلاف کیا ہے اور ایک ہی لفظ کو بعضوں نے مذکر اور بعضوں نے مونث لکھا ہے۔اردو میں ''ا'' تذکیر کی نشانی ہے اور سنسکرت میں تانیث کی۔اہلِ لکھنو 'پوجا'' اور ''مالا'' وغیرہ سنسکرتی الفاظ کو اردو سمجھ کر مذکر بولتے ہیں جب کہ یہ الفاظ مونث ہیں اور ان کا ''الف'' تانیث کا ہے۔ اس کے برعکس رائتا لکھنو میں مونث تھا لیکن دہلی اور اس کے نواح میں مذکر ہے شاید اس لیے کہ

اس کے آخر میں الف ہے۔'' (۹۴)

''تعداد و حالت'' کے عنوان سے مولوی عبدالحق نے واحد اور جمع کی بحث کی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اسما کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک صورت یہ کہ جب اسم بغیر کسی حرف ربط کے آئے۔ دوسری صورت وہ ہے جب اسم کے بعد کوئی حرف ربط ہو۔ چنانچہ اردو میں واحد اور جمع کے سلسلہ میں وہ بنیادی اصول کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''اردو میں سوائے اُن الفاظ کے جن کے آخر میں الف (یا اس کا کوئی ہم آواز حرف ہ یا ع) ہوتا ہے، مذکر کی صورت واحد اور جمع میں یکساں رہتی ہے۔ البتہ حروف ربط کے آ جانے سے جمع کی صورت میں تبدیلی ہو جاتی ہے ورنہ ان صورتوں کے علاوہ خاص جمع کی غرض سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ مونث ہی ہوتی ہیں۔'' (۹۵)

واحد سے جمع بننے کی صورت میں اسم میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ جن واحد مذکر الفاظ کے آخر میں ا یا ہ ہے، جمع میں یہ ا یا ہ یائے مجہول سے بدل جاتی ہے۔ البتہ بعض واحد مذکر لفظ جن کے آخر میں الف ہوتا ہے جمع میں ے سے نہیں بدلتے ان میں کچھ خالص سنسکرت کے لفظ، رشتہ داروں کے نام، فارسی کے اسم فاعل، غیر زبانوں کے بعض اسم شامل ہیں۔ جن واحد مذکر الفاظ کے آخر میں ا یا ہ نہیں ہوتی اُن کی واحد اور جمع میں ایک ہی صورت رہتی ہے۔ اسی طرح جن واحد مذکر لفظوں کے آخر میں (اں) ہوتا ہے، ان کی جمع میں واحد کا الف، ے سے بدل جاتا ہے۔

مونث کی جمع کا طریقہ کار مذکر سے مختلف ہے۔ جن مونث واحد الفاظ کے آخر میں ی ہوتی ہے ان کے آخر میں اں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جن مونث واحد کے آخر میں الف ہوتا ہے ان کے بعد ئیں کا اضافہ کر دیتے ہیں ۔جن مونث واحد الفاظ کے آخر میں یا ہوتا ہے ان کی جمع میں ں کا اضافہ کر دیتے ہیں البتہ غیر زبانوں کے الفاظ کے آخر میں ئیں کا اضافہ کرنے سے جمع بناتے ہیں۔ جن مونث واحد الفاظ کے آخر میں ان میں سے کوئی حرف نہیں ہوتا جن کا اوپر کے تین قاعدوں میں ذکر ہوا ہے ان کی جمع میں یں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے حرف ربط کے آنے سے جو واحد اسموں میں تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن واحد اسموں کے آخر میں ا یا ہ ہوتی ہے وہ ان حروف کے آ جانے سے یائے مجہول سے بدل جاتے ہیں۔ البتہ اس قاعدے سے یہ لفظ مستثنیٰ ہیں۔ وہ ہندی لفظ جو خالص سنسکرت ہیں یا جن میں اصل سے بہت کم

تبدیلی آئی ہے۔ وہ اسم جو عزیزوں اور رشتہ داروں کے معنوں میں آتے ہیں۔عربی سہ حرفی لفظ۔ایسے عربی لفظ جو سہ حرفی سے زیادہ ہیں اور جن کے آخر میں الف ہے۔اسمائے خاص یعنی لقب اور عہدوں کے نام۔جغرافیائی نام جن کے آخر میں الف یا ہ ہوتی ہے تبدیلی ہو جاتی ہے۔البتہ خالص سنسکرت کے الفاظ اس سے مستثنٰی ہیں۔جہاں لفظ کے آخر میں الف یا ہ نہیں ہوتی وہاں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ایسے عربی الفاظ جن کے آخر میں ع ہوتا ہے جب ان کے بعد حرف ربط آتا ہے تو ع کے بعد (ے) بڑھا دیتے ہیں۔جمع اسموں کی صورت میں جب حرف ربط آجائے تو ان میں یہ تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔مذکر اسما میں جمع کے لیے آخر میں وں بڑھا دیتے ہیں۔جمع مونث کا (الف ں) یا (ی ں) بھی (وں) سے بدل جاتا ہے۔جن الفاظ کے آخر میں واو ہوتی ہے خواہ وہ مذکر ہوں یا مونث، حرف ربط کے آنے سے ان کی جمع دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتی ہے اور آخر میں (وں) بڑھا دیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے حصہ صرف میں جمع کی بلحاظِ معنی بھی چند حالتوں کا ذکر کیا ہے جو در حقیقت ان کی رائے میں حصہ نحو میں آنی چاہیں۔ چنانچہ یہاں پر ان کا سرسری بیان کیا گیا ہے۔ان میں اسم کی فاعلی حالت، مفعولی حالت، ندائی حالت، خبری حالت، اضافی حالت اور طوری حالت شامل ہیں جن میں حرف ربط کے باعث تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق نے اسما کی تصغیر و تکبیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تصغیر کے معنی چھوٹا کرنے کے ہیں۔بعض اوقات الفاظ میں کسی قدر تغیر کر کے یا بعض حروف کے اضافے سے اسما کی تصغیر بنا لیتے ہیں۔ جبکہ تکبیر اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں بڑا کرنا یا بڑھانا۔بعض اسموں کو عظمت کے لیے کسی قدر تغیر سے بڑا یا بھاری بھرکم کر کے دکھاتے ہیں۔

اسموں کی تصغیر کبھی محبت کے اظہار کے لیے بنائی جاتی ہے کبھی حقارت کے لیے اور کبھی کسی چیز کی چھوٹائی بیان کرنے کے لیے جبکہ تکبیر کسی چیز کی بڑائی کے اظہار کے لیے بنائی جاتی ہے۔مولوی عبدالحق نے اسموں کی تصغیر بنانے کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ ا، وا، ڑا، ڑی، لی، لا، یا وغیرہ کی علامات اسموں کے آخر میں بڑھانے سے ان کی تصغیر بنائی جاتی ہے۔اگرچہ انہوں نے اس کی مثالیں بھی درج کی ہیں لیکن باقاعدہ طور پر اصول بیان نہیں کیے گئے کہ کہاں پر کیا علامت بڑھانی چاہیے۔فارسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہاں پر چ ک وغیرہ کی علامات تصغیر کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔اسی طرح اسما کی تکبیر کے لیے بھی انہوں نے باقاعدہ قواعد بیان نہیں کیے۔اسی طرح فارسی کے بہت سے اسمائے مکبر اردو میں استعمال ہوتے ہیں جو شہ، خر کے سابقے لگانے سے بنتے ہیں ان کا ذکر بھی مولوی

عبدالحق نے نہیں کیا۔اس حوالے سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں :

''اردو میں فارسی کے اسم مکبر بھی مستعمل ہیں ، ان میں عام طور پر شہ بطور سابقہ ہوتا ہے۔مثلاً پر شہپر،سوار شہسوار،توت شہتوت ،راہ شاہراہ، کار،شاہکار، پارہ، شہ پارہ ، باز شہباز اس کے علاوہ خر بھی بطور سابقہ فارسی کے اسمائے مکبر میں آتا ہے۔مثلاً خرمہرہ، خراس خرچنگ، خرمگس وغیرہ۔لیکن ایسے الفاظ اردو میں نادرالاستعمال ہیں۔'' (۹۶)

اسم مصغر اور اسم مکبر کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری نے دلچسپ بحث کی ہے۔وہ سرے سے اسما کی تصغیر وتکبیر سے انکاری ہیں۔اس حوالے سے لکھتے ہیں :

''اردو بولی میں اسم مصغر اور مکبر جیسی اسم کی کوئی قسم نہیں ملتی پر مولوی فتح محمد خان اور مولوی عبدالحق ہیں کہ عربی کی یہ قسمیں بھی اردو میں ڈھونڈ رہے ہیں ۔ یہ لوگ اردو کے اشتقاق پر دھیان نہیں دیتے کہ :

(۱) اس کے بہت سے بولوں کے آخر میں ''آ'' اور ''ای'' مذکر اور مونث کے (لاحقے) ہیں جیسے بالا بالی ، بیٹا بیٹی ،لڑکا لڑکی ،ٹوکرا ٹوکری ،شیشا شیشی۔

(۲) کچھ بولوں کے آخر میں ''آ'' کا لاحقہ فالتو جوڑ دیا جاتا ہے۔لیکن اس میں چھٹائی ، بڑائی کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ جیسے بھائی سے بھیا (بھائی آ) مائی سے میا (مائی آ) کوئی سے کیا (کوئی آ) ، جورو سے جروا (جوروآ) لاہوری سے لاہوریا (لاہوری آ) اور قنوجی سے قنوجیا (قنوجی آ)۔

(۳) کچھ بولوں کے آخر میں دوسرے لاحقے بھی بڑھا دیے جاتے ہیں جیسے ری سے (مونث کے لیے) پلنگڑی ،ٹنگڑی ، انکھڑی ،پنکھڑی اور پگڑی ، ڑا سے (مذکر کے لیے) مکھڑا اور دکھڑا۔ پر ان فالتو لاحقوں سے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا جس طرح جوتا جوتی سے اور بیٹا بیٹی سے ڈیل میں بڑا نہیں ہوتا یا جس طرح بھائی سے بھیا اور جورو سے جروا، لاہوری سے لاہوریا چھوٹا بڑا نہیں ہوتا اسی طرح مکھ اور مکھڑا، دکھ اور دکھڑا، آنکھ اور انکھڑی، پلنگ اور پلنگڑی، ٹانگ اور ٹنگڑی کے بول بھی برابر ہوتے ہیں۔ان بولوں کو مکبر اور مصغر کہنے سے پہلے ان لوگوں کو ان کے لاحقوں پر بھی دھیان دے لینا ضروری تھا۔'' (۹۷)

مستقل الفاظ کی دوسری قسم بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے صفت کا عنوان قائم کیا ہے۔
چنانچہ صفت کی تعریف انہوں نے اس طرح کی ہے:

''الفاظِ صفت وہ ہیں جو کسی اسم کی حالت یا کیفیت یا کمیت ظاہر کریں۔صفت ہمیشہ اسم کی حالت کو محدود کردیتی ہے۔'' (۹۸)

انہوں نے صفت کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں: (۱) صفتِ ذاتی (۲) صفتِ نسبتی
(۳) صفتِ عددی (۴) صفتِ مقداری (۵) صفتِ ضمیری

صفتِ ذاتی وہ ہے جس سے کسی چیز کی اندرونی حالت یا خصوصیت ظاہر ہو جیسے ہلکا۔بعض اوقات یہ صفات دوسرے اسما یا افعال سے بھی بنائی جاتی ہیں جیسے لڑنے سے لڑاک۔ یہ صفت اکثر اوقات دو الفاظ سے مرکب ہوتی ہے جیسے ہنس مکھ۔بعض فارسی علامتیں عربی، ہندی الفاظ کے ساتھ آکر صفت کا کام دیتی ہیں جیسے سعادت مند۔ فارسی،عربی ذاتی صفات بھی اُردو میں کثرت سے مستعمل ہیں جیسے دانا،احمق۔ سے کا حرف مقابلے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے شہد سے میٹھا۔بعض اوقات صفات میں زیادتی، زور یا مبالغہ پیدا کرنے کے لیے بہت، بڑا، زیادہ، نہایت ،کہیں، سے کے الفاظ بڑھا دیے جاتے ہیں۔مولوی عبدالحق نے ایسے چند الفاظ یا علامتوں کی مثالیں دی ہیں جن کے لگانے سے صفات میں نفی کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ علامات ا،اَن،نر،بے،ک،بن،ن ہیں۔

صفاتِ نسبتی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں کسی دوسری شے سے لگاؤ یا نسبت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً اسما کے آخر میں یائے معروف بڑھانے سے ظاہر کی جاتی ہے جیسے آبی۔ جب کسی اسم کے آخر میں (ی) یا (ہ) یا (ا) ہوتا ہے تو اُسے واؤ سے بدل کر (ی) کا اضافہ کردیتے ہیں جیسے دہلی سے دہلوی۔بعض اوقات (ہ) کو حذف کردیتے ہیں۔بعض اوقات (انہ) بڑھا دینے سے نسبت ظاہر کرتے ہیں جیسے جاہلانہ۔اسی طرح چند علامات ایسی ہیں جن کے اضافے سے صفت نسبتی بنائی جاتی ہے۔ان میں وال،ار،لا یا الا، والا،کا،سا شامل ہیں۔چنانچہ ان علامات کے استعمال سے بننے والی صفاتِ نسبتی کی مثالیں انہوں نے درج کی ہیں۔ یہاں پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مولوی عبدالحق سے اختلاف کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق صاحب نے سا کے ساتھ چاند سا کو بھی صفت نسبتی میں شمار کیا ہے۔ ہمارے خیال میں سا ایک مستقل حرفِ تشبیہ الگ ہے اور کسی بھی اسم کے ساتھ وجہ شبہ کی بناء پر

استعمال ہوسکتا ہے۔'' (۹۹)

صفتِ عددی وہ جس سے کسی اسم کی تعداد معلوم ہو۔ تعداد کی انہوں نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔ تعدادِ معین اور تعدادِ غیر معین۔ تعدادِ معین وہ ہے جس سے کسی شے کی ٹھیک تعداد معلوم ہو جبکہ تعداد غیر معین میں کسی شے کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہوتی۔ تعدادِ غیر معین کے لیے کئی، چند، بعض، سب، کل، بہت، بہت سے، تھوڑا، تھوڑے، کم، کچھ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ تعدادِ معین کی تین قسمیں ہیں تعدادِ معمولی، تعدادِ ترتیبی اور تعدادِ اضعافی۔ تعدادِ معمولی میں تمام اعداد آجاتے ہیں۔ تعدادِ ترتیبی کسی شے کی ترتیب کو ظاہر کرتی ہے جیسے ساتواں، پانچواں وغیرہ۔ تعدادِ اضعافی میں کسی عدد کا ایک یا ایک سے زائد بار دہرانا پایا جاتا ہے۔ جیسے دگنا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اعداد کے دو حصے کیے ہیں۔ اصلی اور ترتیبی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اعداد کے دو حصے کیے جاسکتے ہیں۔ اصلی: یہ معدود کی شمار یا تعداد بتاتے ہیں۔ اور ترتیبی معدود کے درجے یا مقام کی تعیین کرتے ہیں۔ ایک، دو، تین وغیرہ اصلی اعداد ہیں۔ پہلا، دوسرا، تیسرا وغیرہ ترتیبی۔ اصلی اعداد بنیادی کلمے ہیں۔ ترتیبی ان سے ڈھال لیے گئے ہیں۔'' (۱۰۰)

صفتِ عددی کے تحت مولوی عبدالحق نے مکمل تفصیل درج کی ہے کہ اردو ہند سے کس طرح بنے۔ انہوں نے اردو ہندسوں کو سنسکرت اور پراکرت زبانوں کے اعداد کی ارتقائی شکل قرار دیا۔ چنانچہ وضاحت کے لیے پراکرت اور سنسکرت کے اصل ہندسوں کا اندراج کر کے اردو ہندسوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح کسری اعداد کی بھی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے صفتِ عددی کے حوالے سے مولوی عبدالحق سے اختلاف یہ کیا ہے کہ اسم عدد معین کو صفتِ عددی میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔ اسمِ عدد اور صفتِ عددی میں فرق یہ ہے کہ اسم عدد میں مطلق تعداد ہوتی ہے۔ مثلاً دو، تین، چار وغیرہ اور صفت عددی میں کسی شے کا شمار درجے یا رتبے میں ہوتا ہے۔ یعنی صفتِ عددی میں ترتیب کا لحاظ ہوتا ہے۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا صفاتِ عددی ہیں کہ ان سے ترتیب درجے یا رتبہ کی معلوم ہوتی ہے۔ (۱۰۱)

صفتِ مقداری کے بیان میں وہ لکھتے ہیں کہ اعداد کا کسی مقدار یعنی وزن یا ناپ کے لیے استعمال کیا جانا صفتِ مقداری ہے۔ اسی طرح اتنا، جتنا، کتنا، کے، یہ اور وہ بھی کبھی کبھی مقداری صفت کے معنوں میں استعمال

ہوتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے صفتِ مقداری کو الگ سے بیان کرنے سے اختلاف کیا ہے:

''بعض قواعد نویسوں نے اسم مقدار کو الگ بیان کیا ہے اور اسے صفتِ مقداری کا نام دیا ہے، لیکن اعداد جس طرح گنتی کے بطور صفت استعمال ہوتے ہیں۔اسی طرح وہ مقدار یعنی وزن اور ناپ کے لیے آتے ہیں، اس لیے ان کو الگ کرنا چنداں ضروری نہیں۔'' (۱۰۲)

پنڈت دتاتریہ کیفی صفتِ عددی اور صفتِ مقداری کے درمیان فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''پہلا، دوسرا، ہزارواں، بیاسی واں وغیرہ صفتِ عددی کہلاتے ہیں۔صفتِ مقداری وہ ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ایک چیز دوسری چیز سے مقدار یا گنتی میں کتنی زیادہ ہے۔یہ ہیں دُگنا، تِگنا، چوگنا، سَوگنا، ہزار گنا وغیرہ۔'' (۱۰۳)

صفتِ ضمیری کے تحت انہوں نے ان ضمیروں کا ذکر کیا ہے جو صفت کا کام دیتی ہیں۔وہ ضمیریں وہ، یہ، کون، جو اور کیا ہیں۔یہ الفاظ جب تنہا آتے ہیں تو ضمیر ہیں اور جب کسی اسم کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو صفات ہیں۔

مولوی عبدالحق نے مستقل الفاظ کی تیسری قسم ضمیر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ الفاظ جو بجائے اسم کے استعمال کیے جاتے ہیں ضمیر کہلاتے ہیں۔جیسے وہ نہیں آیا۔ میں آج نہیں جاؤں گا۔اس میں (وہ) اور (میں) ضمیریں ہیں۔ضمیر سے فائدہ یہ ہے کہ بار بار انہیں اسماء کو جو گزر چکے ہیں دہرانا نہیں پڑتا اور زبان میں الفاظ کے دہرانے سے جو بدنمائی پیدا ہو جاتی ہے وہ نہیں ہونے پاتی۔'' (۱۰۴)

مولوی عبدالحق نے ضمیر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) شخصی (۲) موصولہ (۳) استفہامیہ (۴) اشارہ (۵) تنکیر

ضمیر شخصی اشخاص کے لیے استعمال ہوتی ہے۔اس کی تین صورتیں ہیں متکلم، مخاطب اور غائب۔ان تینوں صورتوں کو مولوی عبدالحق نے مثالوں سے واضح کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ضمائر غائب میں واحد اور جمع دونوں کے لیے (وہ) آتا ہے اور اس میں اشخاص اور اشیا کا امتیاز نہیں ہوتا۔ تو بے تکلفی اور محبت کے لیے آتا ہے اسی طرح واحد مخاطب کے لیے تم بھی استعمال کرتے ہیں لیکن یہ بھی بے تکلفی کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے ورنہ واحد مخاطب اور جمع مخاطب دونوں کے لیے آپ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ہم ضمیر متکلم

جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ اسے بجائے واحد متکلم کے استعمال کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد اپنی بڑائی بیان کرنا ہوتا ہے۔ یہاں پر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ بعض اوقات یاراور یاروں کا لفظ واحد متکلم اور جمع متکلم دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔عموماً بے تکلفی کے موقع پر اس کا استعمال ہوتا ہے لیکن یہ استعمال کسی قدر عامیانہ سمجھا جاتا ہے۔جبکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''بعض قواعد نویسوں نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی واحد اور جمع متکلم میں بجائے میں اور ہم، یاراور یاروں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یاراور یاروں کا یہ استعمال ضمیری استعمال ضرور ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ صرف مجازاً کہتے ہیں کہ اس سے انتہائی بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے۔لیکن یہ عامیانہ انداز ہے۔ایک اور بات یہ ہے کہ اس کا استعمال صرف مذکر کے لیے اور مذکر کی زبان سے ہوسکتا ہے۔عورتوں کی زبان سے اس کا ادا ہونا ممکن نہیں۔ چونکہ اردو میں ضمیر میں مذکر اور مونث میں فرق نہیں ہوتا اس لیے بھی اسے ضمیر ماننے میں تامل ہوتا ہے۔'' (۱۰۵)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ضمیر موصولہ وہ ہے جو کسی اسم کے بجائے آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جملہ ہوتا ہے جس میں اس کے اسم کا بیان ہوتا ہے۔ جیسے وہ کتاب جو کل چوری ہوگئی تھی مل گئی۔ضمیر موصولہ صرف (جو) ہے۔جس کی مختلف حالتیں ہیں۔ فاعلی حالت میں واحد کے لیے جس نے اور جمع کے لیے جنھوں نے ،مفعولی حالت میں واحد کے لیے جس کو یا جسے اور جمع کے لیے جن کو یا جنہیں، اضافی حالت میں واحد مذکر کے لیے جس کا اور واحد مونث کے لیے جس کی، جمع مذکر کے لیے جن کا اور جمع مونث کے لیے جن کی استعمال ہوتی ہے۔

ضمائرِ استفہامیہ سوال کرنے کے لیے آتی ہیں اور مولوی عبدالحق نے ان کی تعداد دو بتائی ہے، کون اور کیا۔کون جان دار کے لیے اور کیا بے جان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔کون کی مختلف حالتیں کون، کسے، کس کو، کس سے، کن کو، کنہیں، کن سے، کس کا اور کن کا ہیں۔اسی طرح کون سا اور کون سی بھی بجائے ضمیر مستعمل ہیں۔

ضمیر اشارہ وہ ہوتی ہے جو اشارہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق 'وہ' اور 'یہ' کو ضمیر اشارہ لکھتے ہیں وہ بعید کے لیے اور یہ قریب کے لیے استعمال ہوتی ہے۔حرفِ ربط کے آنے سے وہ اُس سے اور یہ اِس سے بدل جاتا ہے اور جمع میں اُن اور اِن ہو جاتا ہے۔

ضمائر تنکیر وہ ہیں جو غیر معین اشخاص یا اشیا کے لیے آئیں۔ان کی تعداد بھی مولوی عبدالحق نے دو بیان کی ہے، 'کوئی' اور 'کچھ'۔کوئی اشخاص کے لیے اور کچھ اشیا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔حروفِ ربط کے آنے سے کوئی

کی صورت کسی ہو جاتی ہے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ عربی کے الفاظ 'بعض' اور 'بعضے' بھی ضمیر تنکیر کا کام دیتے ہیں۔

ضمیر کے بیان میں آخر وہ مزید صفاتِ ضمیری کا ذکر کرتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ وہ صفات ہیں جن میں کم وبیش ضمیر کی خاصیت بھی پائی جاتی ہے۔ان میں شامل الفاظ صفات بھی ہوتے ہیں یا ضمیر۔اسم کے ساتھ آنے سے صفات ہو جاتے ہیں اور بغیر اسم کے ضمیر ہوتے ہیں۔صفاتِ ضمیری کی مولوی عبدالحق نے دو قسمیں بتائی ہیں، صفاتِ مقداری اور صفاتِ ذاتی۔ اِتنا (اِتّا)، اُتنا (اُتّا)، جِتنا (جِتّا)، کتنا (کِتّا) صفاتِ مقداری ہیں۔ایسا، ویسا، جیسا، کیسا صفاتِ ذاتی ہیں۔ان کے علاوہ ایک، دونوں، بہت، بعض، بعضے، غیر، سب، ہر، فلاں، فلانا، کئی، کے، چند، کُل کو بھی انہوں نے صفاتِ ضمیری میں شمار کیا ہے۔

یہاں پر ایک اضافی بحث مولوی عبدالحق نے اردو ضمائر کے ماخذ کی کی ہے۔اُن کے مطابق اردو کی تمام ضمیریں ہندی ہیں جو سنسکرت اور پراکرت سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے میں، تو، مجھ، تجھ، میرا، تیرا، ہم، یہ، جو، سو، کون، کیا، آپ کی اصل کے حوالے سے سنسکرت اور پراکرت میں ان کی صورت بیان کی ہے جو ارتقائی مراحل طے کر کے اردو میں ان الفاظ کا روپ دھارتی ہے۔اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق کی تحقیق کا جائزہ لینے سے جو بات سامنے آتی ہے کہ اس کی تمام عمارت قیاس تعمیر کی گئی ہے۔وہ یہ دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ قیاس کہتا ہے، خیال یہ ہے کہ، غالباً۔ذیل کے بیانات دیکھئے۔'یہ' کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''ایک دوسری صورت یو اور یا ہے جو پورب میں مستعمل ہے۔یہ غالباً پراکرت ''امو'' سے نکلی ہے۔خیال کیا جاتا ہے کہ جس طرح اشارۂ قریب کی صورتیں اشہ اور اماہ سے نکلی ہیں اسی طرح اشارۂ بعید 'وہ' اُشہ اور اُماہ سے نکلا ہے۔'' (۱۰۶)

> ''آپس کی نسبت یہ خیال ہے کہ وہ پراکرت کی صورت اضافی آپپا سے بنا ہے۔'' (۱۰۷)

حصہ صرف کے آغاز میں مولوی عبدالحق نے مستقل الفاظ کی چوتھی قسم فعل بیان کی ہے۔ چنانچہ فعل کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''فعل وہ ہے کہ جس سے کسی شے کا ہونا یا کرنا ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے تماشا شروع ہوا۔ اُس نے خط لکھا۔ ریل چلی۔فعل کی بلحاظ معنوں کے تین قسمیں ہیں۔
>
> ۱۔لازم ۲۔متعدی ۳۔ناقص'' (۱۰۸)

اس طرح یہاں پر مولوی عبدالحق نے کسی شے کے ہونے یا کرنے کو فعل قرار دیا ہے اور یہ وضاحت

نہیں کی کہ یہ ہونا یا کرنا کسی مخصوص زمانے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مولوی عبدالحق کی فعل کی اسی تعریف کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فعل کی یہ تعریف درست نہیں اس لیے کہ مصدر جس میں کسی کام کا ہونا یا کرنا پایا جاتا ہے، فعل نہیں ہوتا۔ کھانا، پینا ایسے بول ہیں جن میں کھانے اور پینے کے افعال کا تصور موجود ہے، لیکن جب تک ان کے ساتھ کسی زمانے کا تعین نہ ہو یہ افعال نہیں کہلائیں گے۔(۱۰۹) لیکن مولوی عبدالحق نے آگے چل کر یہ وضاحت کردی ہے کہ فعل کے لیے کسی خاص زمانے میں ہونا لازمی ہے:

''فعل کے لیے زمانے کا ہونا ضرور ہے۔زمانے تین ہیں گذشتہ، جسے ماضی کہتے ہیں۔ موجودہ، جسے حال کہتے ہیں اور آئندہ، جس کا نام مستقبل ہے۔ ہر فعل یا کام کا تعلق بلحاظ زمانے کے ان تینوں میں سے کسی کے ساتھ ضرور ہوگا۔''(۱۱۰)

فعل کی تین قسموں کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ فعل لازم وہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا پایا جائے، مگر اس کا اثر صرف کام کرنے والے یعنی فاعل تک رہے۔ فعل متعدی وہ ہے جس کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچے۔ فعل ناقص وہ ہے جو کسی پر اثر نہ ڈالے بلکہ کسی اثر کو ثابت کرے۔

علاوہ جنس و تعداد کے مولوی عبدالحق کے بقول افعال میں تین چیزیں اور بھی پائی جاتی ہیں۔

۱۔طور ۲۔ صورت ۳۔زمانہ

طور وہ حالت ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کام خود فاعل سے صادر ہوا یا کام کا اثر کسی پر واقع ہوا۔ان کے مطابق فعل کے طور دو ہیں۔ جب فاعل کے کام کا اثر کسی دوسری شے یا شخص پر واقع ہو تو اُسے طور معروف کہتے ہیں اور جب صرف وہ شے یا شخص معلوم ہو جس پر اثر واقع ہوا ہے اور فاعل معلوم نہ ہو تو اُسے طور مجہول کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ہر فعل کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فعل (کام) کس ڈھنگ سے ہوا۔ جبکہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے خیال میں اسے فعل کی صورت یا ڈھنگ کہنا مشکل ہے، بلکہ اسے فعل کی حالت سمجھنا چاہیے۔''(۱۱۱)

مولوی عبدالحق نے فعل کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں۔

۱۔خبری ۲۔شرطی ۳۔احتمالی

۴۔امری ۵۔مصدری

خبری صورت وہ ہے جو کسی واقعے کی خبر دے یا کسی امر کے متعلق استفسار کرے۔ شرطی صورت وہ ہے جس کے مطابق فعل میں شرط یا تمنا موجود ہوتی ہے۔ احتمالی صورت میں احتمال یا شک پایا جاتا ہے۔ امری صورت میں حکم یا التجا موجود ہوتی ہے۔ جبکہ مصدری صورت میں کام کا ہونا بلاتعینِ وقت ہوتا ہے اس صورت میں لفظ کے آخر میں ہمیشہ 'نا' ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق اس کو ایک قسم کا فعلی اسم قرار دیتے ہیں جو تجریدی طور پر فعل کے کام یا حالت کو بتاتا ہے اور زمانہ اور تعداد سے بری ہوتا ہے۔

اسی طرح فعل کے لوازم میں مولوی عبدالحق کسی زمانے کے ہونے کو شمار کرتے ہیں۔ فعل کے سلسلہ میں یہ ذکر ہونا ضروری ہے کہ کام ماضی، حال یا مستقبل کس زمانے میں ہوا ہے۔

مصدر کی علامت نا گرا دینے سے فعل کا مادہ بنتا ہے اور اس سے اکثر باقاعدہ افعال بنتے ہیں وہ مزید لکھتے ہیں کہ ہندی فعل کا مادہ صورت میں امر مخاطب کے مشابہ ہوتا ہے۔

فعل کے مادے کے آخر میں تا بڑھانے سے حالیہ ناتمام اور ' ا ' بڑھانے سے حالیہ تمام بنتا ہے۔ جب مادے کے آخر میں ' ی ' یا ' و ' ہوگا تو وہاں یا بڑھایا جائے گا۔ اگر آخر ی معروف ہوگی تو حالیہ تمام کے اول اس کی صورت صرف زبر کی رہ جاتی ہے۔ سہ حرفی مادوں میں دوسرے حرف کی حرکت ساکن ہو جاتی ہے۔ تیسری صورت حالیہ معطوفہ کی ہے جو مادے کے آخر ''کے'' یا ''کر'' لگانے سے بنتا ہے۔

مولوی عبدالحق کے مطابق فعل کے مختلف صیغے تین طرح سے بنتے ہیں۔ اول مادہ سے، دوم حالیہ تمام اور امدادی افعال کے ذریعے سے، سوم حالیہ ناتمام اور امدادی افعال کی مدد سے۔ ہر کام کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں کام جو ختم ہو چکا ہے یا جو شروع ہو چکا ہے اور ختم نہیں ہوا اور جو ابھی شروع نہیں ہوا۔ اسی حوالے سے مولوی عبدالحق نے افعال کے ماضی، حال اور مستقبل کے صیغوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ماضی کی مولوی عبدالحق چھ اقسام بتاتے ہیں۔ ماضی مطلق، ناتمام، تمام، شرطیہ، تمنائی، احتمالی۔

ماضی مطلق وہ ہے جس سے محض ایک فعل کے گذشتہ زمانے میں واقع ہونے کی خبر ملے۔ یہ مادہ فعل کے آخر میں ' ا ' بڑھانے سے بنتی ہے۔ اگر مادہ کے آخر میں الف یا واؤ ہو تو بجائے الف کے یا بڑھا دیتے ہیں۔ ماضی ناتمام یہ ظاہر کرتی ہے کہ گذشتہ زمانے میں کام جاری تھا۔ جبکہ ماضی تمام (بعید) میں فعل کا زمانہ گذشتہ میں ختم ہو جانا پایا جاتا ہے۔ یہ حالیہ تمام کے بعد (تھا) بڑھانے سے بنتی ہے۔ اس کی دوسری صورت چکا تھا بڑھانے سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ ماضی احتمالی یا ماضی شکیہ وہ ہے جس میں احتمال یا شک پایا جائے۔ یہ حالیہ تمام کے بعد ہو یا ہوگا

بڑھانے سے بنتی ہے۔ ماضی شرطیہ (یا تمنائی) جس میں شرط یا تمنا پائی جاتی ہے اور یہ مادہ فعل کے بعد تا بڑھانے سے بنتی ہے۔اسی طرح دوسری صورت اس کی حالیہ تمام کے بعد ہوتا بڑھانے سے بنتی ہے۔

فعل حال کے بیان میں مولوی عبدالحق نے اس سے مراد ایسا فعل جس سے زمانہ موجودہ کا اظہار ہوتا ہے، لی ہے۔انہوں نے اس کی چھ قسمیں بیان کی ہیں۔اول قدیم حالِ مطلق۔اس میں زمانہ حال کے ساتھ اور بھی کئی معنی جھلکتے ہیں اردو قواعد نویسوں نے اس کو مضارع کے نام سے الگ فعل قرار دیا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں سے باہر قرار دیا ہے۔اگر چہ مولوی عبدالحق اس کو فعل حال ہی تسلیم کرتے ہیں لیکن انہوں نے بھی اس کا نام مضارع ہی مناسب سمجھا ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''درحقیقت یہ حال ہے اور اب اس میں حال کے معنی پائے جاتے ہیں، لیکن اس دلیل کے بعد بھی قواعد نویس اسے مضارع کہنے پر ہی مصر ہیں، تو پھر اسے حال سے الگ ایک فعل کیوں نہ قرار دیا جائے۔''(۱۱۲)

فعل حال کی دوسری قسم انہوں نے امر یہ بیان کی ہے۔ یہ عموماً حکم اور التجا کے لیے آتا ہے۔عام طور پر علامتِ مصدر گرادینے سے امر باقی رہ جاتا ہے۔تیسری قسم حال مطلق کی ہے۔اس سے زمانہ حال عام طور پر بلا کسی تخصیص کے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حالیہ ناتمام کے آگے واحد غائب اور واحد مخاطب میں 'ہے' جمع مخاطب میں 'ہو' اور واحد متکلم میں 'ہوں' بڑھانے سے بنتا ہے۔حالِ ناتمام چوتھی قسم ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کام جاری ہے اور ابھی ختم نہیں ہوا۔ یہ مادہ فعل کے آگے رہا ہے، رہے ہیں، رہا ہوں بڑھانے سے بنتا ہے۔حالِ تمام ایک ایسی قسم ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام ابھی ابھی ختم ہوا ہے حالیہ تمام کے بعد ہے، ہیں، ہوں بڑھانے سے بنتا ہے اور کبھی مادہ فعل کے بعد چکا ہے، چکا ہوں، چکے ہیں بڑھانے سے حالِ تمام ظاہر ہوتا ہے۔اس صورت میں مزید تاکید اختتام فعل کی پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہمارے خیال میں اس صورت کو ماضی قریب میں شمار کرنا مناسب ہے، ایسی صورت میں پڑھ چکا تھا وغیرہ صیغہ ماضی بعید اور پڑھ چکا ہے وغیرہ ماضی قریب کے صیغے قرار پاتے ہیں جو واقعہ ہے۔''(۱۱۳)

اسی طرح ان کے مطابق حالِ احتمالی وہ ہے جس سے زمانہ حال کے کسی فعل میں احتمال پایا جائے۔
فعل مستقبل کو مولوی عبدالحق نے دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ مستقبل مطلق اور مستقبل مدامی۔ مستقبل

مطلق جس سے محض زمانہ آیندہ پایا جائے۔ یہ مضارع کے بعد گا (یا گے یا گی) بڑھانے سے بنتا ہے۔ مستقبل مدامی جس میں آئندہ زمانے میں کام کا جاری رہنا پایا جائے۔ یہ حالیہ ناتمام کے بعد ''رہے گا'' بڑھانے سے بنتا ہے۔

فعل کی گردان کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس میں تین باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جنس، تعداد اور حالت۔ جنس کے معنی تذکیر و تانیث، تعداد کے معنی واحد و جمع کے ہیں۔ اردو میں جن افعال میں اصل فعل کے بعد کوئی دوسرا فعل یا علامت لگائی جاتی ہے، ان کی گردان میں اختلاف ہوتا ہے۔ ماضی بعید، فعل حال مطلق و تمام میں بحالت مذکر اصل فعل اور علامت دونوں کو بدلنا پڑتا ہے مگر بحالت مونث صرف امدادی فعل کو بدلنا پڑتا ہے۔ فعل مستقبل میں بہ حالت مذکر تو یہی صورت قائم رہتی ہے یعنی اصل فعل اور علامت دونوں بدل جاتے ہیں لیکن مونث کی صورت میں اصل فعل تو حسبِ معمول بدل جاتا ہے لیکن علامت مونث ایک ہی رہتی ہے۔ حالِ امریہ میں مونث اور مذکر میں کوئی تمیز نہیں۔ تمام افعال کے جمع متکلم میں تذکیر و تانیث کے صیغے یکساں آتے ہیں۔

جہاں تک فعل کی حالت کا تعلق ہے تو مولوی عبدالحق اس کی تین حالتیں بیان کی ہیں:

> ''فعل کی تین حالتیں ہیں۔ غائب، واحد اور متکلم اور ان میں سے ہر ایک کی بہ لحاظ تعداد دو دو حالتیں ہیں، اس لیے کل چھے ہوئیں اور پھر بہ لحاظ جنس کے ان چھے کی دو دو حالتیں ہیں۔ اس لیے ہر فعل کی بارہ حالتیں ہوئیں، ان میں سے ہر ایک کو صیغہ کہتے ہیں۔'' (۱۱۴)

یہاں پر مولوی عبدالحق سے معلوم ہوتا ہے لاشعوری طور پر غلطی ہوئی ہے۔ وہ غائب، حاضر اور متکلم لکھنے کے بجائے غائب، واحد اور متکلم لکھ گئے۔ کتابت کی غلطی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قواعدِ اردو کی تمام اشاعتوں میں واحد ہی درج کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے قواعدِ اردو کے ۱۹۲۶ء (۱۱۵)، ۱۹۵۱ء (۱۱۶) اور ۱۹۵۸ء (۱۱۷) کے ایڈیشنز دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تمام ایڈیشنز مولوی عبدالحق کی زندگی ہی میں چھپے۔

طور مجہول کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ اسے مجہول اس لیے کہتے ہیں کہ فعل کا فاعل معلوم نہیں ہوتا۔ طور مجہول عموماً اور اکثر افعال متعدی کا ہوتا ہے۔ جس فعل متعدی کا مجہول بنانا ہو اس فعل کے ماضی مطلق کے آگے مصدر جانا سے جو زمانہ بنانا منظور ہو وہی زمانہ بنا کر لگا دیا جائے۔ مولوی عبدالحق درج ذیل افعال کو طبعی طور پر مجہول قرار دیتے ہیں پٹنا، لٹنا، پلنا، کھلنا، بٹنا، چھدنا، سجنا، کٹنا، سِلنا، کھلنا۔ طورِ مجہول میں جو جانا استعمال ہوتا ہے اس کو وہ پراکرت کے طورِ مجہول سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ پراکرت میں طور مجہول بنانے کے لیے (اِجا) مادۂ فعل کے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ مرورِ زمانہ سے غالباً اجا کا جا، جانا کا جا سمجھ لیا گیا اور رفتہ رفتہ طور

ِ مجہول کے لیے استعمال ہونے لگا۔لیکن یہاں بھی وہ بات یقین کے ساتھ اور واضح استدلال کے ساتھ نہیں کر سکے اور قیاس کرتے ہوئے غالباً کا سہارا لیا۔

افعال کی نفی کے حوالے سے وہ یہ سادہ اصول بیان کرتے ہیں کہ افعال کے شروع میں نہ یا نہیں لگانے سے فعل نفی ہو جاتا ہے۔البتہ بعض اوقات نہیں بعد میں بھی آتا ہے۔نہ اور نہیں کے استعمال میں فرق ہے۔ماضی شرطیہ اور مضارع کے ساتھ 'نہیں' استعمال نہیں کرتے بلکہ 'نہ' استعمال ہوتا ہے۔حال امر یہ کی نفی نہ اور مت دونوں طرح سے ہوتی ہے۔مولوی عبدالحق کسی بھی اصول کو بیان کرتے ہوئے اس کی موزونیت کو بھی سامنے رکھتے ہیں اور اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ایسے افعال جو کسی اسم یا صفت اور فعل سے مرکب ہوں ان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کی نفی دو طرح ہوتی ہے یا تو حرف نفی اسم یا صفت کے اول ہوتا ہے یا فعل کے اول اور ساتھ ہی وہ اپنی رائے دیتے ہیں کہ فعل کے ساتھ حرف نفی لانا بہتر ہے۔

افعال کے تعدیہ کے عنوان کے تحت مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ سوائے ایک آدھ کے باقی تمام افعال لازم متعدی بن سکتے ہیں اور پھر متعدی سے متعدی المتعدی۔متعدی بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ فعل کے مادے کے آگے 'ا' بڑھا دیا جائے۔بعض اوقات مادۂ فعل کے آخر حرف سے قبل 'ا' کا اضافہ کر دیتے ہیں۔کبھی پہلے حرف کی حرکت کو اس کے موافق حرف علت سے بدلنے سے اور کبھی مصادر چار حرفی میں جب کہ حرف دوم حرف علت ہو تو اُس حرفِ علت کو ساقط کر کے اول کو اس کے موافق حرکت دیتے ہیں اور اُس کے آگے 'ا' یا بجائے اَ کے 'لا' بڑھا دیتے ہیں۔اگر مصدر پانچ حرفی ہے اور دوسرا حرف حرفِ علت ہے تو حرف علت حذف کر کے پہلے حرف کو اس کے موافق حرکت دے کر اس کے آگے الف بڑھا دیتے ہیں۔اسی طرح متعدی المتعدی بنانے کا یہ قاعدہ ہے کہ کبھی علامتِ مصدر کے اول الف بڑھا دینے سے اور کبھی وا بڑھا دینے سے دوسرا حرف حرفِ علت ہو تو گر جاتا ہے اور اس کے بجائے اس کے موافق حرکت آ جاتی ہے۔اگر چہ مولوی عبدالحق نے متعدی اور متعدی المتعدی افعال کی بہت زیادہ صورتوں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے بنانے کے مختلف طریقے بھی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں لیکن وہ یہ قواعد بیان کرتے ہوئے کبھی کے لفظ کا بار بار سہارا لیتے ہیں اور یہ وضاحت کئے بغیر کہ کس مقام پر کوئی قاعدہ کیوں لاگو ہوا ہے مختلف قواعد کو بیان کرتے جاتے ہیں۔دراصل اردو زبان میں قواعد کے حوالے سے اس قدر مستثنیات ہیں کہ تمام الفاظ کا قواعد کی پابندی کرنا ممکن نہیں رہتا ایک لفظ پر ایک قاعدہ لاگو ہوتا ہے تو دوسرے اسی قسم کے لفظ پر کوئی اور قاعدہ لاگو ہو رہا ہوتا ہے۔ایک جدید ترین اور ہر پہلو پر محیط قواعد اردو لکھنے کے لیے الفاظ کی اصل کا کھوج لگانا انتہائی ضروری ہے تب ہی جا

کر مکمل اصول وضوابط مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ایک جدید ترین اردو قواعد کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بعض اوقات الفاظ کی اصل کا کھوج لگا کر ان کے قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں بھی وہ مصلحت کا شکار ہو گئے ہیں اور غالباً کا سہارا لے کر گنجائش رکھ گئے ہیں۔ متعدی کے سلسلہ میں وہ ایک تو پالیا کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

''ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ سنسکرت میں ''پا'' کے معنے محفوظ رکھنے کے ہیں۔ متعدی بنانے کے لیے حسن صورت کے خیال سے بجائے ''پ'' کے ''ل'' کا اضافہ کیا گیا جس سے ''پالیا'' (ہندی پالنا) بنا۔ غالباً پراکرت کی یہ صورت بہ کثرت استعمال ہونے لگی اور یہی ''ل'' کی اصل بتائی جاتی ہے۔'' (۱۱۸)

مرکب افعال مولوی عبدالحق کے مطابق دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے افعال کی مدد سے جنہیں افعالِ امدادی کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ افعال کو اسما یا صفات کے ساتھ ترکیب دینے سے۔

اصل فعل کے ساتھ کوئی دوسرا فعل یا اس کے کسی جز کا اضافہ کر کے اس کے معنی میں تغیر پیدا کیا جاتا ہے یا اس کے اندر نئے معنی پیدا کئے جاتے ہیں۔ اس سے مولوی عبدالحق کے مطابق اصلی فعل کے معنوں میں زیادہ قوت پیدا ہوتی ہے یا کلام میں کوئی حسن اور خوبی آجاتی ہے۔ امدادی افعال کی مدد سے بے شمار لطیف اور نازک معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان میں امدادی افعال نے بڑی وسعت اور نزاکت پیدا کر دی ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق امدادی فعل اور اس کے حوالے سے اصل فعل کے معنی میں تغیر نحو سے تعلق رکھتا ہے لیکن چونکہ فعل کا ذکر حصہ صرف میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے اس لیے امدادی فعل کا بیان بھی انہوں نے یہاں کیا ہے۔ چنانچہ امدادی فعل کے بیان میں انہوں نے اردو میں استعمال ہونے والے اہم امدادی افعال اور ان کا استعمال تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک سب سے زیادہ کارآمد اور کثیرالاستعمال امدادی فعل 'ہو' ہے۔ اس سے اکثر افعال بنتے ہیں۔ مثلاً ماضی ناتمام، تمام، احتمالی، فعل حال کی مختلف اقسام اور مستقبل اسی کی امداد سے بنتے ہیں۔ اسی طرح مولوی عبدالحق کے مطابق بعض امدادی افعال تکمیلِ فعل میں تقید اور زور ظاہر کرتے ہیں جن میں دینا، لینا، جانا، ڈالنا، پڑنا، رہنا شامل ہیں۔ چنانچہ وہ امدادی افعال کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دینا سوا چل دینا کے اکثر طور متعدی کے ساتھ آتا ہے۔ لیکن میں بطور امدادی فعل تکمیلِ فعل کے ساتھ فاعل کی قربت، فائدہ یا جانب داری ظاہر ہوتی ہے۔ جانا بکثرت افعال کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور زیادہ تر طور لازم کے ساتھ آتا ہے۔

اسی طرح آنا بھی بطور امدادی فعل بہت کم استعمال ہوتا ہے وہ بھی زیادہ تر افعالِ ابتدائی لازم کے ساتھ آتا ہے۔ ڈالنا میں تکمیلِ فعل کسی قدر زیادہ زور کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے نیز اس میں جبر کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ رہنا میں فعل کے ایک حالت پر قائم رہنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چکنا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ اختتام فعل کو کامل طور پر ظاہر کرتا ہے۔ بعض افعال سے امکانی حالت اور قابلیت یا اجازت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً سکنا، دینا، پانا، جانا وغیرہ ان میں سے سکنا کبھی تنہا استعمال نہیں ہوتا یہ ہمیشہ کسی دوسرے فعل کے ساتھ بطور امدادی فعل کے آتا ہے۔ اسی طرح کرنا، رہنا، بیٹھنا، اُٹھنا، نکلنا، لگنا، چاہنا، رکھنا کے بطور امدادی فعل انہوں نے وضاحت کی ہے اور ان کا مختلف افعال کے ساتھ استعمال اور ان کے معنوں میں تغیر و تبدل واضح کیا ہے۔ چاہنا کے بطور امدادی فعل استعمال کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ یہ بتاتا ہے کہ کام قریب کے زمانہ آئندہ میں ہونے والا ہے، مگر اصل فعل ہمیشہ ماضی کی صورت میں رہتا ہے۔ جیسے وہ بولا چاہتا ہے، یہ حالت صرف فعل حال میں استعمال ہوتی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''یہ کہنا درست نہیں کہ یہ حالت صرف فعل حال میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہنا بھی درست ہے کہ بارش ہوا چاہتی تھی کہ ہوا چلنے لگی۔ فیصلہ ہوا چاہتا تھا کہ ہنگامہ ہوگیا۔'' (۱۱۹)

مرکب افعال کی دوسری صورت مولوی عبدالحق نے افعال کو اسما یا صفات کے ساتھ ترکیب دینا قرار دیا۔ چنانچہ 'اسما و صفات کی ترکیب سے' کے عنوان کے تحت وہ اس ذیل میں ایک تو ہندی اسم یا صفت کے ساتھ سادہ مصادر کا آنا آجاتا ہے۔ اس قسم کے مرکب افعال میں زیادہ تر امدادی افعال استعمال ہوتے ہیں جن میں سے کچھ کی فہرست مولوی عبدالحق نے دی ہے اور مزید لکھا ہے کہ ان کی تفصیل لغت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح فارسی، عربی اسم یا فارسی یا عربی صفت کے ساتھ ہندی مصدر کے استعمال سے مرکب افعال بنتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات ہندی اسما یا صفات میں کسی قدر تغیر کر کے نا کی علامت لگا دیتے ہیں اور مصدر بنا لیتے ہیں۔ اس حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اردو میں بعض مصدر ایسے ہیں کہ عربی یا فارسی افعال یا اسما کے آگے ہندی مصدر کی علامت نا لگا کر انہیں اردو بنا لیا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق ہمیشہ اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے خواہاں رہے چنانچہ وہ اردو زبان میں نئے امکانات اور اضافوں کے ہمیشہ حامی رہے۔ چنانچہ اس حوالے سے بھی وہ لکھتے ہیں کہ اس طور سے مصدر بنانے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے حالاں کہ اس سے زبان میں بڑی وسعت ہو سکتی ہے۔ مرکب افعال کے سلسلہ میں مصادر کے استعمال کے حوالے سے مولوی عبدالحق کے بیان پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

''مرکب افعال کے سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب نے بعض مصادر کو بھی شامل کر لیا

ہے۔ ہمارے خیال میں ان مصادر کی بحث کا تعلق مرکب افعال سے نہیں ہے۔ مرکب افعال صرف ایسے افعال ہیں جو یا تو امدادی فعل اور دوسرے فعل کا مرکب ہیں یا اسم وصفت اور امدادی فعل کا مرکب۔ مولوی صاحب نے اس سلسلے میں حسب ذیل مصادر کا ذکر کیا ہے ان کی بحث ہم مصادر کے سلسلے میں پہلے کر چکے ہیں۔

اسی سلسلے میں مولوی صاحب بھن بھن، ٹھن ٹھن، بڑ بڑ، من من بھی شامل کرتے ہیں۔ اتنا اضافہ اور کرنا چاہیے کہ اس قسم کے الفاظ صرف نا علامت مصدر لگا کر نہیں بنتے بلکہ انا لگانے سے بنتے ہیں۔ دراصل ایسے الفاظ جو حروف علت پر ختم ہوں، ان کے آخر میں نا اور حروفِ صحیحہ پر ختم ہونے والے الفاظ میں انا لگاتے ہیں۔'' (۱۲۰)

مولوی عبدالحق کے مطابق مستقل الفاظ کی پانچویں قسم تمیز ہے۔ تمیز فعل یا صفت کی کیفیت بیان کرتی ہے اور اس کے آنے سے فعل یا صفت کے معنوں میں تھوڑی بہت کمی بیشی واقع ہو جاتی ہے۔ تمیز یا متعلق فعل زیادہ تر زمان ومکان کے بیان کے لیے، سمت، طور طریقہ، تعداد، ایجاب وانکار اور سبب وعلت کے بیان کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اس سلسلہ میں استعمال ہونے والے معروف الفاظ کی ساتھ ساتھ فہرست دی ہے۔ کبھی دو تمیزیں مل کر مرکب تمیز بناتی ہیں یا ایک ایک دو دو لفظ مل کر بطور جزو جملہ کے تمیز کا کام دیتے ہیں۔ بعض اسم وار کے ساتھ مل کر تمیز کا کام دیتے ہیں اسی طرح بعض الفاظ صفات بھی تمیز کا کام دیتے ہیں اور کبھی اسمائے عام اور حالیہ معطوفہ بھی تمیز کا کام دیتے ہیں۔

حرف کا بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے:

''حروف وہ غیر مستقل الفاظ ہیں جو تنہا (بولنے یا لکھنے میں کوئی خاص معنی پیدا نہیں کرتے جب تک کسی جملے میں یا دوسرے الفاظ کے ساتھ استعمال نہ ہوں جیسے کو، تک، جب وغیرہ۔ اردو میں ان کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ ربط ۲۔ عطف ۳۔ تخصیص ۴۔ فجائیہ'' (۱۲۱)

حروفِ ربط وہ ہیں جو ایک لفظ کا علاقہ کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں کا، کے، کی، نے، کو، تئیں، سے، میں، تک، پر شامل ہیں۔ ان حروف کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اگر چہ یہ سادہ حروف معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ سنسکرت میں مستقل الفاظ تھے جو اردو میں پہنچتے پہنچتے مختصر رہ کر حروف کی

صورت اختیار کر گئے۔اس حوالے سے انہوں نے کا، نے، سے، پر، تک، تلک اور تیئں کی سنسکرت میں اصل صورت پر بحث کی ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ یہ الفاظ کس طرح مختلف روپ بدلنے کے بعد اردو میں ان حروف کی صورت تک پہنچے۔

حروفِ عطف کی تعریف مولوی عبدالحق نے یہ کی ہے کہ یہ دو یا دو سے زیادہ لفظوں کو یا دو جملوں کو ملانے کا کام دیتے ہیں۔ان کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱۔وصل ۲۔تردید ۳۔استدراک ۴۔استثنا ۵۔شرط ۶۔علت ۷۔بیانیہ

حروفِ وصل میں انہوں نے اور، و، کیا۔۔۔کیا، یا، کہ کی کو شامل کیا ہے۔حروفِ تردید مولوی عبدالحق کے مطابق نہ نہ، خواہ، چاہے، یا یا ہیں۔حروفِ استدراک میں پر، لیکن، بلکہ شامل ہیں۔حروفِ استثنا میں وہ مگر، الا کو رکھتے ہیں۔اگر اور جو ان کے نزدیک حروفِ شرط ہیں۔سو، پس، اس لیے، لہذا، بنا بریں، کیوں کہ حروفِ علت ہیں۔اسی طرح تا، تا کہ اور مبادا کو بھی وہ حروفِ علت کے ضمن میں سمجھتے ہیں۔

حروفِ تخصیص کی تعریف مولوی عبدالحق نے یہ کی ہے کہ جب کسی اسم یا فعل کے ساتھ آتے ہیں تو خصوصیت یا حصر کے معنے پیدا کرتے ہیں۔ان میں ہی، تو، بھی، ہر شامل ہیں۔

حروفِ فجائیہ وہ الفاظ ہیں جو جوش یا جذبے میں بے تحاشا زبان سے نکل جاتے ہیں۔مختلف جذبات اور تاثرات کے لیے الگ الگ حروف مستعمل ہیں۔ان میں حروفِ ندا، خوشی اور مسرت کے لیے استعمال ہونے والے حروف، رنج و تاسف کے لیے استعمال ہونے والے حروف، نفرت کے لیے استعمال ہونے والے حروف، تحسین و آفرین کے لیے استعمال ہونے والے حروف، پناہ مانگنے اور تنبیہ کرنے کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو مولوی عبدالحق نے شامل کیا ہے۔عام طور پر قواعد میں خوشی اور مسرت کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو حروفِ انبساط، رنج و تاسف کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو حروفِ انبساط، نفرت کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو حروفِ نفرین، تحسین و آفرین کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو حروفِ تحسین اور تنبیہ کے لیے استعمال ہونے والے حروف کو حروفِ تنبیہ کا نام دیا جاتا ہے لیکن مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں ان حروف کے لیے یہ نام استعمال نہیں کیے۔

قواعدِ اردو کی فصلِ سوم میں 'مشتق اور مرکب الفاظ' کا ذکر ہے۔مشتق کی تعریف مولوی عبدالحق نے یہ کی ہے کہ یہ وہ لفظ ہے جو کسی دوسرے لفظ سے کسی قدر تغیر سے نکلا یا بنا ہو۔اس باب میں انہوں نے زیادہ تر ہندی

الفاظ کے اشتقاق سے بحث کی ہے۔ فارسی الفاظ کے اشتقاق کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ہندی سے ملتا جلتا ہے۔ جبکہ عربی الفاظ کو اپنی بحث سے خارج کر دیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسمائے کیفیت بننے کے مختلف طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق اکثر افعال کے مادے اسمائے کیفیت کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات مادے کے آگے الف یا ن بڑھانے سے اسمائے کیفیت بنتے ہیں۔ بعض اوقات صفات کے آگے ن بڑھانے سے اسمائے کیفیت بنتے ہیں۔ فعل کے آگے ا، ن کے اضافے سے اسمائے کیفیت بنائے جاتے ہیں۔ فعل کے مادے کے آگے ائی یا وائی لگانے سے، صفت کے بعد ائی، ئی کے اضافے سے، اسم کے بعد ی معروف بڑھانے سے، ت یا تی بڑھانے سے، ا ت کے اضافے سے، اسم کے بعد ٹ، ہٹ، اٹ کے بڑھانے سے یا صفات کے بعد یہی علامت بڑھانے سے، مادۂ فعل کے بعد آؤ کے اضافہ سے، اسم کے آگے پا، پن اور پنا کے بڑھانے سے، اسم یا فعل کے بعد ک کے بڑھانے سے، کی کے اضافے سے، اس کے اضافے سے، مادہ فعل کے بعد اپ کے اضافے سے، پت کے اضافے سے، نا کے لگانے سے، واس کے بڑھانے سے، وا کے اضافے سے اسمائے کیفیت بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح فارسی ترکیبیں مثلاً گی، ی، ش کے اضافے سے اسمائے کیفیت کا کام دیتی ہیں۔ مولوی عبدالحق اسم فاعل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ کسی کام یا پیشے کے ظاہر کرنے کو استعمال ہوتا ہے، یہ ان علامتوں کے اضافے سے بنتا ہے۔ والا، وال، ہار، ہارا، اری ، اڑی، ایرا، ا، یا، ہا، وا، اک، تا، کڑ، رو، بر، بان، مند، ور اور چی۔ اسی طرح اسمائے آلہ، فعل کے بعد ان علامات کے بڑھانے سے بنتے ہیں۔ نی، ا، یل، و، ہ، آنہ۔ اسمائے ظرف اسم کے بعد ان علامات کے لگانے سے بنتے ہیں۔ باڑی، ستان، الا، الی، ال، سال، انہ، او، دوار۔ اسم کی تصغیر ان علامات کے اضافے سے بنتی ہے۔ ا، ی، یا، وا، ڑی، ری، ڑا، را، ایلا، اولا، ٹا، وٹا، نا، ک، وڑ، چی، چہ۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق نے ان صفات کا ذکر کیا ہے جو دوسرے الفاظ سے مشتق ہیں۔ یہ ان علامات کے اضافے سے ترکیب پاتی ہیں۔ ی، ا، اک، ایلا، او، ک، کا، یت، ونت، مان، وان، و، وا، سا، والا، واں، نا، ہار، ہائی، ہرا، ہری، یرا، اسی طرح فارسی کی علامات ایں، این، ناک وغیرہ۔

مولوی عبدالحق نے مرکب الفاظ کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ اول وہ جہاں ایک خاص حرف یا علامت یا لفظ دوسرے مختلف الفاظ کے ساتھ مل کر خاص معنی پیدا کرتا ہے۔ دوسرے، وہ جب کہ دو مختلف اسم یا ایک اسم اور صفت یا اسم و فعل یا صفت و فعل مل کر ایک لفظ بن جاتا ہے، ایسے مرکبات زیادہ تر ہندی ہوتے ہیں۔ چنانچہ پہلی قسم کو بیان کرتے ہوئے وہ ان الفاظ کی تفصیل درج کرتے ہیں جن کے آنے سے صفات کی نفی ہوتی ہے۔ ان میں ا، ان،

ن، نر، بن، ک، ک شامل ہیں۔ اسی طرح فارسی علامات نا، بے، کم، خلاف وغیرہ یہی کردار ادا کرتی ہیں۔ مرکب صفات کے اضافے سے جو اکثر فارسی ہوتی ہیں اور اکثر بطور اسم فاعل مستعمل ہیں۔ دار، باز، ساز، آور، ور، خواہ، اندیش، طلب، شناس، وان، فہم، پوش، بخش، پرست، پسند، فروش، گیر، خوار، خور، گو، جو، بیں، نشیں، ربا، چیں، ریز، فشاں (افشاں)، سوز، کن، زدہ، آلودہ، زن، آزار، افروز، افراز، فراز، آموز، آمیز، انگیز، پرور، نواز، پرداز، کشا، گداز، نما، بوس، لیس، بار، رو، دوز، رس، گوں، فام۔ اسی طرح بعض خاص اسم دوسرے اسما کے ساتھ آنے سے یہ معنی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ دی گئی ہے۔ دشمن، فریب، مائل، خوش، نیک، خوب، خود، صاحب، اہل، کار، نیم۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ اسم فاعل بھی اسی طرح بنتے ہیں جو یہ علامات لگانے سے بنتے ہیں۔ بردار، گر، کار، وار، باز، کش، پوش، فروش، خوان، انداز، نشین، ربا، کن، دوز، شو، چی۔ اسی طرح چند فارسی سابقے درج کئے ہیں۔ پا، پس، پر، پنج، پیش، تہ، خر، خوش، در، زبر، زیر، زود، سر، سہ، شاہ، شہ، شش، صاحب، صدر، غیر، میر، نیم، نو، ہر، ہزار، ہشت ہفت، ہم، ہمہ، یک، تر، شو، سر، مہا۔

مرکب الفاظ کی بحث میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اردو میں جب دو مرکب الفاظ مل کر ایک بن جاتے ہیں تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک بلحاظِ لفظی اور دوسری بلحاظِ معنی۔ بلحاظِ لفظی لفظوں کے ترکیب پانے کو بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ بعض اوقات دو لفظ اس طرح ملتے ہیں کہ ان کی اصلی حالت قائم رہتی ہے اور ان میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات پہلے لفظ کے الف ممدودہ کا مد گر جاتا ہے اور صرف سادہ الف رہ جاتا ہے یا دو لفظوں کے ملنے پر پہلے لفظ کے آخر کا (ا) یا (ی) گر جاتی ہے یا پہلے لفظ کے بیچ کا حرفِ علت گر جاتا ہے یا پہلے لفظ کے بیچ اور آخر کے دونوں حرف علت گر جاتے ہیں۔ اسی طرح دونوں لفظوں کے حرفِ علت گر کر بھی مرکب لفظ بناتے ہیں۔ بعض اوقات پہلے لفظ کا آخر حرف اور دوسرے لفظ کا اول حرف ایک ہوں تو ان میں سے ایک گر جاتا ہے۔ اسم فاعل یا صفت یا اسم عام بنانے کی غرض سے آخر میں الف یا مونث کے لیے ی بڑھا دیتے ہیں۔ بعض اوقات دو لفظوں کے بیچ میں نسبت یا تعلق ظاہر کرنے کے لیے (ا) بڑھا دیتے ہیں۔

مرکب الفاظ کی بلحاظِ معنی مولوی عبدالحق نے تقسیم اس طرح کی ہے۔

۱۔ مرکباتِ تابع ۲۔ مرکباتِ ربطی ۳۔ مرکباتِ توصیفی ۴۔ مرکباتِ اعدادی ۵۔ مرکباتِ تمیزی

مرکباتِ تابع میں وہ مرکبات شامل ہیں جن میں الفاظ کا تعلق اسم کی حالت کے تابع ہوتا ہے۔ ان کی مولوی عبدالحق نے تابع مفعولی، تابع ظرفی یا طوری، تابع اضافی قسمیں بتائی ہیں۔ تابع مفعولی میں دوسرا جز اسم

فاعل یا فعل ہوتا ہے اور پہلا جز حالتِ مفعول میں دوسرے کے تابع ہوتا ہے۔ تابع ظرفی یا طوری میں پہلا لفظ دوسرے لفظ سے ظرفی یا طوری تعلق رکھتا ہے۔ تابع اضافی میں پہلا جز دوسرے جز سے اضافی تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح تابع ظرفی میں پہلے لفظ کا تعلق دوسرے سے بہ لحاظِ مقام ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق ربطی مرکبات انہیں کہتے ہیں جن کے پہلے اور دوسرے جز میں حرفِ ربط واقع ہو۔ اس قسم کے فارسی مرکبات بکثرت مستعمل ہیں۔ اکثر اوقات اس قسم کے مرکبات میں حرفِ ربط محذوف ہوتا ہے۔ اسی ذیل میں توابع مہمل بھی آجاتے ہیں اِن الفاظ کے اپنے کچھ معنی نہیں ہوتے لیکن یہ بامعنی الفاظ کے ساتھ آکر ان کے معنوں میں خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ان کے نزدیک مرکباتِ توصیفی وہ ہیں جن میں کوئی صفت یا کوئی لفظ بطور صفت کے دوسرے لفظ سے مل کر آئے اور مرکباتِ اعدادی وہ جن میں پہلا جز عدد ہوتا ہے۔ اسی طرح مرکباتِ تمیزی اردو میں یا تو ہندی علاماتِ نفی کے ساتھ آتے ہیں یا بعض علامات فارسی کے ساتھ بے، بر، بہ وغیرہ کے ساتھ آتے ہیں۔

اس بحث کے آخر میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہاں پر صرف ہندی مرکبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی مرکبات بھی کثرت کے ساتھ اردو زبان اور خاص کر نظم میں مستعمل ہیں جن کا ذکر بخوفِ طوالت نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اس طرح مولوی عبدالحق نے ان مرکبات کا ایک بہت بڑا حصہ بیان کرنے سے نظر انداز کر دیا ہے جو اردو میں مستعمل ہیں جس سے ایک تشنگی باقی رہ گئی ہے۔ اس خوف سے پیچھے ہٹ جانا کہ بات طویل ہوجائے گی، ایک قواعد کو مکمل اور جامع ہونے سے دور لے جاتا ہے۔ پھر یہ کہ مولوی عبدالحق کی مندرجہ بالا بحث سے جو بات سامنے آرہی ہے وہ یہ کہ وہ مرکبات کا بیان کرتے جاتے ہیں اور ان کی مثالیں دیتے جاتے ہیں لیکن یہ وضاحت نہیں کرتے کہ مختلف مرکبات کن وجوہات کی بنا پر بنتے ہیں یہی وجہ ہے مختلف کلیے بتاتے ہوئے وہ بار بار 'بعض اوقات' کی ترکیب دہراتے ہیں اور یہ وضاحت نہیں کرتے کہ 'کن اوقات' یہ کلیہ لاگو ہوتا ہے۔ مرکب الفاظ کی بحث کے آخر میں وہ یہ لکھتے ہیں کہ اگر ان تمام صورتوں کو نظر میں رکھا جائے تو آئندہ جدید الفاظ بنانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح وہ مرکبات کی صورت میں اردو
زبان کے نئے امکانات پر نظر رکھتے ہیں۔

قواعدِ اردو کی فصلِ چہارم نحو کے بارے میں ہے۔ چنانچہ اس باب کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اس باب میں دو امور سے بحث ہوگی۔ اوّل ۔ اجزائے کلام اور اُن کے مختلف تغیرات کے عمل سے، جو اُن میں بہ لحاظ تعداد و حالت و زمانہ وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر چہ اس کا ذکر صرف میں ہو چکا ہے، مگر یہاں یہ بحث دوسری نظر سے یعنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے ہوگی۔ دوم ۔ جملوں کی ساخت سے۔ اوّل کا نام نحوِ تفصیلی ہے اور دوسرے کا ، نحوِ ترکیبی۔'' (۱۲۲)

نحو کی تعریف مولوی فتح محمد جالندھری نے یہ کی ہے:

''نحو وہ علم ہے جس سے اجزائے کلام کو ترکیب دینے اور جُدا جُدا کرنے کا ڈھنگ آتا اور کلمات کے ربط اور باہمی تعلق کا حال معلوم ہوتا ہے اور جس غلطی سے مطلب میں خلل واقع ہو اُس سے کلام کو بچاتا ہے۔'' (۱۲۳)

نحو کے حوالے سے مولوی فتح محمد جالندھری کلام اور اس کی قسموں پر بحث کرتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق نے قواعدِ اردو میں اس قسم کی تقسیم نہیں کی ۔ مولوی فتح محمد جالندھری کے مطابق جب دو یا دو سے زیادہ کلمات ترکیب پائیں تو اُس کو کلام کہتے ہیں ۔ کلام کی قسمیں وہ اس طرح بتاتے ہیں:

''کلام کی دو قسمیں ہیں ۔ ناقص ۔ تام ۔ کلام ناقص وہ مرکب ہے جس سے سننے والے کو پورا فائدہ حاصل نہ ہو۔ یعنی خاطر جمع نہ ہو۔ جیسے زید کی کتاب، خالد کا سبق، سفید کپڑا، ایک سو بیس، اِن کلمات سے سامع فائدہ تام حاصل نہیں کر سکتا اور پورے مطلب کے بیان کا منتظر رہتا ہے ۔ ایسے کلام کو مرکب ناقص بھی کہتے ہیں اور وہ ہمیشہ جز و جملہ ہوتا ہے ۔ کلامِ تام وہ مرکب ہے جس کے سننے سے پورا فائدہ حاصل ہو۔ جیسے ع توفیقِ کارِ نیک ہمیں اے کریم دے '' (۱۲۴)

مولوی عبدالحق نحو تفصیلی میں جنس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو زبان میں پیچیدگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم غیر حقیقی تذکیر و تانیث کے قواعد مرتب کرنے لگتے ہیں ۔ یہ دقت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی قاعدہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس کی بنا پر ہم ایک شے کو مذکر کہتے ہیں اور دوسری کو مونث ۔ یہ بالکل زبان کے عام رواج پر منحصر ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق کے اس بیان کے برعکس اگر ہر لفظ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی اصل تک پہنچا جائے تو ہم حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں اور ان اصول و ضوابط تک رسائی ہوسکتی ہے جن کی وجہ سے غیر حقیقی تذکیر تانیث کی

عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

یہاں پر اردو تذکیرو تانیث کے عام رواج پر تنقید کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ بعض عربی مونث لفظ، جن کی تانیث عربی قاعدے سے بنائی گئی ہے، اُردو میں رائج ہو گئے ہیں جیسے ملکہ، سلطانہ۔ لیکن ہر عربی لفظ کی تانیث کرتے ہوئے ہ بڑھا لینا درست نہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات فارسی اور انگریزی الفاظ کی تانیث بھی اسی اصول پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو غلط ہے۔ مولوی عبدالحق اردو زبان کے جدید تقاضوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''زبان کا رجحان اب اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے اسم یا صفاتی الفاظ مرد عورت دونوں کے لیے یکساں استعمال کیے جائیں مثلاً عالم، فاضل، شاعر، لائق، مصنف وغیرہ الفاظ جس طرح مردوں کے لیے بولے جاتے ہیں، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی استعمال ہونے چاہییں، کچھ ضرور نہیں، کہ عورت کے لیے عالمہ، لائقہ، شاعرہ، مصنفہ کہا جائے۔ ایسا کہنا خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ عام بول چال اور تحریر میں ''بیگم صاحب'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، کیوں نہ دوسرے لفظ بھی اسی طرح بولے یا لکھے جائیں۔'' (۱۲۵)

جانوروں کی تذکیرو تانیث کے انہوں نے تین درجے بیان کیے ہیں۔ ایک عام طریقہ جس میں مذکر کے مقابل مونث ہوتا ہے اور اکثر یہ مذکر ہی سے بنتا ہے۔ دوسرا نر مادہ کے لفظ بڑھانے سے تذکیرو تانیث ہوتی ہے۔ تیسرے کم درجے کے جانور یا کیڑے مکوڑے کہ جن میں تذکیرو تانیث کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔

اردو میں تعداد کا مسئلہ بھی مولوی عبدالحق کے نزدیک کافی مشکل ہے۔ ایک واحد اور ایک سے زیادہ جمع شمار ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات واحد کے لیے جمع کا صیغہ اور جمع کے لیے واحد کا صیغہ بولتے ہیں۔ اردو میں تعداد کے حوالے سے پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو میں تعداد کی صرف دو ہی قسمیں ہیں۔ واحد اور جمع جبکہ بعض زبانوں میں تثنیہ پایا جاتا ہے اور کچھ ایسی بھی ہیں جن میں تثلیث پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک جیسی ایک سے زیادہ چیزوں کے لیے جمع کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں لیکن جب چیزوں میں اختلاف بڑھتا جاتا ہے تو پھر ان کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے لیے دو یا تین کے الفاظ استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ بعض الفاظ واحد استعمال ہوتے ہوئے بھی جمع کا مفہوم دیتے ہیں جیسے جوڑا، درجن وغیرہ۔ اکثر قیمت، وقت، ناپ، تول، سمت کے الفاظ جمع کے موقع پر بھی واحد ہی استعمال ہوتے ہیں۔ بعض اوقات شمار کے لیے گنتی کے خاص لفظ خاص خاص اشیا کے ساتھ ہمیشہ واحد استعمال ہوتے

ہیں ۔ تعظیم یا عظمت کی صورت میں واحد کے لیے جمع کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۔ اسی طرح دام، بھاگ، کرم، نصیب، کوتک، کرتوت، لچھن، درشن، اوسان، مسیں کے لفظ اگر چہ واحد ہیں لیکن زبان کے روزمرہ اور محاورے میں جمع مستعمل ہیں ۔ بعض لفظ اصل میں جمع ہیں لیکن واحد استعمال ہوتے ہیں ۔ جیسے اصول، اخبار وغیرہ ۔ تعدادِ غیر معین کے الفاظ واحد ہوتے ہیں لیکن معنی جمع کے دیتے ہیں ۔ یہی حال مقدار کا ہے ۔ بعض اسما سوائے خاص صورتوں کے ہمیشہ واحد استعمال ہوتے ہیں ۔ ان میں اسمائے کیفیت، اسمائے خاص، اشیائے مادی، دھاتوں اور دیگر معدنیات کے نام، پیداوار میں اکثر غلوں کے نام شامل ہیں ۔ اسی طرح محاورے میں بعض الفاظ جمع استعمال ہوتے ہیں ۔ اردو کے اس مزاج کے باعث اسما کے واحد اور جمع کے طور پر استعمال کا مسئلہ کافی پیچیدگی رکھتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو میں عربی فارسی کے ایسے اسم بھی ہیں جو اردو میں آ کر اردو کے مزاج کے مطابق ڈھل گئے ہیں ۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسم جمع کی بحث میں لکھتے ہیں:

> ''بعض اسما ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر واحد معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں بہت سے اسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں، مثلاً فوج، گروہ، جھنڈ، بھیڑ، سبھا، مجلس، انجمن، قطار، قافلہ، خلقت، طائفہ، مجمع، ریوڑ، گلے وغیرہ ۔ ایسے اسما کو اسم جمع کہتے ہیں ۔
>
> جمع اور اسم جمع میں امتیاز یہ ہے کہ ہر جمع کے مقابلے میں واحد موجود ہوتا ہے لیکن اسم جمع کے مقابلے میں اسم واحد نہیں ہوتا ۔ بعض عربی الفاظ اپنی ساخت کے اعتبار سے جمع معلوم ہوتے ہیں اور عربی میں بطور جمع ہی استعمال ہوتے ہیں لیکن اردو میں ان کو بطور واحد استعمال کرتے ہیں مثلاً اخبار، افواہ، اشراف، املاک، احوال، اصول، اخلاق، اوقات، اولاد، تحقیقات، حوالات، کائنات، موجودات، کرامات وغیرہ ۔ بعض الفاظ جو اصلاً واحد ہیں بطور جمع بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً اوسان، درشن، دستخط، کرتوت، کرم، لچھن، لفظ، نصیب وغیرہ ۔'' (۱۲۶)

اجزائے کلام کے حوالے سے حالت کا بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ حالت کی کیفیت عجیب اور پیچیدہ ہے کیوں کہ ہر زبان میں اس کے متعلق اختلاف ہے ۔ قدیم زبانوں لاطینی، سنسکرت، عربی قدیم انگریزی وغیرہ میں اسم کی ہر حالت کے لیے آخر میں خاص علامت ہوتی ہے جو اسم کا جز ہوتی ہے ۔ ہر حالت کے تغیر کے لیے اس کی ساخت ہی میں تغیر ہو جاتا ہے ۔ اردو میں اسم میں تبدیلی کے بجائے الگ حروف یا لفظ آتے ہیں مثلاً

نے ،کو، کا، کے، کی وغیرہ ۔لفظ کی صورت میں کوئی فرق نہیں آتا اور حالت کے مختلف ہونے پر بھی لفظ کی صورت وہی رہتی ہے ۔البتہ وہ لکھتے ہیں کہ ضمیر کے سلسلہ میں اردو میں بھی وہی صورت ہے جو دوسری قدیم زبانوں میں ہے ۔ چنانچہ مولوی عبدالحق اردو میں اسم کی حالتیں قائم کرنے کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ایک تو ضمیر کی حالت کے حوالے سے اور پھر بلحاظِ معنی اسم کی حالتیں قائم کرنی پڑتی ہیں ۔ان کے مطابق حالت جن چیزوں کو بتاتی ہے وہ یہ ہوسکتی ہیں ۔

۱۔کام کرنے والا	(فاعلی)	۲۔خطاب	(ندائی)
۳۔خبر	(خبری)	۴۔جس پر کام کا اثر ہوا	(مفعولی)
۵۔نسبت	(اضافی)	۶۔مقدار اور پیمائش،طور طریقہ،مکان وزمان وغیرہ	(طوری)

چنانچہ ان صورتوں کو سامنے رکھ کر مولوی عبدالحق نے حالتوں کے تین درجے کئے ہیں ۔درجہ اول کی حالتیں جنہیں انہوں نے اولیت دی ہے وہ فاعلی حالت ، ندائی حالت ،خبری حالت ہیں ۔اس کے بعد کے درجے میں الحاقی (اضافی) حالت اور تیسرے درجے میں تابع یا طوری حالت ،جس میں مکان وزمان ،طور وطریقہ، ذریعہ وغیرہ سب آجاتے ہیں ۔

فاعلی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فاعل یا تو کام کرنے والا ہے یا کام کا سہنے والا ۔انہوں نے 'نے ' کو علامتِ فاعل قرار دیا ہے۔ یہ علامت فاعل کے ساتھ ہر جگہ نہیں آتی بلکہ اس کے استعمال کے مخصوص موقعے ہیں ۔نے دیگر زبانوں میں بطور علامتِ مفعول کے استعمال ہوتا ہے لیکن اردو میں یہ صرف فاعلی حالت کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ اردو نحو کی بحث میں علامتِ فاعل نے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

> ''یہ حرفِ عاملہ فعل متعدی کے فاعل کے ساتھ ملحق ہو کر کلام میں ربط پیدا کرتا ہے ۔'' (۱۲۷)

مولوی عبدالحق نے اس کے استعمال کے یہ موقعے بتائے ہیں ۔نے ،علامت فاعل صرف فعل متعدی کے ماضی مطلق تمام ، احتمالی اور حال قریب کے ساتھ آتا ہے البتہ لانا ، بھولنا ، شرمانا ، بکنا ، بولنا متعدی افعال اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں ۔بعض متعدی افعال ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ 'نے ' کا استعمال ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا مثلاً جیتنا اور ہارنا ۔بعض افعال لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں ۔متعدی ہونے کی صورت میں '' نے'' علامتِ فاعل فعل کے ساتھ استعمال ہوتی ہے اور لازم کی حالت میں نہیں ۔مثلاً پکارنا ۔ چاہنا کے ساتھ ہمیشہ نے آتا ہے لیکن جب جی اور دل کے ساتھ استعمال ہوں تو نہیں آتا ۔اس حوالے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں :

> ''اُردو کے بعض مصادر لازم و متعدی دونوں طرح آتے ہیں۔ جب اس طرح کے مصادر لازم کے معنوں میں آئیں گے تو علامت فاعل نہیں لائیں گے؛ مثلاً وہ بدلا، وہ پکارا۔ لیکن جب متعدی کے معنوں میں بولیں گے تو نے لائیں گے؛ مثلاً اس نے کپڑے بدلے، اُس نے مجھے پکارا۔'' (۱۲۸)

اس بحث کے آخر میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ نے کا ایک غلط استعمال رواج پا گیا ہے جس کا ارتکاب بعض قابل اور مستند ادیب (خاص کر پنجاب کے) کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً یہ میں نے دیکھا ہوا ہے۔ یہ تقریر میں نے سنی ہوئی ہے۔ یہ کتابیں میں نے پڑھی ہوئی ہیں۔ صحیح استعمال اس طرح ہے۔ یہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ یہ تقریر میری سنی ہوئی ہے (یا میں سن چکا ہوں) یہ کتابیں میری پڑھی ہوئی ہیں (یا میں پڑھ چکا ہوں)۔ مولوی عبدالحق نے یہاں پر نے کا غلط اور پھر اس کا صحیح استعمال لکھ تو دیا لیکن اس کی وضاحت نہیں کی۔ ان کا قواعدِ اردو میں کئی مواقع پر یہی انداز ہے کہ وہ وضاحت کے بغیر استعمال لکھ دیتے ہیں۔

ندائی حالت کے بارے میں مولوی عبدالحق کے بقول کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اکثر زبانوں میں فاعلی اور ندائی حالتیں یکساں ہوتی ہیں۔ ندائی حالت میں اسم بطور مخاطب کے استعمال ہوتا ہے اور جملے سے الگ تھلگ نظر آتا ہے یا بذاتِ خود ایک جملہ ہوتا ہے۔ ندائی حالت اکثر حروفِ ندا کے ساتھ آتی ہے۔

مفعولی حالت کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ مفعول وہ ہے جس پر فاعل کا اثر پڑے۔ مفعول درحقیقت فعل متعدی کے تکملے کا کام دیتا ہے۔ جب فعل کا ایک ہی مفعول ہو اور ذی عقل ہو تو مفعول کے ساتھ (کو) آتا ہے لیکن اگر مفعول غیر ذی عقل یا بے جان اشیا میں سے ہے تو اس کے ساتھ (کو) علامتِ مفعول نہیں آتی۔ ضمیر میں فاعلی اور مفعولی حالتیں معین ہیں ان میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ مگر محاورات میں جہاں مفعول مصدر کے ساتھ آتا ہے ''کو'' لانا غیر فصیح ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب عمومیت ہوتی ہے تو ''کو'' نہیں آتا، لیکن جب خصوصیت کا اظہار کیا جاتا ہے یا توجہ دلانی مقصود ہو تو ''کو'' بولتے یا لکھتے ہیں۔ لیکن یہ غیر ذوی العقول اور بے جان اشیا کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض افعال کے ساتھ فعل کے اسی مادے کا مفعول قریب استعمال ہوتا ہے۔ جسے عربی میں مفعولِ مطلق کہتے ہیں۔ مثلاً تم کیسی چال چلتے ہو۔ بعض افعال معتدی المتعدی کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص ہوتا ہے دوسرا شے۔ مفعولِ شخصی کے ساتھ ہمیشہ ''کو'' آتا ہے۔ اگرچہ کو عام طور پر علامتِ مفعول ہے لیکن بعض اوقات سے، کے اور پر بھی کو کی بجائے علامتِ مفعول کے طور پر

استعمال ہوتے ہیں۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کو، سے،تک، ے، یں کوعلاماتِ مفعول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مذکورہ بالا علامات مفعول میں سے اول الذکر 'کو' بکثرت مستعمل ہے اور یہ علامت صرف بطور علامت مفعول ہی آتی ہے، جب کہ دیگر علامات دیگر حیثیتوں سے بھی مستعمل ہیں ۔'سے' اور 'تک' اکثر بطور حرفِ جار مستعمل ہیں مگر کبھی بطور علامت مفعول بھی لاتے ہیں ۔ حروف ے (یائے مجہول) اور یں (یائے مجہول و نون غنہ) بعض ضمیروں کے ساتھ بطور علامت مفعول لاتے ہیں اور ان کا استعمال دیگر حیثیتوں (مثلاً بطور علاماتِ جمع) بھی کیا جاتا ہے۔'' (۱۲۹)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اردو کے بعض مصادر ایسے ہیں جن کے ساتھ فاعل مفعول کی صورت میں آتا ہے۔مثلاً مجھے جانا پڑا۔اس صورت میں فاعل اگر چہ مفعولی حالت میں نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں فاعل ہی ہوتا ہے۔یہ زبان کا روزمرہ ہے،اس میں کسی قاعدے کا دخل نہیں ۔یہ عموماً پڑنا اور ہونا کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں ضرورت یا مجبوری کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

خبری حالت کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہ جو اسم جملے میں کسی فعل یا واقعے کی خبر دیتا ہے وہ خبری حالت میں ہوتا ہے۔ جو لفظ فعل کے ساتھ خبری حالت میں آئے وہ فعل کے معنوں میں تکمیل کرتا ہے۔بعض افعال اپنے مفہوم کے لحاظ سے خبری حالت کے لیے خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں ان میں سب سے بڑھ کر ''ہونا'' ہے۔

اضافت کے معنی نسبت کے ہیں ۔کسی لفظ کی اضافی حالت اس لفظ کے تعلق کو دوسرے لفظ سے ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے مطابق اردو میں اضافی حالت مختلف قسم کے تعلقات کو ظاہر کرتی ہے۔ملک یا قبضہ ظاہر کرنے کے لیے، رشتے داری یا قرابت کے اظہار کے لیے، مادی اشیا کے بیان کے لیے،ظرفِ مکان وزمان کے لیے، کیفیت یا قسم کے ظاہر کرنے کے لیے،سبب یا علت کے لیے،اصل و ماخذ کے اظہار کے لیے، وضاحت کے لیے، عمر کے لیے،استعمال کے لیے، قیمت کے اظہار کے لیے،تشبیہ کے لیے،استعارے کے لیے،ادنیٰ کے لیے،صفت کے لیے،کُل کے جز کے لیے، فاعل یا مفعول کے اظہار کے لیے اضافت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ مولوی عبدالحق نے یہ بیان کیا ہے اور مختلف مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً ایک فقرہ 'احمد نے اس کے تھپڑ مارا' لکھا ہے ان کے مطابق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے فقروں میں

درمیان میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے۔ اس فقرے میں منہ کا لفظ محذوف ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے مطابق کو اور کے کی اصل ایک ہے اس قسم کے فقروں میں جو کے آتا ہے وہ بجائے کو کے ہے۔

اسم کی حالت کے تیسرے درجے میں مولوی عبدالحق نے طوری حالت کو بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک طوری حالت کی کئی قسمیں ہیں۔ اس میں زمان اور مکان (ظرف)، پیمائش، وزن، قیمت، طریقہ، مقابلہ، ذریعہ یا آلہ وغیرہ کی تمام حالتیں آجاتی ہیں۔

نحو کی بحث میں صفت کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ صفت جب کبھی اسم کی کیفیت یا حالت بیان کرتی ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ توصیفی اور خبری۔ اردو میں صفات اکثر اسماء کی طرح استعمال ہوتی ہیں اور جس طرح اسما کی آخری علامت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے ان میں بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض اسم بھی صفت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ بعض اوقات صفات تمیز کا کام دیتی ہیں۔ صفاتِ عددی میں 'ایک' کے بطور صفت استعمال پر مولوی عبدالحق نے بحث کی ہے۔ کبھی یہ کسی کے معنوں میں آتا ہے۔ اسی طرح ایک معین اعداد کے ساتھ آکر غیر معین کے معنے دیتا ہے۔ جیسے بیس ایک آدمی بیٹھے تھے۔ کبھی کل یا سارے کے معنوں میں آتا ہے اور کبھی اکیلے اور تنہا کے معنوں میں آتا ہے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے صفت کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض اوقات ایک اسم صفت ایک اسم ذات کے ساتھ اور معنی دیتا ہے اور دوسرے کے ساتھ اور معنی دیتا ہے جو اکثر پہلے کی ضد ہوتے ہیں۔ مثلاً چالاک گھوڑا میں صفت گھوڑے کے حق میں ہے اور اس کی تیز رفتاری کو ظاہر کرتی ہے جبکہ چالاک آدمی میں صفت موصوف کو دغاباز اور خائن ٹھہراتی ہے۔ (۱۳۰) نحو کی بحث میں ضمیر کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ضمیر جنس و تعداد میں اس اسم سے مطابق رکھتی ہے جس کے لیے وہ استعمال ہوتی ہے۔ البتہ تعظیم کے موقع پر اگرچہ اسم واحد ہوتا ہے لیکن ضمیر جمع استعمال ہوتی ہے۔ ضمائر استفہامیہ کی تعداد انہوں نے دو بتائی ہے۔ کیا اور کون۔ اس حوالے سے انہوں نے استفہام کی مختلف قسموں کا ذکر کیا ہے۔ بعض اوقات یہ محض استفسار کے لیے استعمال ہوتا ہے اُسے استخباری کہتے ہیں۔ اسی طرح انکاری، اقراری، تجاہل، بھی استفہام کی قسمیں ہیں۔ ضمائرِ تنکیری میں کچھ اور کوئی شامل ہیں۔ اسی طرح جتنا، اِتنا، اُتنا، ایسا، جیسا، ویسا، کیسا یہ الفاظِ ضمیری ہیں اور بطور صفت مستعمل ہیں یہ تمیز کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضمائرِ شخصی کبھی کبھی صفت کا کام دیتی ہیں خصوصاً جب 'ہی' کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں۔ ضمیر کے حوالے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں:

''اگر ضمیریں صرف واحد یا صرف جمع ہوں تو حاضر کو غائب پر اور متکلم کو سب پر ترجیح

ہوتی ہے۔آج کل اس ترتیب کا خیال گفتگو تو کیا تحریر میں کم رکھا جاتا ہے۔لیکن فصیح یہی ہے کہ اس کا لحاظ رکھا جائے۔''(۱۳۱)

فعل کے بارے میں مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ یہ زبان کی جان اور جملے کے بنانے میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔تقریباً ہر جملے میں فعل آتا ہے اور ایسی صورتیں شاذ ہوتی ہیں جہاں جملہ بغیر فعل پورا ہوتا ہے۔البتہ کہاوتوں اور نظم میں یا اخبارات اور مضامین کے عنوانات میں جملے بغیر فعل کے بھی آتے ہیں۔اسی طرح مصدر اور حالیہ کا شمار بھی افعال میں ہے لیکن یہ تکمیلِ فعل کا کام نہیں دیتے۔مصدر اکثر اسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور حالیہ بطور صفت۔

مصدر کے مختلف استعمال مولوی عبدالحق نے بیان کیے ہیں اور مثالوں کے ذریعے ان کی وضاحت کی ہے۔ان میں صدر کا بطور فاعل، مفعول استعمال، حرفِ اضافت کے ساتھ استعمال، امر کے معنوں میں استعمال، حرفِ ربط کے ساتھ استعمال اور مصدر کی تذکیر و تانیث کو بیان کیا ہے۔

حالیہ کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس کی تین قسمیں بتائی ہیں۔حالیہ تمام، ناتمام اور حالیہ معطوفہ۔تمام میں فعل کا ختم ہونا پایا جاتا ہے جبکہ ناتمام میں فعل ختم نہیں ہوتا۔حالیہ کو استعمال کے لحاظ سے انہوں نے مزید دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ایک بطور صفت اور دوسری بطور خبر۔صفت کی بحث وہ پہلے کر چکے ہیں چنانچہ یہاں پر انہوں نے حالیہ کے بطور خبر استعمال کی وضاحت کی ہے۔ان کے مطابق یہ بھی صفت ہے لیکن اسم کے ساتھ نہیں آتی۔اس کے بعد حالیہ کی اس صورت میں استعمال کے وقت جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ان کو بیان کیا ہے۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ اس حوالے سے لکھتے ہیں حالیہ کی ایک تیسری حیثیت اس کی اپنی خاص حال کی حیثیت ہے:

> ''مولوی عبدالحق نے بلحاظ استعمال حالیہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ایک بطور صفت دوسری بطور خبر۔مگر حالیہ کی ایک اپنی حیثیت حال کی بھی ہے۔۔۔یعنی کسی مسند الیہ کی حالت بیان کرنے کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔مثلاً وہ دوڑتا ہوا آیا، بھیگتا ہوا گھر پہنچا، میں تیرتا ہوا آگے نکل گیا۔''(۱۳۲)

حالیہ معطوفہ کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔اس کا تعلق ہمیشہ جملے کے اصل فعل سے ہوتا ہے۔چونکہ اس میں حرفِ عطف کا بچاؤ ہے اور حرفِ عطف کے معنے اس میں شریک ہوتے ہیں اس لیے حالیہ معطوفہ کہلاتا ہے۔اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ہمیشہ ظاہر کرتا ہے کہ جملے کے اصل فعل

سے جس کام کا اظہار ہوتا ہے اس سے پہلے ایک کام ہو چکا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اسم فاعل کی وضاحت کی ہے جو ان کے مطابق فعل سے بنتا ہے اور اس کے معنے کام کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ اسم فاعل عموماً مصدر کے بعد والا یا ہار (ہارا) بڑھانے سے بنتا ہے۔ بعض اوقات صرف اسم کے ساتھ والا آتا ہے اور فعل محذوف ہوتا ہے۔

زمانے کی تین قسمیں ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ اسی حوالے سے فعل کی تین حالتیں ہوں گی۔

ا۔کام جو ابھی شروع نہیں ہوا۔ ۲۔کام جو شروع ہوا لیکن ختم نہیں ہوا۔ ۳۔کام جو ختم ہو چکا۔

اس تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے مضارع اور امر کی مزید وضاحت کرتے ہیں:

> ''اس تقسیم کے لحاظ سے ایک قواعد نویس جو فلسفی دماغ رکھتا ہے مضارع اور امر کو شق اول یعنے مستقبل کے تحت میں رکھے گا۔ کیوں کہ ان دونوں میں فعل زمانہ حال میں شروع نہیں ہوتا بلکہ زمانہ آئندہ میں ہوتا ہے۔ لیکن جب زبان کی ساخت اور نشو ونما پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فعل کی دو بلکہ تین قسمیں ہیں۔ اول سادہ، دوم وہ جو محض حالیہ سے بنتے ہیں یا حالیہ کے ساتھ کسی قدیم فعل کا کوئی جز لگا ہوتا ہے جو مل کر جز و فعل ہو جاتا ہے، سوم مرکب فعل۔'' (۱۳۳)

سب سے پہلے انہوں نے مضارع کو بیان کیا ہے۔ اس کو انہوں نے قدیم فعل حال کہا ہے جس میں اب تک اصل کی جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں وہ صریح طور پر حال کے معنے نہیں دیتا بلکہ اس کے معنوں میں کسی قدر ابہام پایا جاتا ہے۔ یہ خاص طور پر اردو میں زمانہ مستقبل شرطیہ کے لیے مخصوص ہے، یہی وجہ ہے ان کے بقول اسے عربی مضارع کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ قدیم ہندی میں یہ حال کے معنی بھی دیتا ہے جو ہندی بول چال اور ضرب المثال سے آج بھی واضح ہے یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے اسے حال سے متعلق کہا ہے اور اس کا بیان افعال میں سب سے اول کیا ہے۔ جہاں تک اردو میں مضارع کے استعمال کا تعلق ہے یہ دو طرح کا ہے ایک شرطیہ اور دوسرا احتمالی جو اکثر مستقبل کے اور خبریہ معنے دیتے ہیں۔ مضارع کا اصل استعمال مولوی عبدالحق یہ بیان کرتے ہیں کہ معروف امثال اور روزمرہ کے فقروں میں یہ عموماً حال کے معنے دیتا ہے۔ مثلاً کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ اسی طرح جن فقروں میں امکان، اجازت، شرط و جزا، دعا یا تمنا، شبہے یا اضطراب کا اظہار، تعجب اور افسوس، اظہارِ توقع پایا جائے تو وہاں پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

مضارع کے بعد دوسرا فعل جو مولوی عبدالحق کے مطابق مادۂ فعل ہے وہ امر ہے۔ یہ مضارع سے بہت مشابہ ہے کیونکہ سوائے حاضر کے صیغوں کے باقی تمام صیغے وہی ہیں جو مضارع کے ہیں۔ یہ عام طور پر حکم اور ممانعت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ امتناعی صورت میں امر کے ساتھ نہ اور مت آتے ہیں۔ مت میں نہی یا امتناع تاکیدی ظاہر ہوتا ہے۔

مستقبل کے متعلق یہاں پر صرف کے بیان پر مزید اضافہ مولوی عبدالحق نے یہ کیا ہے کہ مستقبل مطلق میں زمانہ آئندہ کا علم تحقیقی ہوتا ہے یا ایسا سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ مضارع میں احتمالی یا شرطی ہوتا ہے اور امر میں امکانی۔

فعل حال مطلق کسی ایسے کام کو جو اس وقت ہو رہا ہوتا ہے ظاہر کرتا ہے اور موجودہ حالات کا اس سے اظہار ہوتا ہے لیکن مولوی عبدالحق اس کی مزید وضاحت کی ہے کہ اس سے ضمناً زمانہ حال کے متعلق دوسرے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً عادت و تکرار، عام امورِ صداقت کا بیان، اسی طرح مستقبل قریب کے معانی کو بھی یہ ظاہر کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے کام کو بھی ظاہر کرتا ہے جو زمانہ گزشتہ میں شروع ہو کر تا حال جاری ہے یا ایسا کام جو زمانی حال میں پورا ہو چکا ہے۔

ماضی مطلق ایسے فعل کو ظاہر کرتی ہے جو زمانہ گزشتہ میں بلا تعینِ وقت ہو مگر مولوی عبدالحق کے مطابق علاوہ اس کے محاورے میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوتی ہے مثلاً بعض اوقات حال کے بجائے، حالِ مطلق کے بجائے، مستقبل کے بجائے، ماضی ناتمام کے بجائے اور ماضی تمام کے بجائے۔

حالِ احتمالی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ جس میں وہ آتا ہے۔ جیسے شاید وہ ایسا سمجھتا ہو۔ حالِ احتمالی کی یہ صورت ایسے مواقع پر تشبیہ کے لیے استعمال ہوتی ہے جہاں واقعی اور حقیقی حالت نہ ہو بلکہ فرضی ہو۔ جیسے وہ اس طرح سے چلا آ رہا ہے جیسے کوئی بجا رآتا ہے۔ بعض اوقات حالِ احتمالی ماضی کے معنی بھی دیتا ہے۔ حالِ شرطیہ درحقیقت مضارع ہے لیکن مضارع میں اور حالِ شرطیہ میں فرق ہے کہ مضارع سے امکانی حالت معلوم ہوتی ہے اور حال سے واقعی۔

ماضی احتمالی میں احتمال پایا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فعل کی تکمیل کے متعلق گمان غالب ہوتا ہے۔ جبکہ ماضی شرطیہ میں شرط کے ساتھ ایک ایسے فعل کا اظہار ہوتا ہے جو وقوع میں نہیں آیا۔ جیسے اگر تم اس سے اس کا ذکر کر دیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اس ماضی میں عموماً دو جملے ہوتے ہیں ایک شرط اور دوسرا جزا۔ بعض اوقات فعل سے آرزو اور تمنا کا بھی اظہار ہوتا ہے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اسی لیے بعض قواعد نویس اسے ماضی تمنائی بھی کہتے ہیں۔

طورِ مجہول کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کہ فاعل نا معلوم ہو یا خاص طور پر اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ اگر چہ یہ اکثر فعل متعدی سے مخصوص ہے مگر بعض اوقات یہ صورت فعل لازم کے ساتھ بھی آتی ہے۔ مثلاً اس سے جا کر آیا نہ گیا۔

مولوی عبدالحق نے کوشش کی ہے کہ جو باتیں قواعدِ اردو کے حصہ صرف میں بیان ہو چکی ہیں ان کو دہرایا نہ جائے سوائے ضروری امور کے چنانچہ افعال کے تعدیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تعدیہ افعال کی مفصل بحث حصہ صرف میں ہو چکی ہے۔ یہاں کسی امر کے خاص طور پر بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' (۱۳۴)

افعالِ مرکب کی بحث میں وہ امدادی فعل کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر چہ اس میں بھی وہ لکھتے ہیں کہ امدادی فعل کا مفصل ذکر صرف کے حصہ میں ہو چکا ہے۔ یہاں پر اس بارے میں چند امور کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً افعالِ مرکب تاکیدی میں جب امدادی فعل لازم اور خواہ اصل فعل متعدی کیوں نہ ہو، مرکب فعل کی صورت زمانہ نا تمام میں لازم کی سی ہوگی اور فاعل کے ساتھ 'نے' استعمال نہ ہوگا۔ جیسے وہ مٹھائی کھا گیا یا کھا چکا۔ مزید انہوں نے سکنا اور چاہنا کے استعمال کی وضاحت کی ہے۔

تمیز کے حوالے سے بھی مولوی عبدالحق یہ لکھتے ہیں کہ اس کا بیان صرف میں ہو چکا ہے۔ نحو میں انہوں نے چند تمیزیں اور ان کا استعمال مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ تمیزیں ہیں کہاں، کہیں، جہاں جہاں، اِدھر اُدھر، یوں، پرے، ویسے، ہی، سہی، تو، کہ، بھی، خیر، اچھا، بھلا، بارے، کیوں، کبھی، بلا سے، آگے، ہو نہ ہو۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ بعض اوقات حالیہ معطوفہ بھی تمیز کا کام دیتا ہے اور بعض اوقات اسم اور صفت بھی تمیز کا کام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی، فارسی، عربی کے چھوٹے چھوٹے فقرے جو حروف کے ساتھ دو دو تین تین الفاظ سے مل کر بنتے ہیں، تمیز کا کام دیتے ہیں جیسے کم سے کم، زیادہ سے زیادہ، بیٹھے بٹھائے وغیرہ۔

حروفِ ربط کے حوالے سے بھی وہ لکھتے ہیں کہ ان کا تفصیلی بیان صرف کے حصے میں کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں پر انہوں نے بعض حروفِ ربط کا صرف استعمال بتایا ہے۔ ان حروفِ ربط میں میں، سے، تک، پر، آگے اور ساتھ شامل ہیں۔

حروفِ عطف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دو لفظوں یا دو جملوں کو ملانے کے لیے 'اور' عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات حالیہ معطوفہ اس کی ضرورت کو رفع کر دیتا ہے اور وہ زیادہ فصیح ہوتا ہے مثلاً وہ کل ہی

مجھ سے مل کر واپس گیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ حروفِ عطف کی اصطلاح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ اپنے مفہوم میں وسعت بھی رکھتی ہے اور کلماتِ عطف کی ایک خاص قسم کے لیے بھی مستعمل ہے یعنی اس سے خاص جمعیت و شرکت یا وصل ظاہر کرنے والے حروف بھی مراد ہوتے ہیں اس لحاظ سے انہوں نے حروفِ عطف یہ قرار دیے ہیں: اور، و، کر، کے، پھر۔ جبکہ معنوی اعتبار سے وہ کلماتِ عطف کی درج ذیل قسمیں بتاتے ہیں:

''معنوی اعتبار سے کلماتِ عطف کی آٹھ قسمیں ہیں: (۱) حروفِ عطف (۲) حروفِ تردید (۳) حروفِ اضراب (۴) حروفِ استدراک (۵) حروفِ استثنا (۶) حروفِ بیان (۷) حروفِ شرط و جزا (۸)۔ حروفِ علت۔ یہ سب حروف اس وقت استعمال کیے جاتے ہیں جب کہ مفرد کلموں یا مرکب جملوں کو ایک حالت یا ایک حکم میں جمع کرنا ہو۔'' (۱۳۵)

مولوی عبدالحق نے اگرچہ ان کلماتِ عطف کی باقاعدہ طور پر فہرست نہیں دی لیکن اپنے اپنے مقام پر ان میں سے اکثر کی وضاحت کی ہے۔ حروفِ عطف کے حوالے سے وہ مزید لکھتے ہیں کہ ہندی کا 'اور' اور فارسی کا 'و' دونوں ایک ہی معنی میں آتے ہیں لیکن استعمال میں یہ فرق ہے کہ 'و' صرف فارسی عربی الفاظ کے ساتھ آتا ہے، ہندی الفاظ کے ساتھ اس کا استعمال خلافِ فصاحت کیا جاتا ہے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے ہندی الفاظ کے ساتھ واؤ عطف کے استعمال کی مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح اس کا استعمال جائز ہے۔ مشہور مصنفین کی مثالیں دینے کے بعد وہ اس واؤ کو پراکرت کا واؤ قرار دیتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ وہ واؤ عطف کو خوب پہچانتے تھے اور فصاحت کی شرطیں جو علمِ معانی میں دی گئی ہیں انہیں معلوم تھیں۔ انہوں نے فارسی کا واؤ عطف نہیں لکھا بلکہ پراکرت کا واؤ لکھا ہے'' (۱۳۶)

لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ پنڈت دتاتریہ کیفی کی اس بات کو درست تسلیم نہیں کرتے اور وہ مولوی عبدالحق کی حمایت کرتے ہیں۔ (۱۳۷)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ بعض اوقات 'نیز' بھی 'اور' کے معنوں میں آتا ہے۔، نہ، نہ۔۔۔نہ، یا، یا۔۔۔یا، خواہ، چاہے اور کہ بھی حروفِ تردید کا کام دیتے ہیں۔ حروفِ عطف شرطیہ میں جو، جب، تب، نہیں تو، وگرنہ اور ورنہ شامل ہیں۔ اسی طرح گو، اگرچہ، مگر، لیکن، بلکہ، پر، استدرا کی معنوں میں آتے ہیں۔ ان کے استعمال کی مولوی عبدالحق نے تین حالتیں بیان کی ہیں۔

۱۔قول ماقبل کی مخالفت ۲۔اس میں تغیر بوجہ توسیع معانی ۳۔قولِ ماقبل کے محدود کرنے کے لیے

حروفِ عطف جو استثنا کے لیے آتے ہیں ان میں مولوی عبدالحق نے الا، مگر اور لیکن کو شامل کیا ہے۔
اسی طرح حروفِ علت سبب ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں کہ، کیوں کہ، اس لیے کہ، اس واسطے کہ، تا کہ، لہذا شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان حروف کے استعمال کی مختصراً مثالوں سے وضاحت کی ہے لیکن نحو کے بیان میں ان کا مجموعی طور پر انداز یہی ہے کہ اختصار سے کام لیتے ہیں اور جو باتیں حصہ صرف میں بیان ہو چکی ہیں ان کو دہرانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ حروفِ عطف ہی کی بحث میں انہوں نے جیسا (جیسے) اور گویا کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بعض اوقات عطف کا کام دیتے ہیں اور صرف تشبیہ یا مقابلے کے لیے آتے ہیں۔

'کہ' حرفِ بیانیہ ہے۔ یہ ہمیشہ دو جملوں کو ملانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ جب یہ ضمیرِ موصولہ کے بعد آتا ہے یا 'جب' کے ساتھ آتا ہے تو یہ دونوں صورتوں میں حرفِ بیانیہ نہیں ہوتا۔ حروفِ تخصیص کے بیان میں وہ لکھتے ہیں کہ اس حوالے سے 'ہی' کا مفصل ذکر پہلے ہو چکا ہے یہاں پر انہوں نے 'تو' کا ذکر کیا ہے۔ اس کا استعمال تاکیدِ فعل کے لیے، تکمیلِ مقصد کے لیے، خاص قسم کا زور پیدا کرنے کے لیے یا دھمکی کے لیے ہوتا ہے۔

مولوی فتح محمد جالندھری نے حروف اور ان کے استعمال کے لیے 'مصباح القواعد' میں ایک الگ فصل قائم کی ہے جس میں ان حروف کی تفصیل دی گئی ہے: جر کے حرف، عطف کے حرف، اضراب کے حرف، تردید کے حرف، استدراک کے حرف، استثناء کے حرف، اضافت کے حرف، نفی کے حرف، بیان کے حرف، علت کے حرف، شرط کے حرف، جزا کے حرف، شمول و شرکت کے حرف، حصر و خصوصیت کے حرف، قسم کے حرف، تاکید کے حرف، تنبیہ کے حرف، مثال کے حرف، تشبیہ کے حرف، استفہام کے حرف، مقدار کے حرف، ندا کے حرف، جواب یا ایجاب کے حرف، ندبہ و تاسف کے حرف، ظرفیت کے حرف، حرفِ تفسیر، حرفِ تفریع، حرفِ تسلسلِ کلام، شک و ظن کے حرف، ظنِ غائب کے حرف، حرفِ مفاجات، تمنا کے حرف، تحسین و آفرین کے حرف، نفرین کے حرف، نفرت کے حرف، رنج و بیتابی کے حرف، تزئینِ کلام کے حرف، تہنیت کے حرف، توبہ و امان و پناہ کے حرف، حروفِ تعجب، حروفِ انبساط۔(۱۳۸)

نحو تفصیلی کی بحث کے آخر میں مولوی عبدالحق نے تکرارِ الفاظ کے عنوان کے تحت تکرارِ لفظی کو اردو زبان کی بہت بڑی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر انہوں نے علیحدہ سے کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے

ہیں:

''اردو میں تمام اجزائے کلام (یعنے اسم، صفت، ضمیر، فعل، تمیز) سوائے حروفِ ربط وعطف کے ایک ہی ساتھ مکرر استعمال ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کے دُہرانے سے اکثر 'ہر ایک' کے معنے پیدا ہوتے ہیں۔ نیز اختلاف، زور، تاکید یا مبالغے کا اظہار ہوتا ہے۔'' (۱۳۹)

نحوِ ترکیبی کے سلسلے میں انہوں نے جملوں کی ساخت پر بحث کی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے جملوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ مفرد جملے اور مرکب جملے۔ چنانچہ پہلے وہ مفرد جملے اور ان کے اجزا کو بیان کرتے ہیں۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح انہوں نے اردو میں جملے کے اصل عنصر دو بتائے ہیں۔ مبتدا اور خبر۔ مبتدا وہ شخص یا شے ہے جس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جبکہ خبر، جو کچھ اس شخص یا شے کی نسبت ذکر کیا جائے۔

کلام کے درج ذیل اجزا کو مولوی عبدالحق نے مبتدا قرار دیا ہے:

۱۔اسم یا ضمیر فاعلی حالت میں　　۲۔دو یا دو سے زائد اسم یا ضمیریں فاعلی حالت میں

۳۔صفت یا اعداد بطور اسم کے فاعلی حالت میں　　۴۔مصدر　　۵۔کوئی فقرہ یا جملہ

مولوی عبدالحق نے مبتدا کے بارے میں مندرجہ بالا تفصیل درج کرنے کے بعد 'مثالیں' عنوان دے کر اس کی وضاحت کی ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے وضاحت کی ہے کہ جیسا کہ اور زبانوں میں ہے اسی طرح اردو میں بھی مبتدا اور خبر کی توسیع مختلف الفاظ کے اضافے سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ از روئے قواعد ان کے متعلقات ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کی توسیع ہوتی ہے اسی طرح الفاظ کے اضافے سے بعض اوقات ان کے معنی محدود بھی ہو جاتے ہیں۔

مطابقت کی بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ مطابقت تین قسم کی ہوتی ہے۔

۱۔　صفت کی (جو توصیفی ہو) اپنے اسم سے۔　　۲۔　صفت کی (جو جزو خبر ہو) اسم سے۔

۳۔　جملے کی خبر کی (خواہ فعل ہو یا صفت) مبتدا سے۔

صفت کی مطابقت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سوائے ان صفات کے جن کے آخر میں ا ہوتا ہے اور جن میں تبدیلی واقع ہوتی ہے باقی تمام صفات ہر حالت میں ویسی ہی رہتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی اور صفت موصوف کے مطابق ہوتی ہے۔ اسی طرح حرفِ اضافت کی تذکیر و تانیث و وحدت و جمع عموماً مضاف کے مطابق ہوتی ہے۔ جب ایک صفت کئی مختلف الجنس اسما کی تعریف کرے یا ان کے ساتھ آئے تو مطابقت میں اختلاف ہوتا

ہے۔ اس وقت صفت قریب کے اسم کے مطابق آتی ہے البتہ بعض اوقات اگر چہ قریب تر مونث اسم ہو لیکن صفت مذکر جنس کے مطابق آتی ہے، وجہ اس کی مذکر کا قوی تر جنس ہونا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں:

''صفت کی تذکیر و تانیث، وحدت و جمع موصوف کے مطابق ہوتی ہے مگر جب موصوف جمع مونث ہو تو صفت واحد آتی ہے۔ جیسے اونچی دیواریں، اونچا محل۔ لیکن جب موصوف جمع کو حذف کر کے صرف صفت استعمال کرتے ہیں تو صفت جمع لاتے ہیں جیسے، بروں سے بچو۔ نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔'' (۱۴۰)

مولوی عبدالحق نے مطابقت کے مختلف اصولوں کی مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔ جہاں پر انہوں نے کوئی کمی محسوس کی ہے یا مزید سہولت کے لیے کوئی ترمیمی ضرورت محسوس کی ہے تو اپنی رائے ضرور دی ہے مثلاً ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ جب رشتے کے دو اسم بلا حرفِ عطف آتے ہیں تو خواہ وہ واحد ہوں لیکن ان کے ملنے سے چونکہ جمع کی صورت پیدا ہو رہی ہوتی ہے اس لیے دوسرا لفظ باوجود واحد ہونے کے جمع کی صورت میں آتا ہے اور فعل کو بھی اس سے مطابقت لازم ہوتی ہے۔ لیکن دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب جمع کی حالت میں بھی یوں ہی بولتے ہیں اور اس لیے واحد اور جمع میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ ''چچا بھتیجے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں'' تو اگر ایک بھتیجا ہے تو بھی یونہی کہیں گے اور ایک سے زیادہ ہیں تو بھی یوں ہی۔ مگر عام طور پر واحد ہی مقصود ہوتا ہے۔ یہاں پر انہوں نے رائے دی ہے کہ جب مراد جمع ہو تو حرف عطف 'اور' لانا چاہیے۔ مثلاً جب کہیں ''چچا بھتیجے بیٹھے حقہ پی رہے تھے'' تو اس سے مراد واحد ہو۔ لیکن جب تخصیص کے ساتھ بھتیجوں کا جتانا مقصود ہو تو یوں کہنا چاہیے کہ'' چچا اور بھتیجے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں'' اس میں کسی قدر تکلف تو ہے مگر ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

مرکب جملوں کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ جب دو یا دو سے زیادہ جملے مل کر کسی ایک مفہوم یا خیال کو ادا کریں تو وہ مرکب جملہ کہلائے گا۔ یہ جملے دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ ہم رتبہ جملے اور تابع جملے۔ اگر یہ جملے نحوی لحاظ سے جداگانہ اور برابر کی حیثیت رکھتے ہوں تو ایسے جملوں کو ہم رتبہ جملے کہتے ہیں۔ اگر کوئی جملہ دوسرے جملے کے مقابلے میں برابر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ دوسرے کے تحت میں ہے تو ایسے جملے کو تابع جملہ کہتے ہیں۔

مولوی فتح محمد خاں جالندھری نے مصباح القواعد میں مرکب جملوں کے تحت ان جملوں پر تفصیلی بحث کی ہے: جملہ معطوفہ یا عاطفہ، جملہ شرطیہ، جملہ معللہ، جملہ ندائیہ، جملہ قسمیہ، جملہ مندوبہ، جملہ تفسیریہ، جملہ تشبیہہ، جملہ تمثیلیہ، جملہ مدالمہ، جملہ مسانفہ۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ہم رتبہ جملے حروفِ عطف کے ذریعے سے باہم ملے ہوتے ہیں۔ اردو میں مثل دوسری زبانوں کے مولوی عبدالحق ان کی چار قسمیں بیان کرتے ہیں۔

۱۔وصلی ۲۔تردیدی ۳۔استدراکی ۴۔سببی

وصلی جملوں میں دو ہم رتبہ جملوں کو باہم وصل کرنے کے لیے حرف عطف ''اور'' آتا ہے۔ان میں سے ہر جملہ برابر کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک دوسرے سے آزاد ہوتا ہے۔بعض اوقات پھر بھی یہ کام دیتا ہے۔تردیدی جملے وصلی جملوں کی ضد ہیں۔ان میں حرف عطفِ تردید عموماً 'یا' استعمال ہوتا ہے جو دو جملوں کو معناً جدا کرتا ہے۔اسی طرح بعض اوقات نہیں تو، ورنہ، خواہ، خواہ اور چاہے، چاہے، نہ۔۔۔نہ، بھی تردید کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

استدراکی جملوں میں دو بیانات کا باہم مقابلہ ہوتا ہے۔ یہ جملے مولوی عبدالحق کے نزدیک تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔دوسرا بیان پہلے بیان کے مخالف یا اس سے خارج ہو۔ ۲۔دوسرا بیان پہلے بیان کو صرف مقید یا محدود کرتا ہو۔
۳۔ پہلے بیان کی توسیع یا ترقی ہو۔

ان جملوں میں عموماً حروف لیکن، مگر، پر، سو، بلکہ استعمال ہوتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے مطابق تابع جملوں کی تین قسمیں ہیں۔ان میں اصل جملے کو خاص اور ماتحت جملے کو تابع جملہ کہتے ہیں۔قسمیں یہ ہیں:

۱۔اسمی ۲۔وصفی ۳۔تمیزی

اسمی جملے سے مراد ایسا جملہ ہے جو بجائے خود ایک اسم کا کام دے اور جملے کی ترکیب میں بجائے ایک اسم ہو۔جیسے، میرا ایمان ہے کہ خدا ایک ہے۔یہاں 'خدا ایک ہے' بجائے ایک اسم ہے۔وصفی جملہ وہ ہے جو صفت کا کام دے اور خاص جملے کے کسی لفظ یا فقرے کی تعریف کرے جیسے، اُس نے اُنہیں لڑکوں کے نام پکارے جو کتاب میں درج تھے۔یہاں 'کتاب میں درج تھے' نام کی تعریف کرتا ہے۔تمیزی جملہ مولوی عبدالحق کے نزدیک درحقیقت تمیز کی طولانی صورت ہوتا ہے۔یہ خاص جملے کی خبر یا کسی دوسری تمیز کی بلحاظ وقت و مقام طور طریقہ کے تعریف کرتا ہے۔بعض اوقات تمیزی جملہ سببی شرط کو بھی ظاہر کرتا ہے۔خاص جملہ شرط اور جملہ تابع جز کہلاتا ہے۔چنانچہ شرط میں تین حالتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔امکانی ۲۔حقیقی ۳۔غیرامکانی

بعض اوقات شرط ذہن میں امکانی صورت رکھتی ہے لیکن واقعے کے مطابق نہیں ہوتی، یہ امکانی حالت ہوتی ہے۔ جب صورت شرط واقعی ہو یعنی مستقبل یا گزشتہ یا زمانہ حال میں وقوع کی صورت ہو تو یہ حقیقی حالت ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شرط اور جزا دونوں خلاف واقعہ اور ناممکن الوقوع ہوں۔

جملے میں الفاظ کی ترتیب کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ عموماً جملے کے تین حصے ہوتے ہیں۔

۱۔مبتدا　　　۲۔خبر　　　۳۔فعل ربط

متعدی افعال کی صورت میں اول مبتدا (یا فاعل) اس کے بعد مفعول اور اس کے بعد فعل خبر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اردو میں یہ ترتیب اکثر قائم نہیں رہتی اور کبھی تاکید اور زور دینے کی خاطر، کبھی تعجب و افسوس یا خوشی کے لیے اور کبھی محض قافیے کے خیال سے اس ترتیب میں تغیر وتبدل واقع ہوتا ہے۔ خصوصاً نظم میں جملے کی معمولی ترتیب قائم نہیں رہتی، ضرورتِ شعری کسی ترتیب کے تابع نہیں۔

مولوی عبدالحق نے ان علامتوں کی وضاحت کی ہے جو اردو میں عام طور پر استعمال ہوتی ہیں اور جنہیں رموزِ اوقاف کا نام دیا جاتا ہے۔ ان علامتوں کے اردو میں ناموں کے علاوہ انہوں نے ان کے انگریزی نام بھی ساتھ لکھے ہیں۔ رموزِ اوقاف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اوقاف، یا وقفے اُن علامتوں کو کہتے ہیں، جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے، یا کسی جملے کے ایک حصے کو دوسرے حصوں سے علاحدہ کریں۔ ان اوقاف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اول تو ان کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے، اور وہ تھکنے نہیں پاتی؛ دوسری بڑی بات یہ کہ ذہن ہر جملے، یا جزو جملہ کی اصلی اہمیت کو جان لیتا ہے؛ اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔'' (۱۴۱)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رموزِ اوقاف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اوقافِ قراءت سے مراد وہ علامات و رموز ہیں جو تحریری فقروں میں الفاظ کے مابین لکھے جاتے ہیں اور جن سے جملوں کی تقسیم ہوتی ہے اور صحیح مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اوقاف کی قرآنی علامات الفبائی حروف پر مشتمل ہیں۔ دوسری صورت محض اشاری علامات کی ہے جو مغرب میں رائج ہوئی اور اب اُردو میں بھی رائج ہے۔ اُردو میں اوقافِ قراءت کا استعمال اٹھارہویں صدی عیسوی تک نہیں تھا۔'' (۱۴۲)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے بقول اردو میں جس مطبوعہ کتاب میں سب سے پہلے اوقاف قراءت کی پابندی کی گئی وہ مولانا حالی کی کتاب یادگارِ غالب ہے جو ۱۸۹۷ء میں رحمت اللہ رعد نامی پریس کانپور میں چھپی تھی۔(۱۴۳) مولوی عبدالحق نے رموزِ اوقاف کا بڑا فائدہ یہ بتایا ہے کہ ان سے نظر کو سکون ملتا ہے۔لیکن ان کا اس سے بھی بڑا فائدہ یہ ہے کہ رموزِ اوقاف کے باعث عبارت میں مختلف مقامات پر ٹھہراؤ کی وجہ سے سانس کو بھی سکون ملتا ہے اور عبارت زیادہ موثر اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

علامتوں کا محلِ استعمال بیان کرتے ہوئے انہوں نے رموزِ اوقاف جن مواقع پر استعمال کئے جاتے ہیں ان کی وضاحت کی ہے اور ساتھ ہی اس کی مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے سکتہ (،) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سب سے چھوٹا وقفہ ہوتا ہے۔اس کا استعمال ایسے اسما یا ضمائر کے بیچ میں جو ایک دوسرے کے بدل کا کام دیتے ہوں، یا ایک ہی قسم کے کلمہ کے اُن تین، یا تین سے زیادہ لفظوں کے بیچ میں جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں، ندائیہ لفظوں کے بعد، جب ایک ہی درجے یا رتبے کے لفظ جوڑوں میں استعمال ہوں، تو ایک جوڑے اور دوسرے جوڑے کے درمیان، ایسے اجزائے جملہ کے درمیان جو تشریحی ہوں، دو یا زیادہ ایک ہی درجے کے ایسے چھوٹے جملوں کے بیچ میں جو ایک بڑے جملے کے جز ہوں، شرط اور جزا یا صلے اور موصول کو بیان کرنے والے سادہ جملوں کے بیچ میں، ایسے سادہ جملوں کے بیچ میں جو مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کا بیان کریں، جب ایک سادہ جملہ دوسرے کی توجیہ کرے تو دونوں کے بیچ میں، جب کسی فعل کے بعد 'کر' یا 'کے' مقدر ہو، جب مبتدا اور خبر کے بیچ میں کوئی حجاب نہ ہو، عبارت اور خصوصاً شعر کی تعقید کو دور کرنے کے لیے اور یا وغیرہ سے پہلے جب لفظوں پر خاص طور پر زور دینا منظور ہو، سکتہ استعمال کیا جاتا ہے۔ برجوہن پنڈت دتا تریہ کیفی نے مولوی عبدالحق کی رموزِ اوقاف کی علامتوں سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ وہ سکتہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وقفہ (کوما) کو وہ سکتہ کہتے ہیں اور اس کی صورت اُلٹا واؤ (،) دکھاتے ہیں۔ یہ صورت کومے نے سر سید کے زمانے میں علی گڑھ میں اختیار کی تھی، بعض اس کی نقل کرتے ہیں۔ مگر میں اس بارے میں قدامت پرست ہوں۔ لکھنے کا جہاں تک تعلق ہے وہ بہت کم ٹھیک جگہ پر لکھا جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ دہلی کے چھاپہ خانوں کا اب کچھ یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ واؤ معروف کے سر پر یہ علامت یعنی اُلٹا واؤ بنا دیتے ہیں۔ جیسے 'اُردو'۔ اسی کتاب قواعدِ اردو' میں ایسا موجود ہے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ سکتے یا وقفے کو اُسی پُرانی شکل میں رہنے

دیا جائے۔'' (۱۴۴)

وقفہ (؛) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب سکتے سے زیادہ ٹھہراؤ کی ضرورت پڑے تو وقفہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا استعمال جملوں کے لمبے لمبے اجزا کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے، جہاں جملوں کے مختلف اجزا پر زیادہ تاکید دینا مدِ نظر ہوتا ہے، جن جملوں کے بڑے بڑے اجزا کے درمیان ورنہ، اس لیے، لہذا، اگر چہ، چہ جائیکہ، درآں حالیکہ، لیکن اور اسی قسم کے ربط دینے والے الفاظ آئیں یا جن صورتوں میں سکتہ لاتے ہیں ان میں صرف ایسی حالت میں وقفہ استعمال کرتے ہیں جب جملے کے بعض ایسے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑے جن میں اندرونی طور پر سکتہ موجود ہو۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کی ان تصریحات کے علاوہ، ایک اور محلِ استعمال یہ بھی ہے کہ مثالیں پیش کرتے وقت، الفاظ ''جیسے''، ''مثلاً'' سے پہلے وقفہ لاتے ہیں۔ (۱۴۵)

رابطہ (:) کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس کا ٹھہراؤ وقفے کے ٹھہراؤ سے زیادہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے، جب جملے کے کسی سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق کی جاتی ہے یا جب کسی مختصر مقولے یا کہاوت کو بیان کرنا ہو، یا ایسے دو جملوں میں جو آپس میں متقابل یا ایک دوسرے کی ضد ہوں اور دونوں مل کر ایک پورے خیال کو ظاہر کریں، یا جب دو جملوں میں سے ایک دوسرے کی توجیہ کرے مگر کوئی حرفِ توجیہ اُن کے بیچ میں نہ ہو۔ رابطے کے حوالے سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں:

> ''مولوی عبدالحق نے اردو میں رابطہ کے کئی استعمالات تجویز کیے ہیں، مگر ان کا رواج عام نہیں ہوا ہے، ہمارے خیال میں ہونا چاہیے۔ عموماً رابطہ بغلی سرخیوں (ذیلی عنوانات) کے بعد، اور نقلِ قول کے لیے قائل کے نام کے بعد لاتے ہیں۔'' (۱۴۶)

وقفہ اور رابطہ کے استعمال کو برجموہن پنڈت دتہ تریا کیفی غیر ضروری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کولن کی ہمیں ضرورت نہیں، اسی طرح سیمی کولن بھی غیر ضروری ہے کیوں کہ انگریزی میں جہاں سے یہ علامتیں لی گئی ہیں ان کا صحیح اور بجا استعمال کرنے والے انگریز بھی سو میں سے پانچ سات ہی ہوتے ہیں۔'' (۱۴۷)

تفصیلیہ (:-) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ علامت عام طور پر ''حسبِ ذیل'' کی ہوتی ہے۔ یہ کسی طویل اقتباس کو یا کسی فہرست کو پیش کرتے وقت لگاتے ہیں۔ کسی جملے کے ساتھ اجزا کا اعادہ کرتے وقت، یہ علامت ''حاصلِ کلام یہ ہے'' یا ''مختصر یہ ہے'' یا ''غرض کہ'' کا کام دیتی ہے۔ جب ایک ہی جملے میں کئی کئی باتیں

مسلسل پیش کرنا ہوں تو اس علامت کا استعمال کرتے ہیں۔اسی طرح کسی اصول یا قاعدے کی مثال پیش کرتے وقت یہ علامت لگاتے ہیں۔

ختمہ (۔) کی علامت کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہ علامت مکمل جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہے جہاں ٹھہراؤ بھرپور ہوتا ہے۔انگریزی مخففات کے بعد یہ علامت لگائی جاتی ہے۔پنڈت دتاتریہ کیفی نے یہاں پر بھی اختلاف کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب موصوف اس کے لیے چھوٹے ڈیش یا اصلی انگریزی ہائیفن کی شکل قرار دیتے ہیں، یہ شکل اول تو بہت خفیف ہے اور دوسرے یہی علامت ذرا بڑی ہوکر اور علامتوں میں بھی موجود ہے،اس لیے میری تجویز ہے کہ ختم جملہ کی علامت قرار دی جائے۔'' (۱۴۸)

واوین ('' '') کی علامت جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے یا کسی کا قول اسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے،تو اس کے اول آخر میں استعمال کرتے ہیں۔

فجائیہ (!) کی علامت کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ یہ علامت اُن الفاظ یا جملوں کے بعد لگائی جاتی ہے،جن سے کوئی جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔اسی طرح سوالیہ (؟) جملے کے آخر میں سوالیہ کی علامت لگاتے ہیں۔

خط (_) کی علامت جملہ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہے یا جب کئی لفظ کسی سابقہ لفظ کی تشریح اور متبادلے میں لکھے جائیں،تو یہ علامت لگاتے ہیں۔پنڈت دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں کہ ڈیش کی ضرورت بھی ایسی نہیں پائی جاتی کہ اسے اِملا کی علامتوں میں داخل کیا جائے۔(۱۴۹) قوسین ( ) یا [ ] کی علامت کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہ علامت بھی خط کی طرح جملہ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔

زنجیرہ ( ) ایک ایسی علامت ہے جس کا استعمال اردو میں عام نہیں ہے۔مولوی عبدالحق اس علامت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ علامت ان مرکب الفاظ کے اجزا کے درمیان لگائی جاتی ہے،جن کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ بغیر اس علامت کے ، وہ علیحدہ علیحدہ الفاظ سمجھے جائیں گے۔خاص طور پر علوم کی مرکب اصطلاحوں میں اس کا لگانا ضروری ہے۔پنڈت دیاتریہ کیفی لکھتے ہیں:

''ہائیفن کو زنجیرہ کہا گیا اور اس کی یہ شکل بنائی گئی ہے یہ عجیب لہریا ہے ، اور اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ ہمارا اصول خذ ما صفا ہونا چاہیے۔'' (۱۵۰)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے پنڈت دتاتریا کیفی کی رموزِ اوقاف کے بارے میں آراء کا ذکر کرتے ہوئے

مولوی عبدالحق کی تائید کی ہے اور ان علامات کو درست قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''ہمارے خیال میں یکسانی کے لیے مولوی عبدالحق کی پیش کردہ علامتوں کو اپنانا ہی درست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض علامتوں کا رواج کم ہے اور شاید کم رہے گا، لیکن معیاری علامتوں کا ہونا ضروری ہے۔ بے شک سیمی کولن کا رواج عام نہیں ہوا اور زنجیرے کا بھی یہی حال ہے۔لیکن بوقت ضرورت کام آنے والی علامتیں ہیں۔بعض اوقات عبارت میں گنجلک سے بچنے کے لیے سیمی کولن کا استعمال اور فنی اصطلاحات میں زنجیرے کا استعمال مفید مطلب ہے۔ختم جملہ کی علامت اور سکتے (کوما) کی علامت اب اس قدر رواج پا چکی ہیں کہ ان کے بدلنے کی تجویز درست معلوم نہیں ہوتی۔'' (۱۵۰)

مولوی عبدالحق کا انداز بات کو ذہن نشین کروانے کا ہوتا ہے۔وہ ہر پہلو کی مکمل وضاحت کرتے ہیں۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات قاری کو از بر کرا دیں۔اسی لیے انہوں نے مختلف نکات کو سادہ اور عام فہم مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔رموزِ اوقاف کے سلسلے میں انہوں نے مزید یہ کیا ہے کہ ہر علامت کی وضاحت اور مثالوں کے بعد ایک عبارت مشق فراہم کرنے کے لیے دی ہے جس میں قاری کو مناسب مقامات پر موزوں رموزِ اوقاف لگانے کو کہا گیا ہے۔

''قواعدِ اردو'' میں آخری بحث مولوی عبدالحق نے عروض کی کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ عروض وہ فن ہے جس سے اشعار کا وزن معلوم ہوتا ہے۔ان کے مطابق عروض کا موجد عرب کا ایک عالم ادب خلیل بن احمد مکی ہے جس کی وفات سنہ ۱۷۰ ہجری میں ہوئی ہے۔اس حوالے سے پنڈت دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ خلیل ابن احمد بصری پہلا شخص تھا جس نے علم عروض کے قواعد لکھے۔اس کی وفات ۷۹۱ء میں ہوئی۔پھر نظامی عروضی نے عروض کے قواعد مدون کئے۔یہ سمرقند کا رہنے والا تھا۔یہ ملک شاہ جلال الدین کے عہد میں ہوا ہے جو بادشاہ خاندان سلجوقی اول سے اور ارپ ارسلان کا بیٹا تھا۔اس کا انتقال ۱۰۹۲ء میں ہوا۔عروض پر اس کی کتاب مشہور ہے۔یہ دونوں بزرگ عجمی تھے۔یا کہیے خالص عرب نہ تھے۔'' (۱۵۲)

خلیل بن احمد مکی جو عروض کا موجد تھا، نے کل پندرہ وزن قرار دیے اور ہر وزن کا نام بحر رکھا، لیکن اس کے بعد بحروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔چنانچہ علمِ عروض کے حوالے سے مختلف اصطلاحات کی وضاحت کرتے ہوئے

وہ وزن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دو کلموں کی حرکات وسکنات برابر ہونے کا نام وزن ہے۔ جبکہ بحر اُن موزوں کلموں کا نام ہے جن پر شعر کا وزن ٹھیک کرتے ہیں۔ بحر جن اجزا (ٹکڑوں) سے بنتی ہے، اُن کو ارکان یا افاعیل یا امثال کہتے ہیں اور ہر جز کو رکن۔ کسی شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کو تقطیع کہتے ہیں۔ ارکان کے ٹکڑوں کو اجزا یا اصول کہتے ہیں۔ رکن جن اصول یا اجزا سے بنتا ہے وہ تین ہیں: سبب، وتد، فاصلہ۔ مگر سبب اور وتد کافی ہیں۔ دو حرفی کا نام سبب اور سہ حرفی کا نام وتد ہے۔ جب پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہو تو سبب خفیف اور دوسرا بھی متحرک ہو تو سبب ثقیل کہلاتا ہے۔ پہلا اور دوسرا متحرک اور تیسرا ساکن ہو تو وتدِ مجموع اور درمیانی ساکن ہو تو وتدِ مفروق کہتے ہیں۔

چنانچہ مولوی عبدالحق کے مطابق کل سات ارکان ہیں جن کی تفصیل انہوں نے اس طرح دی ہے:

۱۔فعولن ۲۔فاعلن ۳۔مستفعلن ۴۔مفاعیلن

۵۔فاعلاتن ۶۔متفاعلن ۷۔مفعولات

ان سات ارکان کو افاعیلِ ہفت گانہ کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور مشہور رکن مفاعلتن ہے مگر یہ مروج نہیں۔ کل مشہور بحریں جو اِن ارکان سے بنتی ہیں، اُن کو یاد رکھنے کے لیے مولوی عبدالحق نے درج ذیل قطعہ لکھا ہے:

''رجز، خفیف، رمل، منسوح، دگر مجتث بسیط و وافر و کامل،

ہزل، طویل و مدید''

''مشاکل و متقارب، سریع و مقتضب است مضارع و متدارک، قریب نیز جدید'' (۱۵۳)

بحروں کی تفصیل درج کرتے ہوئے پہلے ان بحروں کو درج کیا ہے جو ایک رکن سے بنتی ہیں ان کے نام مولوی عبدالحق نے رجز، ہزج، کامل، رمل، متقارب اور متدارک لکھے ہیں۔ جبکہ وافر بحر ترک کی گئی ہے اور اب رائج نہیں۔ دو رکنوں کے مکرر لانے سے جو بحریں بنتی ہیں وہ خفیف، سریع، مجتث، مضارع اور منسرح ہیں۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک عروض کی اصطلاح میں زحاف اس تغیر کو کہتے ہیں جو شعر کے رکن یا ارکان میں ہو۔ ارکان اگر اشعار میں اپنی اصلی صورتوں پر ہیں تو بحر کو سالم کہیں گے۔ مگر سالم بحریں کم مروج ہیں۔ جن کے کسی رکن یا ارکان میں تغیر ہوتا ہے انہیں مزاحف بحریں کہتے ہیں۔

زحاف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں زحاف یوں تو چالیس اکتالیس ہیں، مگر مروجہ اردو میں بیس لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کئی رکنوں میں آتے ہیں اور بعض صرف ایک رکن میں آتے ہیں۔ ایک رکن

میں آنے والے چار زحاف کی انہوں نے وضاحت کی ہے اور ان کی تفصیل درج کی ہے۔ ان کے نام ثلم، جب، خرم اور کشف ہیں۔ جبکہ عام زحاف جو گیارہ ہیں ان کے نام اذالہ، تسبیغ، حذذ، حذف، خبن، طی، قصر، قطع، قبض، کف، وقف، بیان کیے ہیں۔ اگر بحر کے رکن میں ایک سے زیادہ زحاف جمع ہوں تو یہ مرکب زحاف کہلاتے ہیں جو پانچ ہیں: خرب، شتر، شکل، کسف، ہتم۔

تقطیع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کا نام تقطیع ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے تقطیع کے چند قاعدے بیان کیے ہیں اور ان کی وضاحت مختلف اشعار کے مصرعوں کی تقطیع کر کے کی ہے۔

بحریں کے عنوان کے تحت بحرِ ہزج، بحرِ رجز، بحرِ رمل، بحرِ کامل، بحرِ متدارک اور بحرِ متقارب کی مختلف صورتوں کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی مصرعوں کی صورت میں ان کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اسی طرح مرکب بحروں میں بحرِ خفیف، بحرِ سریع، بحرِ مجتث، مضارع، منسرح اور بحرِ مقتضب کی وضاحت کی ہے۔ آخر میں انہوں نے رباعی کے اوزان درج کیے ہیں۔ ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے شجرۂ اخرب کے تحت گیارہ اور شجرۂ اخرم کے تحت بارہ اوزان لکھے ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو اس سے پہلے کی تمام اردو قواعد کی کتابوں سے ایک الگ اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے اردو قواعد کے روایتی انداز سے ہٹ کر ایک جدید قواعد لکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اردو زبان کو اس کی اپنی فطری ساخت کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ قواعدِ اردو میں مختلف کلمات کے ماخذات کو بھی خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مولوی عبدالحق نے ہندی الاصل الفاظ کے ماخذات کو بیان کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ وہ مختلف الفاظ کی ابتدائی پراکرتی اشکال کو بیان کرتے ہیں اور اردو الفاظ کے ابتدائی روپ یہاں کی مقامی زبانوں سے تقابلی مطالعہ کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی الفاظ کی اصل کی طرف اس طرح توجہ نہیں دی جس طرح ان کلمات کی طرف توجہ دی گئی ہے جن کا تعلق سنسکرت اور مقامی پراکرت زبانوں سے ہے۔ دراصل مولوی عبدالحق اردو زبان کی اصل دہلی اور اس کے گردونواح کی مقامی پراکرت زبان کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی زبان فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کی آمیزش سے اپنے جدید تر روپ میں اردو کہلائی۔ دیگر زبانوں کا اثر زیادہ تر اسما اور صفات کی حد تک رہا جبکہ زبان کا اصل عنصر وہی رہا جو اس مقامی زبان میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو

کے اس عنصر کو زیادہ واضح کیا ہے اور اردو قواعد مرتب کرتے ہوئے عربی فارسی کے اصول وضوابط کو سامنے رکھنے کے بجائے اردو کے اپنے مزاج کو مدِ نظر رکھا ہے۔

مولوی عبدالحق کے بعد بھی کافی تعداد میں اردو قواعد کی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن ان میں ایک درسی انداز موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کتابیں نصابی ضرورت کے تحت لکھی گئیں۔ ان میں روایتی بحثوں کو ہی شامل کیا گیا ہے اور وہی بندھے ٹکے اصول پیش کئے گئے ہیں جو اس سے پہلے کی قواعد کی کتابوں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کافی کتابوں میں مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو سے اخذ واستفادے کا رجحان موجود ہے۔ اس کے علاوہ بعض ماہرینِ لسانیات نے اردو قواعد کو ایک بالکل الگ اور نئے انداز میں مرتب کرنے کی کوشش بھی کی ہے جس کا ذکر اس باب کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو آج بھی اردو قواعد کی کتابوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب کی قواعدِ اردو کا اعتبار اب بھی قائم ہے اور جس مقصد کے تحت انہوں نے یہ کتاب لکھی قواعد کی کوئی دوسری کتاب اس مقصد کو اس خوبی سے پورا نہیں کرتی۔'' (۱۵۴)

حوالہ جات

(۱) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۱ء، ص ۵

(۲) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۱۱۔۱۲

(۳) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء، ص ۱۵۴

(۴) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، اورنگ آباد (دکن)، انجمن اردو پریس، ۱۹۲۶ء، ص ۱۰

(۵) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۱ء، ص ۱۱

(۶) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹

(۷) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۵۴

(۸) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۱ء، ص ۱۲

(۹) خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتبہ)، قواعدِ زبانِ اردو (مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ)،
لاہور، مجلسِ ترقی اردو، ۱۹۶۲ء، ص ۵

(۱۰) خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتبہ)، قواعدِ زبانِ اردو (مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ)، ایضاً، ص ۵

(۱۱) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۵۵

(۱۲) خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتبہ)، قواعدِ زبانِ اردو (رسالہ گل کرسٹ)، ایضاً، ص ۱۰

(۱۳) ۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔، ص ۴

(۱۴) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۱۵

(۱۵) خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتبہ)، قواعدِ زبانِ اردو (رسالہ گل کرسٹ)، ایضاً، ص ۳۴

(۱۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۶۷

(۱۷) محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر، مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات (جلد اول)،
نئی دلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۸

(۱۸) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۸

(۱۹) مولوی عبدالحق، دریائے لطافت، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء، مقدمہ ص (و)

(۲۰) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۷۰۔۱۷۱

(۲۱) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۲۱

(۲۲) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۱۹، ۲۰

(۲۳) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۷۵

(۲۴) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۱۸۰

(۲۵) قدرت نقوی، سید، مطالعہ عبدالحق، لاہور، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۲۵

(۲۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۸۰

(۲۷) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۲۲

(۲۸) قدرت نقوی، سید، مطالعہ عبدالحق، ایضاً، ص ۲۵۔۲۶

(۲۹) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۲۵

(۳۰) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء، (مقدمہ)

(۳۱) محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر، مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات، ایضاً، ص ۲۰۸

(۳۲) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۷ء، ص ۵

(۳۳) وارث سرہندی، زبان و بیان، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۹۵

(۳۴) قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات (حصہ دوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء ۲۶۳

(۳۵) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۴

(۳۶) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۴

(۳۷) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، علی گڑھ، ہیرالال پرنٹنگ ورکس، ۱۹۳۸ء، ص ۸

(۳۸) انشاللہ خاں انشا، سید، دریائے لطافت (مترجم، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی)،
کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء، ص ۸

(۳۹) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء، ص ۶۳

(۴۰) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۱۴۴

(۴۱) پنڈت برجوہن دتا تریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۶۳

(۴۲) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۱۹۲

(۴۳) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۵

(۴۴) ـــــایضاًـــــ، ص ۷۔۸

(۴۵) ـــــایضاًـــــ، ص ۱۰

(۴۶) ـــــایضاًـــــ، ص ۱۰۔۱۱

(۴۷) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۲۱۶

(۴۸) سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات (حصہ سوم)، اسلام آباد،
مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص ۴۷۶۔۴۷۷

(۴۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۲۱۸۔۲۱۹

(۵۰) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، ایضاً، ص ۱۵

(۵۱) ـــــایضاًـــــ، ص ۱۶

(۵۲) ـــــایضاًـــــ، ص ۱۶

(۵۳) ـــــایضاًـــــ، ص ۱۷

(۵۴) مولوی عبدالحق، خطبات عبدالحق (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی)،
کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۲ء، ص ۴۲۶

(۵۵) سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ (جلد اول)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ص ۲۵۰

(۵۶) نورالحسن نیر، مولوی، نوراللغات (جلد سوم)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۴۱

(۵۷) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، ایضاً، ص ۱۹

(۵۸) ـــــایضاًـــــ، ص ۱۷

(۵۹) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص ۱۰

(۶۰) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۲۲۱)

(۶۱) المنجد، کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۹۴ء، ص ۳۸۷

(۶۲) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص۲۰

(۶۳) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص۲۲۷

(۶۴) محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر، مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات، ایضاً، ص۲۱۰

(۶۵) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص۲۱

(۶۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص۲۵۲

(۶۷) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص۲۱

(۶۸) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص۲۱

(۶۹) محمد حسین، مولانا، مجمع القواعد، سرگودھا، انصار بک سٹال، س ن، ص۱۲

(۷۰) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص۱۰

(۷۱) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص۲۴۹

(۷۲) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص۱۲۲

(۷۳) گل کرسٹ، قواعدِ زبانِ اردو (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی)،
لاہور، مجلسِ ترقی اردو، ۱۹۶۲ء، ص۵ تا ۹

(۷۴) سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات (حصہ سوم)، ایضاً، ص۲۷۸

(۷۵) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، ایضاً، ص۱۱۔۱۲

(۷۶) سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات (حصہ سوم)، ایضاً، ص۲۷۹

(۷۷) احسان دانش، تذکیر و تانیث، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۰ء، ص۱۲

(۷۸) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص۲۹

(۷۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص۲۷۲

(۸۰) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص

(۸۱) احسان دانش، تذکیر و تانیث، ایضاً، ص۳۴

(۸۲) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص۱۵۲

(۸۳) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، ایضاً، ص۶۵

(۸۴) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۳۵

(۸۵) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، ایضاً، ص ۶۵

(۸۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۲۸۰

(۸۷) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، ایضاً، ص ۴۷

(۸۸) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص ۱۵۷

(۸۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۲۹۱

(۹۰) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۴۱

(۹۱) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۱۴۹۔۱۵۰

(۹۲) احسان دانش، تذکیر و تانیث، ایضاً، ص ۳۵

(۹۳) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، ایضاً، ص ۷۱

(۹۴) ــــــ ایضاً ــــــ، ص ۳۷

(۹۵) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۴۸

(۹۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۳۲۷

(۹۷) سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات (حصہ سوم)، ایضاً، ص ۲۸۰۔۲۸۱

(۹۸) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۵۹

(۹۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۳۶۹

(۱۰۰) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۹۷

(۱۰۱) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۳۷۵

(۱۰۲) ــــــ ایضاً ــــــ، ص ۳۶۹

(۱۰۳) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۱۳۶

(۱۰۴) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۲۷

(۱۰۵) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً، ص ۳۵۴

(۱۰۶) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۸۵

(۱۰۷) ـــــــایضاًــــــ،ص ۸۶

(۱۰۸) ـــــــایضاًــــــ،ص ۸۷

(۱۰۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً،ص ۳۷۸

(۱۱۰) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً،ص ۹۰

(۱۱۱) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً،ص ۳۸۳

(۱۱۲) ـــــــایضاًــــــ،ص ۴۰۷

(۱۱۳) ـــــــایضاًــــــ،ص ۴۱۱

(۱۱۴) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً،ص ۱۰۳

(۱۱۵) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، اورنگ آباد (دکن)، انجمن اردو پریس، ۱۹۲۶ء،ص ۸۹

(۱۱۶) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۱ء،ص ۱۰۳

(۱۱۷) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۵۸ء،ص ۱۳۴

(۱۱۸) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۱ء،ص ۱۱۹

(۱۱۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً،ص ۴۴۵

(۱۲۰) ـــــــایضاًــــــ،ص ۴۵۳

(۱۲۱) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً،ص ۱۳۵

(۱۲۲) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً،ص ۱۶۹

(۱۲۳) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً،ص ۱۶۸

(۱۲۴) ـــــــایضاًــــــ،ص ۱۶۸

(۱۲۵) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً،ص ۱۷۰

(۱۲۶) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، ایضاً،ص ۳۲۰

(۱۲۷) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً،ص ۱۲۵

(۱۲۸) ـــــــایضاًــــــ،ص ۱۲۶

(۱۲۹) ـــــــایضاًــــــ،ص ۱۳۲

(۱۳۰) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۱۳۵

(۱۳۱) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۶۲

(۱۳۲) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۹۰

(۱۳۳) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۲۳۱

(۱۳۴) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۲۴۵

(۱۳۵) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۱۶۸

(۱۳۶) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ایضاً، ص ۱۵۲

(۱۳۷) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۱۷۰

(۱۳۸) فتح محمد خان جالندھری، مولوی، مصباح القواعد، ایضاً، ص ۲۳۷۔۲۸۸

(۱۳۹) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۲۷۳

(۱۴۰) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۳۹

(۱۴۱) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۳۱۶

(۱۴۲) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۲۰۱

(۱۴۳) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۲۰۲

(۱۴۴) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۳۵۰

(۱۴۵) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۲۰۷

(۱۴۶) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۲۰۷

(۱۴۷) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۳۵۰

(۱۴۸) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۳۵۱

(۱۴۹) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۳۵۰

(۱۵۰) ۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔، ص ۳۵۱

(۱۵۱) غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، ایضاً، ص ۲۱۲

(۱۵۲) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، ایضاً، ص ۳۱۱

(۱۵۳) مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو، ایضاً، ص ۳۳۹

(۱۵۴) محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر، مولوی عبدالحق ادبی و لسانی خدمات، ایضاً، ص ۲۱۴)

☆☆☆

مولوی عبدالحق کی اردو لُغت نگاری

مولوی عبدالحق کی اُردو لغت نویسی

مولوی عبدالحق نے اردو کی بقااور فروغ کے جذبے کے تحت بیک وقت کئی شعبوں پر توجہ دی۔ وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اردو کی تفہیم میں مزید آسانی پیدا ہو اور اس زبان کے اندر جو معنی کی تہیں پوشیدہ ہیں وہ صحیح انداز میں سامنے آئیں۔ کیونکہ وہ اردو کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھتے تھے اور اسے نہ صرف ان لوگوں کی زبان سمجھتے تھے جنھوں نے ماں کی گود سے اسے سیکھنا شروع کیا بلکہ ان کے نزدیک اردو ایک بین الاقوامی حیثیت رکھنے والی زبان کے اوصاف اپنے اندر رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے پاک و ہند کے علاقوں کی سب سے ہمہ گیر زبان اور ان علاقوں کی یک جہتی کی علامت تصور کرتے تھے جسے یہاں کا ہر باشندہ بلا طریقِ مذہب اختیار کرنے پر مجبور ہے اور اسے رابطہ قائم کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اردو کی اسی ہمہ گیریت کے باعث وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اردو کی تفہیم کے لیے اس کے اصول وضوابط واضح کرنے چاہیں تاکہ مختلف علاقائی اثرات سے زبان میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ ساتھ ہی وہ اردو کو اس کے مزاج کے مطابق سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری خیال کرتے تھے کہ اس کی ایک معیاری لغت ترتیب دی جائے جس میں اردو زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی کو ان کا تاریخی پس منظر سامنے رکھتے ہوئے واضح کیا جائے۔ چنانچہ انہیں مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ایک اردو زبان کی جامع تر لغت مرتب کرنے کا فیصلہ کیا جس کی اب تک دو جلدیں ''لغتِ کبیر'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

لغتِ کبیر کا مقدمہ اردو لغت نویسی کی تاریخ کے حوالے سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقدمے میں انہوں نے نہ صرف اردو زبان کے حوالے سے لکھی جانے والی لغات کی مکمل تاریخ بیان کی ہے اور ان لغات پر محققانہ تبصرہ کیا ہے بلکہ اردو لغت نویسی کے رہنما اصول بیان کر کے لغت نویسی کو ایک جدید سائنسی بنیاد عطا کی ہے۔ انہوں نے لغت نویسوں کے اختیار کئے ہوئے اصول وضوابط کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان کی خامیوں کو واضح کرتے ہوئے ان کے عملی اطلاق پر بحث کی ہے۔ مولوی عبدالحق کے اس مقدمے پر تبصرہ کرتے ہوئے سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق نے اس کے لیے ایک عالمانہ مبسوط مقدمہ لکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو

میں اتنا جامع مقدمہ لغت ولغت نگاری پرنہیں لکھا گیا۔اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کے مطا
بق لغت مرتب کی جائے تو وہ یقیناً لاجواب ہوگی۔''(۱)

مولوی عبدالحق نے اردو لغت نویسی کی تاریخ اپنے مقدمہ میں بیان کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اردو لغت پر سب سے پہلے اہلِ یورپ اور خاص طور پر انگریزوں نے کتابیں لکھیں۔اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ کسی بھی زبان کو سمجھنے کی سب سے پہلے ضرورت غیروں کو پڑتی ہے۔اہلِ زبان اس پر بعد میں توجہ دیتے ہیں۔انگریز تجارت کی غرض سے آئے اور ملک گیری کی طرف قدم بڑھایا۔چنانچہ یہاں کے عوام سے رابطہ رکھنے اور ان پر غلبہ پانے کے لیے اردو زبان کی تفہیم لازمی تھی اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انگریزوں نے اردو کی لغات مرتب کرنے کی طرف توجہ دی۔

چنانچہ اس حوالہ سے مولوی عبدالحق نے جس پہلی لغت کا ذکر کیا ہے وہ فارسی ہندوستانی ،انگریزی، پرتگالی الفاظ کی لغت ہے جو سُورت کے انگریزی کارخانے کے لیے مرتب کی گئی تھی اس کا ذکر ان کے مطابق مسٹر کورچ نے اپنی اورینٹل کیٹلاگ مرتبہ ۱۸۸۷ء میں کیا ہے۔اسی طرح ایک اور لغاتِ زبانِ ہندوستانی ۱۷۰۴ء میں سورت میں لکھی گئی جس کا ذکر گریرسن نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس سے قبل ایک اور لغت کا حوالہ دیا ہے جو ۱۵۹۹ء سے قبل کی تصنیف یا تالیف ہے اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستانی، فارسی، پرتگالی کی ایک اور لغت کا پتہ چلا ہے جو ۱۵۹۹ء سے قبل کی تصنیف یا تالیف ہے اس کے مصنف یا مولف کا نام جیرونیمو خاویر (Jeronimo Xavier) ہے۔یہ جہانگیر کے دربار میں بھی حاضر ہوئے اور آگرہ میں Company of Jesus میں شریک تھے ان کے قیام کا زمانہ ۱۵۸۶ء اور ۱۶۱۵ء کے درمیان ہے۔کتاب کا عنوان:
>
> Vocabularium Portugalico-Hindustano-Persicum یا
> Hindustani Persisch Portugiesisch
>
> اس کا ایک قلمی نسخہ لندن کے King's College کے کتب خانہ میں دستیاب ہو گیا ہے۔''(۲)

اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ایک اور لغت کا حوالہ دیا ہے جس کے مصنف اینتو نیو داسلدانہ

ایک قدیم مشنری ہیں۔ یہ دراصل دعاؤں کی ایک کتاب ہے جس میں ہندوستانی لغات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس کا ذکر بھی مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں نہیں کیا۔اسی طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے چند دیگر لغت نویسوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا بیان مولوی عبدالحق کے مقدمہ میں موجود نہیں ۔ان میں ایگنا شیوارکا مو نے ،جان ڈی پیڈ روزا، گیوسپا ماریا دابرنینی دا گرگنانو، مارتھو دامیلوا ے کاستر و شامل ہیں۔

مولوی عبدالحق ایک اہم لغت نویس جان جیشوا کیٹلر کا حوالہ دیتے ہیں جنہوں نے ہندوستانی زبان کی صرف ونحو اور لغت پر کتاب ۱۷۱۵ء میں لکھی۔اسی طرح جارج ہیڈلے کی صرف ونحو مع فرہنگِ انگریزی و مور۱۷۷۲ء کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ اس میں اردو لفظ فارسی خط میں لکھے گئے اور ایسے الفاظ خاص طور پر لکھے ہیں جو متحد الصوت مگر مختلف المعانی ہیں۔ان کا ترجمہ لفظی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جان جیشوا کیٹلر کی ہندوستانی لغت و قواعد کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور مصنف شیلزے کا حوالہ دیتے ہیں۔انہوں نے لکھا ہے:

> ''جان جیشوا کیٹلر کی ہندوستانی لغت وقواعد کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ایک اور مصنف شیلزے نے ۱۷۴۱ء میں ہندوستانی قواعد کے نام سے Grammatica Indostanica لکھی اور اس کے پیشِ نظر کیٹلر کی تالیف بھی تھی جسے اس نے اپنی قواعد میں شامل کرلیا۔ یہ قواعد بھی لاطینی زبان میں تھی،لیکن ہندوستانی الفاظ اس نے اردو کے اس وقت کے املاء کے مطابق اسی رسم الخط میں لکھے تھے اور اردو رسم الخط کے علاوہ دیوناگری، بنگلہ وغیرہ رسم الخط کے نمونے بھی دیے تھے: لیکن یہ صرف قواعد کی کتاب نہ تھی۔اس میں اردو الفاظ کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور اہم لغات کی فہرستیں بھی شامل تھیں۔اس کے انگریزی ترجمے کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں تھا۔۔۔اس سے اٹھارہویں صدی میں اردو کے بعض الفاظ کے تلفظ اور املاء کے بارے میں اور نیز اس وقت کی ہندوستانی یا اردو کے سلسلے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔''(۳)

مولوی عبدالحق نے ایک اور لغت نویس فرگسن کی ہندوستانی زبان کی لغات انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی کا ذکر کیا ہے جو۱۷۷۳ء میں شائع ہوئی۔اس میں اردو کے اصل الفاظ رومن حروف میں ہیں۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے

انگریزوں کواردو زبان سکھانے کے لیے کئی حوالے سے کام کیا۔سلیس اردو میں کتابیں لکھوائیں۔اردو قواعد پر کتابیں مرتب کیں اور ساتھ ہی اردو لغت کے حوالے سے بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی ہندوستانی ڈکشنری کا حوالہ دیا ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ کلکتہ میں ۱۷۸۷ء میں طبع ہونی شروع ہوئی اور ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوئی۔اس میں انگریزی الفاظ کے معانی رومن حروف نیز اردو حروف میں دیے ہیں۔ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی دیگر کتابوں میں ہندوستانی گرامر کی کتاب،اسی طرح ایک اور کتاب اورینٹل لینگو اسٹ ،پھران کی کتاب اینٹی جارگونسٹ اوران کی کتاب ایسٹ انڈین گائیڈ کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ان کتابوں میں قواعدِ صرف ونحو کے علاوہ اردو لغت کے حصے بھی شامل ہیں۔ان کی ایک اور کتاب اتالیقِ ہندی کا نام بھی انہوں نے لیا ہے جس کے پہلے حصے میں فارسی صرف ونحو کے قواعد وغیرہ لکھے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں ہندوستانی، فارسی اور انگریزی الفاظ کی فرہنگ ہے۔ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی لغات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر گلکرسٹ کی لغات میں بہت سے ایسے لفظ ملیں گے جن کا رواج اب نہیں رہا اور متروک سمجھے جاتے ہیں۔تاہم ان ہی میں ایسے لفظ بھی ہیں جو بہت کام کے ہیں اور پھر رواج پانے کا حق رکھتے ہیں۔'' (۴)

جنرل ولیم کرک پیٹرک نے ہندوستانی انگریزی ڈکشنری لکھی۔اس کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس ڈکشنری کو اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔پہلے حصے میں ان الفاظ کو درج کیا جو عربی فارسی سے ہندوستانی میں آ گئے ہیں۔یہ حصہ ۱۷۸۵ء میں لندن میں شائع ہوا۔مزید حصے شائع نہ ہو سکے۔اس کے بعد انہوں نے دو مزید کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ہنری ہیرس اور کپتان جوزف ٹیلر نے لکھیں۔ان میں بھی انہوں نے ہندوستانی انگریزی لغات کو شامل کیا ہے۔ایک اہم لغت نویس جان شیکسپئر کی لغت 'ہندوستانی انگریزی لغات' کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ یہ ٹیلر ہنٹر کی لغات پر مبنی ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن کسی قدر تغیر وترمیم کے ساتھ لندن میں ۱۸۱۷ء میں شائع ہوا اس کے بعد اس کے مزید تین ایڈیشن شائع ہوئے۔یہ کافی ضخیم ڈکشنری کی صورت اختیار کر گئی ہے۔یہ کتاب ہندوستانی انگریزی اور انگریزی ہندوستانی دو لغات کی جامع ہے اور اس میں خصوصاً دکنی الفاظ ومحاورات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ شیکسپیر کی یہ لغات بہت ضخیم ہے اور اپنے وقت کی سب سے بہتر اور جامع کتاب ہے۔شیکسپیر کی لغت کو ایک اہم لغت قرار دیتے ہوئے وارث سرہندی لکھتے ہیں:

''شیکسپیئر کی لغت بھی اردو لغت کے سلسلۃ الذہب میں امہاتِ کتب میں شامل ہے۔اس کی قدامت اپنی جگہ ایک شرف کی حامل ہونے کے علاوہ، اس کی عملی افادیت بھی کسی طرح دوسری کتبِ لغت سے کم نہیں ہے۔آج تک جتنی بھی کتبِ لغت اردو میں تالیف ہوئی ہیں وہ بالواسطہ یا براہِ راست شیکسپیئر کی لغت سے متاثر ہیں۔پلیٹس ہوں یا فیلن، صاحب ''فرہنگِ آصفیہ'' ہو یا مولف ''نوراللغات'' سبھی نے اس لغت سے استفادہ کیا ہے۔اس کی استنادی حیثیت بھی بہت بلند ہے اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کی تالیف کردہ کتبِ لغت میں شیکسپیئر کی لغت کو ایک خاص اور ممتاز مقام حاصل ہے۔''(۵)

اس کے بعد مولوی عبدالحق جے ٹی ٹامسن، اے سی ڈی روزاریو، کپتان رابرٹ شیڈون ڈوبی، این برائس اور ولیم ییٹس کی کتب کا ذکر کیا ہے جن میں اردو انگریزی لغات کو درج کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک اور اہم لغت نویس ڈاکٹر ڈنکن فوربس کی کتاب ہندوستانی انگریزی ڈکشنری کا حوالہ دیتے ہیں جو پہلی بار لندن سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔اس کے پہلے حصے میں اصل لفظ اردو رسمِ خط میں ہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ عربی فارسی ہندی کی علامت لگی ہوئی ہے دوسرے حصے میں انگریزی لفظ کے اردو معانی رومن حروف میں ہیں۔معانی میں کافی مترادفات پائے جاتے ہیں۔فوربس نے اپنے پیش رو لغت نویسوں کے مقابلے میں الفاظ کا بہت اضافہ کیا ہے۔ڈنکن فوربس کی اس لغت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وارث سرہندی لکھتے ہیں:

''ڈنکن فوربس کے اردو۔انگریزی لغت کا شمار بھی اردو کی امہات لغات میں ہوتا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جان۔ٹی۔پلیٹس نے اپنے مشہور لغت کے دیباچہ میں اسے مستشرقین کی تالیف کردہ تمام کتب لغت پر مواد، ترتیب اور تشریح کے لحاظ سے فوقیت دی ہے اور اپنے لغت کی بنیاد بھی اسی لغت کو بنایا ہے۔حقیقت بھی یہی ہے کہ فوربس کا یہ لغت مستشرقین کی تالیف کردہ کتبِ لغت میں ایک اہم اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔الفاظ کے مآخذ کے سلسلہ میں اس کا معیار دوسری اس قسم کی کتابوں سے بدرجہا بلند ہے۔الفاظ کی تشریح میں اختصار اور جامعیت اس کا ایک نمایاں وصف ہے۔اس لیے لغت و لسانیات سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔''(۶)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ڈنکن فوربس کی ایک اور اہم تالیف ہندوستانی زبان کے قواعد کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کے آخری چالیس صفحات میں، ہر صفحہ پر دو کالموں میں اردو الفاظ، ان کا تلفظ رومن میں اور معانی انگریزی میں درج کیے ہیں۔ یہ مختصر ہونے کے باوجود ایک دلچسپ لغت ہے جس میں صرف حرف الف کے تحت ۱۷۴ اندراجات ہیں۔(۷)

اس کے بعد وہ چند چھوٹی چھوٹی لغت کی کتابوں کی اشاعت کا ذکر کرتے ہیں ان میں ہنری گرانٹ، ہارل گروو، بلوم ہارٹ، کپتان بوراڈیل، جے ڈبلیو فریل، ایچ بلوک مین، پاؤلوطریا ہارمیم، فرینکوڈینوکل، ڈی ایف ایکس ڈائس، ریورنڈ ہوپر، ریورنڈ کریون، ڈبلیو کی گن، ریورنڈ ایونگ، کرنل فلپس، ڈبلیو ایل تھابرن، پالاک، میجر چیپ مین، جی رین کنگ اور لیفٹیننٹ کرنل فلاٹ کی کتابیں شامل ہیں جن میں انگریزی ہندوستانی لغات کا اندراج کیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق اس وقت تک لکھی گئی اردو لغت کی اہم کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ سب کتابیں کم و بیش شیکسپیر، فوربس، فالن کی لغات پر مبنی ہیں۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر، ڈاکٹر گلکرسٹ، شیکسپیر اور فوربس کی لغات بہت اچھی تھیں اور بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی تھیں اور ایک مدت تک بہت کام دیتی رہیں۔ بعد کی بہت سی لغات انہی پر مبنی ہیں۔ اب یہ پرانی ہو چکی ہیں۔ زبان بہت آگے نکل گئی ہے۔ لغت کی ان سب کتابوں پر فالن اور پلیٹس کی لغات سبقت لے گئیں ہیں۔ فالن نے یہ خاص اہتمام کیا ہے کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال کی سند میں عوام کے گیت، زبان زد ضرب الامثال اور فقرے اور اساتذہ کے اشعار نقل کیے ہیں لیکن اردو کے ادبی الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی برتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی فارسی لفظ جو اردو زبان و ادب میں عام طور پر مروج ہیں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے الفاظ محض فضیلت معآبی جتانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ زبان میں (خواہ وہ کوئی زبان ہو) ادبی الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں اور کوئی لغت ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ہر لفظ کے ساتھ عربی فارسی ہندی سنسکرت کی علامت لگی ہوئی ہے لیکن لفظ کی اصل اور اشتقاق کی تحقیق میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی محنت اور کوشش کی ہے اور ڈاکٹر فالن کی

تربیت کا یہ کچھ کم فیض نہیں ہے کہ ان کے ساتھ جس قدر اصحاب بطور مددگار کے کام کرتے تھے ان سب نے کوئی نہ کوئی کتاب لغت یا زبان پر لکھ ڈالی ہے۔ پلیٹس کی لغات فالن کی کتاب کے مقابلے میں بہت زیادہ ضخیم اور وسیع ہے۔ اس نے اردو کے ساتھ ٹھیٹ ہندی کے لفظ بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی، عربی، سنسکرت کے الفاظ کا بھی بہت کافی ذخیرہ ہے جن میں سے اکثر اردو زبان میں مروج نہیں۔ الفاظ کے معنوں میں زیادہ تفصیل اور وسعت پائی جاتی ہے اور اکثر الفاظ کے مآخذ اور اصل کا بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن معنی اور استعمال کے لیے سند نہیں دی۔ ہر اصل لفظ پہلے اردو رسم خط میں ہے، اس کے آگے ناگری رسم خط میں اور اس کے بعد رومن حروف میں۔ ان دونوں فاضل لغت نویسوں کی محنت اور کاوش قابلِ داد ہے۔'' (۸)

ڈاکٹر فالن کی لغت کی اہمیت کو اکثر ماہرین نے تسلیم کیا ہے اور فرہنگِ آصفیہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے شان الحق حقی لکھتے ہیں کہ:

''یہی کیا کم ہے کہ بعد کے مولفین خصوصاً مولوی سید احمد دہلوی نے ان کی تالیف سے بہت کچھ استفادہ کیا، اگرچہ پوری طرح نہ کیا۔ یعنی بعد کی لغات کا پایہ علمی وفنی اعتبار سے اب بھی اس کے مقابلے میں ساقط ہے۔ آج بھی فیلن کی لغات سے صرفِ نظر مرتبینِ لغات کے لیے روا نہیں۔'' (۹)

اسی طرح وارث سرہندی اس لغت کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فیلن کی لغت کی اہمیت کے ضمن میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر یہ لغت نہ لکھی جاتی تو اردو کی مشہور لغت ''فرہنگِ آصفیہ'' بھی معرضِ وجود میں نہ آتی۔'' (۱۰)

مولوی عبدالحق نے پلیٹس کی لغت کو بھی کافی اہمیت دی ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنے مقدمے میں کیا ہے۔ اس لغت کے حوالے سے جابر علی سید لکھتے ہیں:

''پلیٹس کی لغت کئی اعتبار سے مثالی ہے۔ اصلاً یہ انگریزوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انگریزوں کے تصور اردو بصورتِ ہندوستانی (اردو+ہندی) کی یہ بہترین مجموعی شکل ہے۔ پلیٹس کی لغت علومِ شعری میں عدمِ مزاولت کی بری مثال ہے۔ اصنافِ سخن کا صحیح درک اس میں مفقود ہے۔ یہ اس کا کمزورترین پہلو ہے۔ لیکن اس سے ہندی

زبان، سنسکرت الفاظ، اور دیوناگری رسم الخط بآسانی سیکھا جا سکتا ہے۔ فارسی الفاظ کی اصل بھی
قابلِ تعریف پہلو ہے۔ اس معاملے میں اغلب ہے کہ مولف نے سب سے بڑھ کر برہانِ قاطع
جیسی مقبول اور بآسانی دستیاب لغت سے پورا استفادہ کیا ہے۔'' (۱۱)

مولوی عبدالحق نے اس کے بعد چند ایسی لغات کا ذکر کیا ہے جو بعض فنون اور زندگی کے شعبوں کی اصطلاحات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں ایس روسو، لیفٹیننٹ روبک، سرہنری ایلیٹ، پیٹرک کارنے گی، ایچ ایچ ولسن، ڈاکٹر فیلن، ایچ جی ریورٹی، جی بی ہیرل گروو، جارج کلفرڈ وھٹ ورتھ کی کتابیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دوسابھائی سہراب جی، منشی چرن جی لال، ریورنڈ کاٹن ماتھر، متھراپرشاد، درگا پرشاد، منشی سداسکھ لال، مولوی عبدالودود، ایس سنگاگھی راؤ نے بھی اردو انگریزی لغات مرتب کیں جن میں مختلف علوم کی اصطلاحات کو شامل کیا گیا۔

اس کے بعد مولوی عبدالحق نے ان لغات کا ذکر کیا ہے جو اہلِ ہند نے اردو کے سلسلہ میں لکھی ہیں۔ اس حوالے سے مولانا فضل الدین محمد قوام کی کتاب 'بحر الفضائل فی منافع الافاضل'، عہدِ جہانگیری کی ایک کتاب 'خالق باری' قاضی خان ملا بدر محمد دہلوی کی 'ادات الفضلا' اور قوام الدین ابراہیم فاروقی کی کتاب 'شرف نامہ' کا ذکر کیا ہے کہ ان کتابوں میں اگرچہ اردو لغت نگاری کے نقوش ملتے ہیں لیکن ان کو باقاعدہ لغت کی کتابیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح انشاء اللہ خان کی کتاب 'دریائے لطافت' میں بھی قواعدِ صرف ونحو کے علاوہ اردو لغت کا سامان موجود ہے اور اس حوالے سے یہ کافی اہمیت رکھتی ہے لیکن اسے بھی ان کے بقول لغات کے ذیل میں شریک نہیں کر سکتے۔

مولوی عبدالحق، عبدالواسع ہانسوی کی کتاب 'غرائب اللغات' کو اردو کی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں جسے ابتدائی لغت کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس میں انہوں نے نہ صرف وہی الفاظ لکھے ہیں جو لغت کی کتابوں میں ملتے ہیں بلکہ ان الفاظ کو بھی داخل کیا ہے جو زبانوں پر جاری تھے اور بول چال میں آتے تھے۔ ان کا مقصد اس لغت کے لکھنے سے یہ تھا کہ وہ غیر مانوس یا بول چال کے اردو لفظ جو فارسی ادب یا شعرا کے کلام میں عموماً نہیں ملتے ان کے معانی اور تشریح لکھ کر ان کے مقابلے میں فارسی مترادف درج کر دیے جائیں تاکہ طلبہ اور شائقین کو ان الفاظ کی تلاش میں دقت نہ ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللہ غرائب اللغات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو میں لغت نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں غرائب کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ خصوصاً
تقدمِ زمانی کی وجہ سے اس کو جو اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس کو کسی طرح گھٹایا نہیں
جا سکتا۔ درحقیقت ہانسوی کی اس کتاب میں وہ سب خصوصیتیں موجود ہیں جو کسی فن کے موسس

اور ابتداء کرنے والے شخص کی تصنیف میں ہوا کرتی ہیں ایسی کوششیں اس لحاظ سے بڑی قابلِ قدر ہوتی ہیں کہ وہ بعد میں آنے والوں کو راستہ دکھاتی ہیں۔ بہ ایں ہمہ تحقیق وصحت کے اعتبار سے غرائب کو بلند پایہ تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک سیدھی سادی کتاب ہے جس میں متوسط درجے کے طلبہ علم کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔اس کی تشریحیں مختصر اور بعض اوقات بے حد تشنہ ہوتی ہیں بلکہ بیشتر عربی یا فارسی مرادفات تک محدود ہوتی ہیں۔'' (۱۲)

اردو لغت کی دوسری کتاب جس کا ذکر مولوی عبدالحق نے کیا ہے وہ مشہور فارسی ادیب سراج الدین علی خان آرزو کی 'نوادر الالفاظ' ہے۔اس کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ درحقیقت یہ کتاب 'غرائب اللغات' کی تصحیح اور تتمہ ہے۔ انہوں نے 'غرائب اللغات' کی تصحیح ہی نہیں کی بلکہ بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔غرائب اللغات میں لفظ کے معنی اختصار کے ساتھ دیے گئے ہیں مگر خان آرزو نے معانی کے ساتھ اکثر الفاظ کی تحقیق بھی کی ہے اور جگہ جگہ فارسی اور ہندی کے اشتراک وتوافق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ نوادرالالفاظ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'' کہنے کو یہ تالیف غرائب اللغات کی تصحیح وترمیم ہے مگر ان مفید اور عالمانہ تنقیدوں اور اضافوں کو دیکھ کر جن کا ثبوت ہر ہر صفحے پر ملتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تالیف اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور غرائب کا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔'' (۱۳)

مولوی محمد واصف کی دلیلِ ساطع ہندی سنسکرت الفاظ کی لغت ہے اور ان الفاظ کے معانی فارسی میں مختصر طور پر لکھے گئے ہیں۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لفظ اب اردو میں متروک ہیں یا پہلے کبھی استعمال میں نہیں آئے تھے۔اسی طرح 'نفائس اللغات' مولوی اوحدالدین بلگرامی کی تالیف ہے۔اس لغت میں الفاظ کی شرح فارسی میں کی گئی ہے اور ہر اردو لفظ کا فارسی اور عربی مترادف دیا گیا ہے۔یہ کتاب ۱۸۳۷ء میں تالیف ہوئی اور ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔انہی کے ساتھ مولوی عبدالحق نے میر علی اوسط رشک لکھنوی کی لغت 'نفس اللغۃ' کا ذکر کیا ہے جس میں اردو لفظ کے معانی فارسی میں دیے گئے ہیں اور کہیں کہیں بہت مختصر طور پر چند الفاظ میں تشریح بھی کر دی گئی ہے۔وہ مولف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ لغت نویسی کے اصول سے مطلق واقف نہیں۔

اس کے بعد انہوں نے مولوی امام بخش صہبائی کی اردو صرف ونحو کا ذکر کیا ہے جس کے آخری باب میں اردو محاورات درج کیے گئے ہیں۔اسی طرح نیاز علی بیگ نکہت کی مخزنِ فوائد، مرزا محمد مرتضیٰ عاشق لکھنوی عرف مچھو

بیگ کی بہارِ ہند، مولوی اشرف علی لکھنوی کی 'مصطلحاتِ اردو اور منشی چرنجی لال کی مخزن المحاورات بھی ایسی کتابیں ہیں جن میں کافی تلاش سے محاورات جمع کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد مولوی عبدالحق اردو کی جس اہم لغت کا ذکر کرتے ہیں وہ مولوی سید احمد دہلوی کی 'فرہنگِ آصفیہ' ہے۔اس کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ڈاکٹر فیلن کی لغت کا نمونہ موجود تھا اور وہ خود بھی اس کی ترتیب میں شریک تھے لیکن ان کی لغت کا انداز بالکل الگ ہے۔ایک تنہا شخص جس قدر محنت کاوش اور تحقیق کرسکتا ہے انھوں نے اس کا حق ادا کیا ہے اور ایسا بڑا کام کیا کہ اردو زبان ہمیشہ ان کی زیرِ بارِ منت رہے گی۔فرہنگِ آصفیہ کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود ہاشمی لکھتے ہیں کہ اندراجاتِ لغت کے سلسلے میں 'فرہنگِ آصفیہ' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اردو کی پہلی مبسوط لغت ہے اور بعد کی تمام لغات کی تدوین کے لیے اسی لغت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔(۱۴)

مولوی عبدالحق کے بقول اگرچہ فرہنگِ آصفیہ میں بعض تحقیقی غلطیاں موجود ہیں۔بہت سے لفظ اور بعض محاورے بھی چھوٹ گئے ہیں اور زمانہ حال کی رو سے اس میں بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے۔بعض جگہ بے جا طویل نویسی سے کام لیا گیا ہے۔تاہم یہ کتاب ایسی ہے کہ مولف کو داد نہ دینا ظلم ہوگا۔اس حوالے سے جابر علی سید لکھتے ہیں:

> ''مولوی سید احمد دہلوی کی مرتبہ فرہنگِ آصفیہ اردو کے طلبہ و شعرا کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے اس کی تیاری میں کئی سال صرف ہوئے اور کئی دشوار مراحل سے گزر کر اپنی ترمیم شدہ صورت میں ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔''(۱۵)

جابر علی سید نے اس کا سالِ اشاعت ۱۹۱۸ء لکھا ہے جبکہ مولوی عبدالحق کے بقول اس کا کچھ حصہ اول ارمغانِ دہلی کے نام سے بالاقساط شائع ہوا اور اس کے بعد ہندوستانی لغت کے نام سے پہلی جلد ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔بعد ازاں نظام گورنمنٹ کی سرپرستی اور ہنر پروری کی بدولت فرہنگِ آصفیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ فرہنگِ آصفیہ میں فحش الفاظ اور محاوروں کے جمع کرنے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور دیباچہ میں اپنے اس فعل کی حمایت میں انھوں نے وضاحتیں پیش کی ہیں اس کے علاوہ بھی فرہنگِ آصفیہ میں کافی عجیب و غریب چیزیں درج کی گئی ہیں۔لیکن اس قسم کی بے ربطیاں اور لغزشوں کے باوجود مولف کی محنت نہایت قابلِ تعریف ہے۔

فرہنگِ آصفیہ کے بعد مولوی عبدالحق نے منشی امیر احمد مینائی کی امیر اللغات کا ذکر کیا ہے جس کا صرف پہلا حرف شائع ہوسکا۔اس لغت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس میں بڑی محنت اور تلاش سے کام کیا گیا ہے ۔ہر لفظ پر اعراب لگائے گئے ہیں اور رسمِ خط کی بھی پابندی کی گئی ہے۔ ہر لفظ کے ساتھ تذکیروتانیث اور جس زبان کا لفظ ہے اس کی علامت لکھ دی گئی ہے البتہ بہت کم کسی لفظ کی اصل بتائی گئی ہے اور پھر یہ کہ ایک ایک لفظ یا محاورے کے لیے کئی کئی شعر بلاضرورت نقل کیے گئے ہیں۔ یہ لغت ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔امیر مینائی اس لغت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ بات میرے بیان کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام چھیڑا جاتا ہے تو پہلے اس میں اکثر دقتیں پیش آتی ہیں۔سینکڑوں کتابوں کے ورق الٹے،اپنے پچھلے سرمائے سے جو سالہائے دراز کا ذخیرہ تھا مدد لی۔لائق لوگوں سے مشورے لیے۔خاص کمیٹی قائم کر کے بحثیں کیں۔ہزار ہا روپے خرچ ہوئے تب جا کر دو برس کی جانکاہی میں اس حصے کو مرتب کر پایا جس کو آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''(۱۶)

مولوی عبدالحق نے مولوی نورالحسن کی نوراللغات کو ایک اہم لغت قرار دیا ہے ان کے بقول لائق مولف نے اس کی ترتیب و تالیف میں بہت محنت و کوشش کی ہے اور ہر لفظ کے ساتھ اصل زبان کا اشارہ کر دیا ہے اعراب بھی لگائے ہیں اور اکثر الفاظ کا تلفظ عبارت میں بیان کر دیا ہے محاورات کے جمع کرنے اور ان کی تشریح میں پوری کوشش کی ہے۔دراصل مولوی نورالحسن نے امیر اللغات کے نامکمل کام کی تکمیل کے سلسلہ میں نوراللغات کی تالیف کی۔(۱۷) جبکہ ڈاکٹر مسعود ہاشمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ لغت اگرچہ امیر اللغات کی تکمیل کے طور پر مدون کرنے کی غرض سے شروع کی گئی تھی مگر مولفِ لغت نے اس کا انداز امیر اللغات کے انداز سے قطعاً مختلف اور جامع رکھا۔ایک تو یہ کہ مولفِ نوراللغات نے امیر اللغات کے غیر لغاتی اجزا کو اپنی لغت سے باہر رکھا؛یعنی انھوں نے اپنی لغت میں کسی اندراج،یا اندراج کے معانی کی صفات اور تشبیہات کو شامل نہیں کیا۔اس کے علاوہ اندراج کی اصل یا مآخذِ لسانی کی نشاندہی کے سلسلے میں امیر مینائی جیسی تلاش اور تحقیق سے بھی کام نہیں لیا۔''(۱۸)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس لغت میں بعض مقامات پر وہی غلطی کی ہے جو امیر اللغات کے مولف

سے ہوئی ہے اور بعض محاورات انہوں نے بالکل غیر ضروری درج کیے ہیں۔اسی طرح بعض عربی لفظ اس لغت میں ایسے بھی درج ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں اور غیر مانوس ہیں پھر یہ کہ دیباچہ میں متروکات کی ایک طویل فہرست ہے جس میں ایسے لفظ بھی آ گئے ہیں جو متروک نہیں اور اب بھی عام بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔وارث سرہندی نے انتہائی جامعیت کے ساتھ فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات کا موازنہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''فرہنگِ آصفیہ کو دلی کے لسانی دبستان کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے تو نوراللغات لکھنو کے لسانی دبستان کی نمائندہ ہے۔''(۱۹)

اس کے بعد مولوی عبدالحق نے منشی لالتا پرشاد شفق لکھنوی کی فرہنگِ شفق اور نواب عزیز جنگ حیدر آبادی کی آصف اللغات کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے نزدیک ان لغات کی اردو کے حوالے سے کوئی خاص اہمیت نہیں۔یہاں پر وہ خواجہ عبدالمجید کی مرتب کردہ جامع اللغات کا ذکر کرتے ہیں یہ صرف اردو زبان کی لغت نہیں بلکہ اردو، ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی سب زبانوں کا ملغوبہ ہے اور اس میں علاوہ الفاظ اور محاورات کے بول چال کے فقرے اور کہاوتیں بھی لکھ دی ہیں۔اعلام یعنی اشخاص اور جغرافیائی اسما بھی درج ہیں اور پھر یہ کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال کے لیے کہیں کوئی سند نہیں دی گئی اور نہ الفاظ کی اصل کی تحقیق کی ہے۔چنانچہ ان وجوہ سے مولوی عبدالحق اس لغت کو غیر مستند قرار دیتے ہیں۔وارث سرہندی جامع اللغات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جامع اللغات اردو کی سب سے بڑی لغت ہے جو چار جلدوں پر مشتمل اور بڑی تقطیع کے قریباً تین ہزار صفحات پر محیط ہے۔یوں تو اردو میں اور بھی متعدد کتب لغت ایسی ہیں جو چار جلدوں پر مشتمل ہیں اور ان کی ضخامت بھی کم و بیش اسی قدر ہے مگر ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے کوئی بھی اردو لغت جامع اللغات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔دوسری کتبِ لغت مثلاً ''فرہنگِ آصفیہ'' اور ''نوراللغات'' بھی چار چار جلدوں پر مشتمل ہیں، مگر ان کی ضخامت کا بیشتر حصہ اسناد میں صرف ہو گیا ہے۔'جامع اللغات' میں چونکہ اسناد پیش نہیں کی گئیں، اس لیے اس میں الفاظ کی تعداد دوسری کتبِ لغت سے کہیں زیادہ ہے۔اس میں وہ تمام الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اردو میں کسی نہ کسی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں یا استعمال ہو سکتے ہیں۔''(۲۰)

آخر میں مولوی عبدالحق مہذب لکھنوی کی تالیف مہذب اللغات کا تذکرہ کرتے ہیں جس کی پہلی قسط الف مقصورہ کے لفظ اٹھانا تک چھپ کر شائع ہو چکی تھی اس میں لفظ کے تلفظ کو الگ الگ حروفِ اعراب کے ساتھ لکھ

کر ظاہر کیا گیا ہے اور ہر اصل لفظ کو ناگری رسمِ خط میں بھی لکھ دیا گیا ہے لیکن وہ اس لغت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں الفاظ کی تحقیق مطلق نہیں کی گئی۔ فصاحت کا معیار لکھنوی ہے جس کا مدار شعرا کا کلام ہے۔

لغت نویسی کی تاریخ بیان کرنے کے بعد مولوی عبدالحق نے ایک کامل لغت کی خصوصیات کو مختصراً بیان کیا ہے جن پر عمل کر کے ایک معیاری لغت ترتیب دی جا سکتی ہے۔ اُن کے بقول:

> ''ایک کامل لغت میں ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہوگا کہ یہ کب کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل وصورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ اس کے کون کون سے معانی متروک ہو گئے اور کون کون سے ابھی باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معانی پیدا ہوئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل کی تحقیق کرنی ہوگی۔ یعنی یہ بتانا ہوگا یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معانی تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔ لفظ کی تاریخی حالت معلوم کرنے کے لیے اصل یا اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے اس کے علاوہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مماثل اور ہم علاقہ الفاظ کے صحیح تعلقات اور ہم شکل مگر مختلف الاصل الفاظ کی ترتیب اور ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔'' (۲۱)

اسی طرح مولوی عبدالحق نے اردو لغات کی کمزوریوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عموماً ان میں لفظ کی تعریف نہیں دی جاتی بلکہ اکثر لفظ کے سامنے اس کے کئی کئی مترادفات لکھ دیے جاتے ہیں جبکہ صرف مترادف لکھ دینے سے صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا بلکہ ہر لفظ کی تشریح وتوضیح کرنا ضروری ہے تا کہ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچا جا سکے۔ اسی طرح مولوی عبدالحق کے بقول ہمارے اکثر لغت نویس اس بات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں کہ لغت میں جو بھی لفظ ہو مستند اور فصیح ہو اور کوئی ٹکسال باہر نہ ہو۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک یہ درست نہیں لغت میں سب لفظ ہونے چاہئیں خواہ وہ رائج ہوں یا متروک اور ان کے تمام معانی اور استعمال درج کرنے لازم ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لغات میں مترادفات کے اندراج کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ایک اہم مرحلہ تشریح نگاری ہے، جو لغت کا اصل مقصد ہے۔ ہر لفظ جو زبان میں بولا

جاتا ہے اپنے مخصوص معانی رکھتا ہے بات یہ ہے کہ ہم نے مترادف کی اصطلاح تو بنالی لیکن حقیقت میں مترادفات کا کوئی وجود نہیں صرف اتنا ہے کہ بعض الفاظ میں معانی کے چند اجزاء مشترک ہوتے ہیں ہم ان میں سے بعض کو مترادف قرار دے دیتے ہیں ہر لفظ نہ صرف معانی کے اعتبار سے بلکہ محلِ استعمال اور سیاق وسباق کے اعتبار سے بھی منفرد ہوتا ہے اور لغت نگار کو معانی کی باریکیوں تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔'' (۲۲)

مولوی عبدالحق کی یہ بھی رائے ہے کہ متروک الفاظ کے اندراج میں کافی احتیاط اور سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہ ایک انتہائی حساس فیصلہ ہوتا ہے کہ کون سا لفظ اس وقت متروک ہو چکا ہے اور کس لفظ کا استعمال ابھی جاری ہے لیکن وہ ایک مستند لغت میں متروک الفاظ کا داخل کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ انہی کے ذریعے اساتذہ کے کلام کو سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔

ایک اور مسئلہ جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ لغت میں کون سے الفاظ شامل کرنے چاہئیں کیا زبان کی پیدائش سے لے کر موجودہ وقت تک کے تمام الفاظ کو شامل کر لینا چاہیے۔ لیکن اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے اور اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں چنانچہ اس مسئلے کا حل انہوں نے اپنی لغت میں یہ نکالا کہ ولؔی سے لے کر اُس وقت تک کے تمام الفاظ کو شامل کیا گیا۔ علوم وفنون کی اصطلاحوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ان الفاظ کو لغت میں ضرور شامل کرنا چاہیے جو اب اردو میں داخل ہو چکی ہیں اور ایسی اصطلاحوں اور محاوروں کو جو کس مپرسی کے عالم میں اور اب بھولے بسرے لفظوں میں شمار ہوتے ہیں ان کو لغت میں ضرور جگہ دینی چاہیے۔ البتہ ایسی اصطلاحوں سے گریز کرنا چاہیے جو کافی پیچیدہ ہوں اور تشریح کے باوجود بھی سمجھ نہ آسکیں۔

ایک بحث انہوں نے یہ کی ہے کہ ایک ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا میں کہاں تک فرق روا رکھنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں آکسفورڈ ڈکشنری کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں ایسی معلومات سے سختی کے ساتھ گریز کیا گیا ہے جن میں صرف اشیاء کا بیان ہوتا ہے اور جو انسائیکلوپیڈیا کے ذیل میں آتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک انسائیکلوپیڈیا اور لغت میں بنیادی فرق ہوتا ہے لیکن مولوی عبدالحق یہ سمجھتے ہیں کہ اس اصول کی سختی کے ساتھ پابندی لغت کے حق میں مضر ہوتی ہے کیونکہ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تشریح کامل طور پر اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ان اشیاء کا جن کا وہ مفہوم ادا کرتے ہیں کچھ نہ کچھ ذکر نہ کیا جائے۔ اس لیے ایک ڈکشنری کے صحیح طور پر مرتب کرنے کے لیے دونوں طریقوں کا امتزاج خاص کر اردو لغت میں ضروری ہے۔

اردو لغات میں جدید الفاظ کی شمولیت کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایک نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے نئے الفاظ کو زبان آسانی کے ساتھ قبول نہیں کرتی لیکن ہر زندہ زبان کے لیے نئے الفاظ کا بنانا ناگزیر ہوتا ہے اردو میں بھی ہر وقت نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی لیے ایک اردو کا لغت نویس ان الفاظ کو نظر انداز نہیں کرسکتا جو اردو میں شامل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح لغت نویسی میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہر لفظ اور محاورے کی سند پیش کی جائے جو کسی مستند ادیب کے کلام سے ہو اس کے ساتھ ہی ایک مفہوم یا استعمال کے لیے بلاوجہ بہت سی مثالیں نہ لکھی جائیں اسی طرح لغت نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صلات کی طرف بھی توجہ دے۔ لغت میں الفاظ کے صحیح تلفظ کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم طریقہ اچھا تھا اس میں تلفظ عبارت میں ظاہر کر دیا جاتا تھا اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوسکتا تھا مثلاً کرشمہ: بہ فتح ک و کسر ر و بہ سکون ش بہ فتح م اور سکون ہ۔ لیکن اس میں طوالت تھی اور پڑھنے میں الجھن ہوتی تھی اب متروک ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اعراب اور ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں ان کا تعین کر دیا جائے اور انہیں لغت کے شروع میں مثالوں کے ساتھ لکھ دیا جائے اور لغت میں ان کے مطابق احتیاط سے لفظ کے حروف پر یہ اعراب لگا دیے جائیں۔ جن الفاظ کے تلفظ میں غلطی کا احتمال ہو ان کو قوسین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا الگ الگ حروف میں اعراب کے ساتھ لکھ دینا چاہیے مثلاً: ''چ ٹک'' بعض اچھے ادیبوں اور شاعروں کو اس کا تلفظ ''چ ٹ ے ک'' کرتے سنا ہے یا مثلاً ''جھیلنا'' (جھے ل نا) کو بعض اشخاص ''جھی ل نا'' بول جاتے ہیں۔'' (۲۳)

ایک جدید لغت کے لیے وہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک لغت نویس تمام اردو ادب کا بغور مطالعہ کرے اور اس میں زبان کے تمام الفاظ کو تحقیق کے بعد ضروری اسناد کے ساتھ پیش کیا جائے جبکہ اس وقت زیادہ تر لغات میں ایک دوسرے کی نقل ملتی ہے جو صحت مند رجحان نہیں۔ چنانچہ ایک معیاری لغت مرتب کرنے کے لیے کافی محنت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ اشخاص کی معاونت اور وسیع سرمائے اور وسائل کا ہونا لازمی ہے جبکہ ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ جس میں اردو ادب کا کامل ذخیرہ، مختلف زبانوں کی لغات اور علوم وفنون کی کتابیں موجود ہوں، لازمی طور پر دسترس میں ہونا چاہیے۔

مولوی عبدالحق کے پیش نظر اردو لغت کا تمام ذخیرہ تھا وہ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری

طرح آ گاہ تھے اور اردو میں معیاری اور ایسی جامع لغت کی کمی کو محسوس کرتے تھے جو اردو زبان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو اور لغت نویسی کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہو کیونکہ اس قسم کی لغت اردو زبان و ادب کے فروغ میں بے حد معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے لغتِ کبیر کی تالیف کا منصوبہ بنایا۔ شہاب الدین ثاقب لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق اپنی کوششوں کے ساتھ اس بات کے خواہاں تھے کہ اردو زبان ترقی کی معراج کو پہنچ جائے تاکہ اس کے ذریعہ تمام علوم وفنون کے اظہار میں آسانی ہو۔ زبان کا اصلی سرمایہ اس کا ذخیرہ الفاظ ہے جس کا اندراج لغت میں ملتا ہے۔ مولوی صاحب کو اردو لغت کی تالیف کا ایک زمانہ سے خیال تھا جس کو ۱۹۱۸ء میں انہوں نے عملی شکل دینا چاہا تھا، لیکن انجمن کے وسائل اس طویل منصوبہ کے لیے ناکافی تھے۔ وحیدالدین سلیم کی وفات کے بعد ۱۹۳۰ء میں مولوی صاحب نے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری اس شرط پر قبول کی کہ حکومتِ حیدر آباد نے اردو لغت کے منصوبے کی تکمیل کے لیے دس برس تک بارہ ہزار روپے سالانہ (سکہ عثمانیہ) امداد کی منظوری دے دی تھی چنانچہ مولوی صاحب نے اردو لغت کا دفتر بھی حیدر آباد میں قائم کیا اور اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔'' (۲۴)

چنانچہ اس لغت کی تیاری کا آغاز باقاعدہ طور پر کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے قابل لوگوں کی ایک پوری ٹیم کو لغت کے حوالے سے مختلف امور کی ذمہ داری سونپی۔ ڈاکٹر سید معراج نیر اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب موصوف نے اپنے اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے جواہرِ قابل ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیے اور اس لغت کی تدوین، تالیف اور تراجم کے لیے ان کی صلاحیت سے پورا پورا استفادہ کیا۔ مولوی احتشام الحق حقی دہلوی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پنڈت کیفی، سید ہاشمی فرید آبادی، پنڈت ونشی دھر، سجاد حیدر یلدرم، عبدالماجد دریا آبادی اور ڈاکٹر عابد حسین لغت کی تیاری میں معاون اور صلاح کار تھے جو بے لوث اس کام پر جت پڑے۔ جنہیں نہ صلے کی پروا تھی اور نہ ستائش کی تمنا۔'' (۲۵)

مولوی عبدالحق اس لغت کی تیاری میں انتہائی باریک بینی کے ساتھ اردو زبان کے الفاظ کو ان کے

تاریخی پس منظر کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے اور الفاظ کے اصل کا کھوج لگا کر ان کے معانی کی تہوں تک پہنچنا اس لغت کا مقصود تھا۔ سید ہاشمی فرید آبادی اُن کی لغت کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جناب مولوی صاحب کا منصوبہ یہ تھا کہ الفاظ کی اصل اور گزشتہ تعریف کو تفصیل و تحقیق سے لکھا جائے جس پر سابق لغت نویسوں نے کوئی خاص اعتناء نہ کی تھی۔ بہت سے الفاظ سہواً اور متروک سمجھ کر چھوڑ دیے گئے تھے۔ مرکب الفاظ سے اردو میں نئے نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مروجہ لغات میں یہ پہلو بھی خاصا تشنہ رہ گیا تھا دوسرے قدیم و جدید مصطلا حاتِ علم وفن شامل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب اپنی جامع لغت میں ان سب کو حتی الامکان شامل کرنا چاہتے تھے۔ الفاظ و محاورات کی اسناد تلاش کرنے میں مصنفینِ نظم ونثر کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ دکنی لغات جواب متروک ہیں دو تین جلدوں میں مرتب کر کے کتاب کا ضمیمہ بنا دیے جائیں۔ غرض بڑے منصوبوں کے ساتھ پوری مستعدی سے کام کا آغاز ہوا۔'' (۲۶)

اگر چہ اس لغت کی تیاری میں مولوی عبدالحق کے ساتھ بہت سے افراد نے حصہ لیا لیکن وہ اس تمام کام کی نگرانی خود کرتے رہے۔ تمام ماہرین کے کام کو وہ خود دیکھتے اور ان میں ضروری اصلاح اور ترمیم ساتھ ساتھ کرتے جاتے۔ پھر یہ کہ ہر موڑ پر وہ اپنے مشورے اور ہدایات دیتے رہے۔ ہاشمی فرید آبادی کے نام ۲۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو لکھے گئے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''تمہاری رخصت کب تک ہے۔ ڈکشنری کا کیا حشر ہوا مجھے اس کی بڑی فکر ہے اس میں بہت کام باقی ہے چند اصطلاحیں جو آپ لوگ بیٹھ کر کر لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بہت کام ہو گیا اصل ڈکشنری ان اصطلاحوں میں نہیں ان روزمرہ کے معمولی لفظوں میں ہے جسے تم لوگ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔'' (۲۷)

چنانچہ لغت کی ترتیب و تدوین کا کام تندہی سے جاری رہا۔ تمام ماہرین نے اپنے حصے کا کام انتہائی محنت سے جمع کیا اور لغت کے لیے فراہم کیا لیکن مولوی عبدالحق اس لغت کے سلسلے میں کڑے معیاروں کو سامنے رکھے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے بار بار اس جمع شدہ مواد کو تنقیدی زاویے سے دیکھا اور نظرِ ثانی کی۔ اس حوالے سے سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''ان سب کاموں کو خود مولوی صاحب بار بار دیکھتے اور جزوی تلاش و تحقیق تک میں شریک ہوتے تھے۔ طرفہ تر یہ کہ جس قدر کام زیادہ ہوا مولوی صاحب کے منصوبے بڑھتے رہے۔ چنانچہ گو دس بارہ برس میں لغت کا اتنا کچھ سرمایہ فراہم ہو گیا کہ پہلے کسی کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا، کتاب تکمیل کو نہ پہنچی چند اجزاء حیدر آباد کے سرکاری مطبع میں چھپے تھے کہ ''آزادیِ ہند'' کی آندھیوں میں وہ دفتر ہی پراگندہ ہو گیا۔'' (۲۸)

اس لغت کے لیے اردو زبان و ادب کے ایک وسیع ذخیرے کو کھنگالا گیا اور لاکھوں الفاظ اکٹھے کیے گئے اور پھر ان کو مناسب ترتیب سے لغت کے لیے جمع کیا گیا۔ یہ ایک طویل منصوبہ تھا جو مختلف مراحل میں مکمل ہونا تھا۔ ۱۹۴۶ء تک اس کی پہلی جلد طباعت کے لیے مکمل ہوئی۔ اس جلد کے حوالے سے مولوی عبدالحق، غلام رسول مہر کے نام اپنے ۲۶ جون ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''لغت کی ترتیب میں بڑی دردسری اٹھانی پڑ رہی ہے پھر بھی جیسی میں چاہتا تھا نہ ہوئی کہنے کو تو ہم بہت کچھ ہیں لیکن اس لغت کی تیاری کے دوران میں معلوم ہوا کہ ہماری زبان کس قدر وسیع ہے اور اس میں کیسی کیسی صلاحیتیں ہیں۔ اب نظرِ ثانی اور ثالث کے بعد صرف پہلی جلد طبع کے لیے مکمل ہوئی ہے اس میں صرف الفِ ممدودہ کے الفاظ ہیں جو ایک ہزار صفحہ پر آئے ہیں اس کے بعد الفِ مقصورہ کو دیکھنا شروع کروں گا۔'' (۲۹)

اس سالہا سال کی محنت اور جانفشانی کے بعد اردو لغت کے لیے ایک قابلِ قدر مواد جمع ہو چکا تھا اور اس کی اشاعت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مولوی عبدالحق کی اردو زبان کی معیاری لغت کے منصوبے کی تکمیل کا مرحلہ آن پہنچا تھا کہ اسی دوران میں تقسیمِ ہند عمل میں آئی اور فسادات کی آندھی چل پڑی جس سے انجمن ترقی اردو بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ دلی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر کو تباہ کر دیا گیا اور وہاں پر موجود دیگر قیمتی کتابوں اور نسخوں کے ساتھ لغت کا یہ جمع شدہ مواد بھی ضائع کر دیا گیا۔ مولوی عبدالحق کو اس کا ہمیشہ افسوس رہا۔ ردی کے ڈھیر سے بچا کھچا مواد لے کر وہ کراچی پہنچے لیکن انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور یہاں آ کر اردو لغت کی ترتیب کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ جمیل الدین عالی لکھتے ہیں:

''بہر حال کسی نہ کسی طرح مولوی صاحب کارڈوں کے چند پلندے اور کچھ حوالے دہلی سے کراچی منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ذہناً انہوں نے

یہ منصوبہ ترک نہیں کیا تھا چنانچہ پاکستان میں انجمن کی تنظیم کرتے ہی انہوں نے خود اس منصوبے پر دوبارہ کام کرنا شروع کیا اور جب تک زندہ رہے اس پر کام کرتے رہے۔'' (۳۰)

چنانچہ کراچی میں آنے کے بعد مولوی عبدالحق نے اردو لغت پر تنہا کام شروع کر دیا۔ انجمن ترقی اردو کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس سلسلہ میں باقاعدہ عملہ متعین کیا جاتا اور معاونین کی مدد حاصل کی جاتی۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے پاس انجمن کے کاموں سے جو فارغ وقت بچتا وہ بڑی محنت سے اس لغت کی تدوین میں صرف کرتے۔ انہوں نے اس لغت کے سلسلہ میں تین حروف الف، ب، بھ، پر مشتمل الفاظ مرتب کر لیے تھے کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ان کے اس تمام کام کو شائع کرنا انجمن کے وسائل سے باہر تھا۔ آخر ۱۹۷۲ء میں لغتِ کبیر جلد اول شائع ہوئی جس میں مولوی عبدالحق کا مقدمہ بھی شامل تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے یہ مقدمہ اردو لغت نویسی کے حوالے سے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی لغتِ کبیر کے حوالے سے شہاب الدین ثاقب لکھتے ہیں:

''یہ اردو زبان کی بدقسمتی ہے کہ مولوی صاحب لغتِ کبیر کے منصوبے کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے لیکن لغت کے جتنے حروف انہوں نے جمع کیے وہ بھی کچھ کم وقیع نہیں ہیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی نے لغت کبیر کی دوسری جلد (حصہ اول) ۱۹۷۷ء میں شائع کرا دی جو ۳۶۰ صفحات کی ہے اور الف مقصورہ کے چند اجزاء پر مشتمل ہے۔'' (۳۱)

مولوی عبدالحق نے لغتِ کبیر کی ابتداء الف ممدودہ سے تشکیل پانے والے الفاظ سے کی ہے اور اس کے بعد الف مقصورہ کے الفاظ کو شامل کیا گیا ہے۔ الفِ ممدودہ کے بارے میں وہ لغتِ کبیر میں لکھتے ہیں کہ اصل میں یہ دو الف کا مجموعہ ہے جن میں ایک مد ہو گیا ہے اسی لیے اسے ممدودہ کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اب سے پہلے آ کو جگہ دی ہے۔ مولوی عبدالحق کی اس ترتیب کو سید قدرت نقوی بھی درست قرار دیتے ہیں۔ (۳۲)

اکثر اردو لغت نویسوں نے اپنی لغات کی ابتداء الف ممدودہ سے ہی کی ہے ان میں مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگِ آصفیہ، مولوی نور الحسن نیر کی نور اللغات، خواجہ عبدالمجید کی جامع اللغات، وارث سرہندی کی علمی اردو لغت، مولوی فیروز الدین کی فیروز اللغات، محمد عبداللہ خان خویشگی کی فرہنگِ عامرہ، مولوی سید تصدق حسین رضوی کی لغاتِ کشوری، اور ذوالفقار احمد تابش کی اعجاز اللغات وغیرہ میں الفاظ کی ترتیب میں الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ کو سب سے پہلے درج کیا گیا ہے جبکہ سید قائم رضا نسیم امروہوی کی نسیم اللغات اور ترقیِ اردو بورڈ کراچی کی مرتب کردہ اردو لغت میں ترتیب کے لحاظ سے الف مقصورہ کے الفاظ کو فوقیت دی گئی ہے۔ نسیم اللغات میں الف کے

سلسلہ میں لکھا گیا ہے:

''ا:- (مذ) عربی فارسی اوراردو کے حروفِ تہجی کا پہلا حرف، لکھنے میں اکائی کے پہلے ہندسے کی صورت، حسابِ جمع میں اس کا ایک عدد مقرر ہے، جو الف کھینچ کر نہ پڑھا جائے وہ الف مقصورہ کہلاتا ہے (جیسے اب کا الف)، جو کھینچ کر پڑھا جائے اسے الف ممدودہ کہتے ہیں (جیسے آم کا الف)، یہ دو الفوں کا قائم مقام ہوتا ہے۔'' (۳۳)

ترقی اردو بورڈ کراچی کی 'اردو لغت' میں جو الف کے حوالے سے تفصیل دی گئی ہے اس میں الف کی تین صورتوں کو بیان کیا گیا ہے:

''ا (اَلِف) حرف ہجا، امذ۔

اردو حروف تہجی کا پہلا حرف جو عربی رسم الخط پر مبنی بعض دوسری پاکستانی اور بیرونی زبانوں میں بھی مشترک ہے؛ اصلاً فینیقی، الف کے نام سے موسوم، عموماً ایک کھڑی لکیر سے شناخت ہوتا ہے۔ یہ حرف علت (مُصَوِّتہ) ہے، کبھی الفاظ کے شروع میں، جیسے: اَب، اِدھر، اُدھر، اولاً اَوگھٹ، اُوپر، اَیمَن، اِیمان، اِفادہ؛ کبھی درمیان یا آخر میں، جیسے: کار، جا۔ البتہ عربی سے ماخوذ بعض الفاظ میں درمیان کلمہ تلفظ مختلف ہوتا ہے، جیسے: جُرأت، تَأَثُّر، تَأَمُّل:۔۔۔ متحرک الف کو عربی میں ہمزہ کہتے ہیں۔

الف کی دو صورتیں ہیں: مقصورہ اور ممدودہ، آخرالذکر کھینچ کر پڑھا جاتا ہے اور دو الفوں کے برابر ہوتا ہے اور اس کے اوپر یہ علامت ہوتی ہے جسے مد کہتے ہیں۔ بعض عربی اسماء میں اسے کسی حرف کے اوپر چھوٹے کھڑے خط یا نصف الف کی صورت میں بھی لکھا جاتا ہے جیسے: اعلیٰ، ادنیٰ، اسمٰعیل، اسحٰق، عیسیٰ، موسیٰ، مرتضیٰ، الٰہی، ربوٰ، زکوٰۃ، مشکوٰۃ وغیرہ۔ املا میں اسے بعد میں آنے والے حرف سے جوڑ کر نہیں لکھا جاتا، البتہ دڈ ذ رڑ زژ و، نیز ان کے ہائیہ کے سوا باقی حروف ماقبل کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔'' (۳۴)

اسی طرح 'اردو لغت' میں الف ممدودہ کی مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

''ا (الف بالفتحہ) کی ممدودہ یا طویل شکل اور دو الف سے مرکب (فارسی کا پہلا حرف تہجی، ہندی کا دوسرا حرف)، جمل کے حساب سے اس کا عدد ؛ا ہے۔ بعض کے نزدیک ۲

بھی۔ جدید لسانیات میں اولین حرف علت۔ تلفظ کے وقت چونکہ منہ پوری طرح کھلا رہتا ہے
اس لیے اسے کھلا حرفِ علت کہتے ہیں۔ اس کا مخرج منہ کا پچھلا حصہ ہے۔ کلمے کے شروع یا وسط
میں آتا ہے، جیسے: آفت، مآل۔'' (۳۵)

جبکہ مولوی نورالحسن نیر الف مقصورہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلا حرف علمِ حساب میں اکائی کے پہلے ہندسے کی صورت ہے۔(۳۶)، جبکہ الف ممدودہ کو وہ دو الف سے مرکب قرار دیتے ہیں لیکن ان کے مطابق قاعدہ جمل میں ایک ہی عدد اس کا لیا جاتا ہے۔(۳۷)، الف کے حوالے سے سید قدرت نقوی نے تفصیلاً بحث کی ہے ۔وہ لکھتے ہیں:

''یہاں اور امور سے پہلے ایک نہایت اہم بات کا اظہار ضروری ہے کہ آج کل الف ممدودہ، الف مقصورہ الف کی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ خود الف کو غائب کر دیا گیا ہے۔ صحیح صورت یہ ہے ''ا'' الف'' آ '' الف ممدودہ۔ ادنیٰ، اعلیٰ، زکوٰۃ، صلوٰۃ میں الف مقصورہ ہے۔ غور فرمایئے۔ مدوقصر کسی متوازن صورت میں واقع ہوگا۔ شکل متوازن نہ ہوگی تو قصر و مد کس میں واقع ہوگا۔ اس، ان، اب میں الف ہے۔ آم، آن، آج میں الف ممدودہ ہے اور مذکورہ بالا الفاظ'' ادنیٰ، صلوٰۃ،'' میں ''ی، و'' پر جو الف ہے وہ الف مقصورہ ہے۔ شکل اور آواز کے لحاظ سے ہم جب بچوں کو پڑھاتے ہیں تو ''الف (ا) سے انار؛ الف مدہ (آ) سے آم'' پڑھاتے ہیں۔ یہاں الف مقصورہ سے انار آج تک کسی نے نہیں پڑھایا اور نہ بتایا۔ الف مقصورہ سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔ الف مقصورہ ہمیشہ وسط و آخر کلمہ میں آئے گا۔ الف ہر جگہ یعنی ابتدا، وسط اور آخر میں آتا ہے۔ اردو میں الف ممدودہ (آ) ہمیشہ ابتدا میں آئے گا۔ وسط میں عربی کے چند لفظوں میں آتا ہے، جیسے'' مآل، قرآن، مآثر وغیرہ۔ پس الف (ا) کو الف مقصورہ کہنا اور لکھنا کسی طرح بھی درست و جائز نہیں ہے۔۔۔ درحقیقت یہ قیاس کی غلطی ہے کہ الف ممدودہ کے قیاس پر الف (ا) کو بھی الف مقصورہ قیاس کر لیا۔ یہ صرف لغات میں حرف کی تقطیع بندی کے عنوان کے طور پر لکھتے ہیں ورنہ اور عبارتوں میں صرف الف (ا) ہی لکھا جاتا ہے۔ لغات کی دیکھا دیکھی بعض نے لغوی یا قواعدی سلسلے کی عبارات میں بھی الف مقصورہ لکھ دیا ہے۔ بات صحیح یہی ہے کہ الف (ا) الف ممدودہ (آ) الف مقصورہ (ادنیٰ، صلوٰۃ) میں ''ی'' اور ''و'' پر نصف

الف۔''(۳۸)

اس تمام بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی بھی معیاری لغت میں سب سے پہلے الف ممدودہ کے الفاظ کو ہی شامل کیا جائے گا کیونکہ الف ممدودہ دو الف کا مجموعہ ہے اور مولوی عبدالحق کی لغتِ کبیر میں الفاظ کی ترتیب بالکل درست ہے۔ چنانچہ اس لغت میں جلد اول الف ممدودہ ہی پر مشتمل الفاظ سے مرتب کی گئی ہے۔

ڈاکٹر مسعود ہاشمی مولوی عبدالحق کی لغتِ کبیر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی کمزریوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اس لغت میں ایسی مثالیں تلاش کرتے ہیں جن کے مطابق مولوی عبدالحق نے الفاظ کی لغاتی حیثیت کے تعین میں غلطی کرتے ہوئے ان کی تصریفی اور غیر لغاتی شکلوں یا قواعدی استعمال کی نوعیتوں کو بھی اندراجِ لغت کی حیثیت دے دی ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''آ کو ایک لغاتی اندراج مانا گیا ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے پہلے تو (معنی نمبرا) اسم مونث بتاتے ہوئے موسیقی کی اصطلاح میں اس کے معنی ''طویل لَے'' دیے گئے ہیں جو کہ بالکل درست ہے۔ لیکن قباحت اس کے معنی نمبر۲ تا ۶ سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ان معنوں کے لحاظ سے ہی اس کے کئی غیر لغاتی اندراجات شامل لغت کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ آ کے بعد دوسرا بنیادی اندراج آ آ بھی ہے۔ جو کہ لغاتی اکائی (LEXICAL UNIT) کے بجائے 'آنا' کی ایک محض تصریفی شکل ہے۔ خود مولفِ لغت نے اس کے معنی دیے ہیں۔

(۱) آ کی تاکید وتکرار، کثرت اور بہتات کے اظہار کے لیے جیسے: ناک میں دم آ آ گیا (۲) تف، آ آ کر، کا مخفف بمعنی بار بار، جیسے مکھیاں آ آ بیٹھتی تھیں (۳) مث) آ (معنی (۱) کی تکرار، م: آ آ زیادہ کرتی اور اس اندراج کے مذکورہ بالا تینوں معنوں سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ صرف آنا کی تصریفی شکل ہے اور قواعدِ زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر آ اور آ آ کو؛ جو کہ محض تصریفی شکل ہیں، لغاتی اندراج کی حیثیت دینی ہوگی تو پھر اردو کے تمام افعال کی تصرفی شکلوں کو بھی لغاتی اندراج کی حیثیت دینی ہوگی اور اس کے مطابق جا، جاجا، کھایا، کھا کھا، رو، رورو، سو، سوسو، وغیرہ کو بھی لغت میں شامل کرنا ہوگا۔ بات بالکل واضح ہے کہ جس طرح کھانا کا امر کھا، جانا کا امر جا، اور ان کی تاکید وتکرار کھا کھا، جا جا بنتی ہیں، وہی صورت آنا کے امر آ اور اس کی تاکید وتکرار آ آ کی بھی ہے۔ اس کا تعلق محض قواعد سے

ہے۔اس لیے ان تصریفی شکلوں کو شاملِ لغت کرنے کا کوئی جواز سامنے نہیں آتا۔'' (۳۹)

مولوی سید احمد دہلوی فرہنگِ آصفیہ میں آ کو آنا مصدر سے امرِ واحد کا صیغہ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جتنے معنوں میں اس کا مصدر آتا ہے اتنے ہی معنوں میں یہ حرف بولا جاتا ہے۔(۴۰) اسی طرح مولوی نور الحسن نور اللغات میں اسے آنا کا صیغہِ امر حاضر اور جا کی ضد لکھتے ہیں۔(۴۱)

مولوی عبدالحق نے لغتِ کبیر میں مختلف مخففات بھی استعمال کیے ہیں جن کی وضاحت ابتداء ہی میں کر دی گئی ہے۔ یہ مخففات درج ذیل ہیں:

''ار = اردو

انگ = انگریزی

پ = پراکرت

ت = ترکی

د = دیہاتی

س = سنسکرت

ص = صفت

ع = عربی

عو = عورتوں کی زبان

ف = فارسی

فع = فارسی عربی

ف ل = فعل لازم

ف م = فعل مستعدی

قف = قدیم فارسی

مث = مونث

مذ = مذکر

مف = متعلق فعل

ہ = ہندی

ہف = ہندی فارسی'' (۴۲)

چنانچہ ان مخففات کا استعمال ہر لفظ کی وضاحت کے لیے کیا گیا ہے جس سے کسی لفظ کی تفہیم میں سہولت رہتی ہے اور بے جا طوالت بھی پیدا نہیں ہوتی۔لغتِ کبیر میں ان مخففات کے اندراج کا انداز اس طرح ہے: آویختہ (ص)، آویزاں (ص)، آویزش (مث) آویزہ (مذ) آئے دن (مف)۔

مخففات کا استعمال اردو کی تمام لغات میں کیا گیا ہے البتہ ہر لغت نویس نے اپنی سہولت اور لغت کی ضرورت کے پیشِ نظر مخففات کی صورت اور تعداد میں اضافہ و ترمیم کی ہے اور اس ذریعے سے اپنی لغت کی تفہیم میں سہولت پیدا کی ہے۔اس سلسلہ میں 'اردو لغت' میں 'تلخیصات و اشارات' کے عنوان کے تحت مخففات درج کیے گئے ہیں اور ان مخففات کی درجہ بندی بھی کی گئی ہے ان مخففات کو اعراب و حرکات، قواعد، زبانیں، متفرق کی ذیلی سرخیوں کے تحت درج کیا گیا ہے۔اعراب و حرکات کے مخففات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو ساتھ ساتھ مثالوں کے ذریعے واضح بھی کیا گیا ہے۔

''تلخیصات و اشارات

ا۔اعراب وحرکات:

فت = فتحہ (جیسے: 'لب'، کے 'ل' کا فتحہ)۔

فت مج = فتحہ مجہول (جیسے: زَہر، کی 'ز' کا فتحہ)۔

کس = کسرہ (جیسے: 'دل' کی 'د' کا کسرہ)۔

کس مج = کسرۂ مجہول (جیسے: 'اِہتمام'' کے 'الف' اور 'ت' کا کسرہ)۔

ضم = ضمہ (جیسے: 'کل' کے 'ک' کا ضمہ)۔

ضم مج = ضمہ مجہول (جیسے: 'عہدہ' کے 'ع' کا ضمہ)۔

سک = سکون (جیسے: 'سبز' کی 'ب' کا سکون)۔

شد = تشدید (جیسے: 'ڈبّا' کی 'ب' کی تشدید)۔

تن = تنوین (جیسے: 'فوراً' اَباً عن جدٍ، کی 'ر' اور 'د' کی تنوین)۔

مخ = مخلوط (جیسے: 'کیوں' کا 'ک ی')۔

غنہ = نون غنہ (جیسے: 'جنگل' کا 'ن')۔

مغ = نون مغنونہ (جیسے: 'منگایا' کا 'ن')۔

معد = واو معدولہ (جیسے: 'خورشید' کا 'و')۔

لف = الف ملفوف (جیسے: '......انہ' (لاحقے) کا 'ا')۔

غم ا = غیر ملفوظ الف (جیسے: 'بالکل' کا 'ا')۔

غم ال = غیر ملفوظ الف اور لام (جیسے: 'اہل الرائے میں 'الر' کا 'ال')۔

غم و = غیر ملفوظ واو (جیسے: 'اوس' (= اُس) کا 'و')۔

غم ی = غیر ملفوظ ے (جیسے: 'ایدھر' (= اِدھر) کی 'ی')۔

۲۔ قواعد

ج = جمع عربی
جج = جمع الجمع عربی۔

مج = مجہول
امذ = اسم مذکر

امث = اسم مونث
صف = صفت

مذ = مذکر
مث = مونث

م ف = متعلق فعل
ف ل = فعل لازم

ف م = فعلِ متعدی ف مر = فعل مرکب

۳۔ رباعی

ا = اردو
اَنگ = انگریزی

اوستا = اوستائی
بنگ = بنگلہ

پ = پراکرت
پا = پالی

پر = پرتگالی
پن = پنجابی

تُر = ترکی
س = سنسکرت

سر = سریانی
ع = عربی

عبر = عبرانی
ف = فارسی

فر=فرانسیسی	گج=گجراتی
لاط=لاطینی	ہ=ہندی
یو=یونانی	

۴۔متفرق

اف=افعال	د=دیوان
رک=رجوع کیجئے	عو=عوام
عور=عورات	ف=فعل
ق=قلمی	قب=مقابلہ کیجئے
ک=کلیات	ہندو=ہنود کی بول چال'' (۴۳)

اس طرح 'اردو لغت' میں مخففات کو مزید واضح انداز میں لکھا گیا ہے اور ان کی تعداد بھی لغتِ کبیر سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ جہاں تک اردو کی دیگر لغات کا تعلق ہے اُن میں اگر چہ مخففات کا استعمال کیا گیا ہے لیکن ان میں سے اکثر میں اس طرح با قاعدہ انداز میں مخففات کی فہرست درج نہیں کی گئی۔ جس سے ان کو سمجھنے میں کسی قدر دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر لغات کا رسم الخط اور کتابت اس انداز میں کی گئی ہے کہ ایک ہی نظر میں عبارت کو پڑھنا اور سمجھنا کافی دشوار ہوتا ہے۔ کیونکہ لغات میں مواد بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس کو کم جگہ میں سمونے کی کوشش کی جاتی ہے اس وجہ سے بھی عبارت کے درج کرنے میں کافی دشواری رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں 'فرہنگِ آصفیہ' اور 'نور اللغات' کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن میں عبارت کو ایک ہی نظر میں جانچنا قدرے مشکل ہے۔ لیکن 'لغتِ کبیر' میں اردو ٹائپ کی وجہ سے عبارت واضح اور جاذبِ نظر ہے اور اس کے ساتھ عبارت کو اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ کسی قسم کی دقت کے بغیر تحریر کو پڑھا جاسکتا ہے۔

لغتِ کبیر میں ایک چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس میں زیادہ سے زیادہ الفاظ شامل کرنے کی کوشش میں بعض ایسے اندراجات بھی کر دیے گئے ہیں جو ایک لغت کے لیے غیر ضروری ہیں اسی طرح بعض ایسے الفاظ کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کی وہ خود بھی سند پیش نہیں کر سکے۔ خصوصاً جب انہوں نے اپنے مقدمے میں جامع اللغات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ یہ عربی فارسی سب زبانوں کا ملغوبہ ہے اور اس میں الفاظ ومحاورات کے بول چال کے فقرے

اور کہاوتیں بھی لکھ دی گئی ہیں تو انہیں خود احتیاط کرنا چاہیے تھی لیکن جب ان کی اپنی لغت کو دیکھتے ہیں تو اس قسم کے اندراجات کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود ہاشمی غیر لغاتی اندراجات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بابائے اردو چونکہ ایک اچھی لغت میں تمام لفظی سرمائے کو شامل کرنا ضروری قرار دیتے ہیں اس لیے ایسا کرنے کی کوشش میں غیر لغاتی اندراجات بھی لغت میں شامل کر بیٹھے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے اس لغت میں کچھ ایسے الفاظ بھی شامل کر لیے ہیں جو نہ صرف عوامی ہیں بلکہ ٹکسال باہر بھی ہیں، وہ خود بھی ان الفاظ کی کوئی سند پیش نہیں کر سکے ہیں۔ مثال کے طور پر آس (عوامی، عائشہ) آسا (عوامی عاشہ) اور آسرم (آشرم)، آسری وغیرہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آسرم کی سند کے طور پر آرائشِ محفل سے جو اقتباس پیش کیا گیا ہے اس میں آسرم کی بجائے آشرم ہی استعمال ہوا ہے۔ اس کے دوسرے اندراجات آئسُر (دیو؛ بھوت) اور آئسُری (دیو، بھوت سے متعلق) بھی محلِ نظر ہیں۔ اگر چہ کہیں مستعمل ہوئے ہیں تو سند ضروری تھی۔ الفاظ کی جمع بھی شاملِ لغت کی گئی ہے اسی طرح آپ کے تحت بھی سینکڑوں غیر لغاتی اندراجات ملتے ہیں۔'' (۴۴)

لغتِ کبیر میں مولوی عبدالحق نے مختلف الفاظ کی قواعدی حیثیتوں پر خصوصی توجہ دی ہے اور قواعد کے حوالے سے مختلف اصول وضوابط بھی لغت میں درج کیے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مولوی عبدالحق ایک اعلیٰ پائے کے قواعد نویس تھے۔ اس لیے وہ الفاظ وتراکیب پر قواعد کے حوالے سے گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لغت میں قواعد کے حوالے سے بحثیں کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن بعض اوقات وہ اس سلسلہ میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور ایسے اندراجات بھی لغت میں کر جاتے ہیں جو صرف قواعد کی کتاب کا حصہ ہونے چاہئیں۔ اس طرح ان کو بھی 'لغتِ کبیر' کے غیر لغاتی اندراجات کہہ سکتے ہیں۔

یہاں پر ضروری ہے کہ مولوی عبدالحق کی 'لغتِ کبیر' کا موازنہ اردو کی دیگر اہم لغات سے کیا جائے۔ تا کہ یہ بات سامنے آسکے کہ مولوی عبدالحق کی لغت میں کون سی نمایاں خصوصیات ہیں جو اس کو دیگر لغات سے ایک ممتاز اور منفرد حیثیت دیتی ہیں اور ساتھ ہی ان خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہو سکے جو 'لغتِ کبیر' میں موجود ہیں۔ چنانچہ ذیل میں لغتِ کبیر، اردو لغت، امیر اللغات، جامع اللغات، فرہنگِ آصفیہ، اور نور اللغات سے لفظ ''آنسو'' کے تحت اندراجات پیش کیے جا رہے ہیں تا کہ ان کا تقابلی جائزہ لیا جا سکے:

آنسو:

(لغتِ کبیر)

''آنسو (مذ) ا۔ وہ نمکین پانی جو آنکھ کے پردوں سے نزلے یا دھواں وغیرہ لگنے سے یا رنج وغم یا سخت تکلیف میں نکل آتا ہے۔ اشک۔

۲۔ (ع و) پتلا، رقیق، پانی۔ م: آنسو سا شوربا جس میں کچھ مزہ نہ سواد۔ ۳۔ (صیغہ جمع) رونا، گریہ وزاری۔ م: ان کے آنسوؤں کا کیا اعتبار۔ (مصادر: آنا، بہانا، بھرلانا، پچھنا، پونچھنا، ٹپکانا، ٹپکنا، ڈھلکنا، ڈبڈبانا، گرانا، گرنا، نکلنا، پینا،)

ہ: آنسو۔ پرانی ھیندی: آنسوا۔ دکنی اردو: آنجھو، اجو۔ پ: انسو۔ پالی: اسو۔ ف: ارس۔ قف: اس ر۔ س: اش ر۔

-آنا (ف ل) ا۔ آنکھوں میں پانی بھرآنا، آنکھوں سے پانی بہنا۔ ۲۔ رونا آنا، خم ھونا۔ م: جس نے سنا اس کے آنسو آ گئے۔

-اُمنڈنا (ف ل) ا۔ گریہ ضبط نہ ہونا۔ م: پھر جو آنسو اُمنڈے تو کسی طرح نہ تھمے۔

-بہانا (ف م) رونا، اشک باری کرنا۔ ع:

اللہ کو سونپا تمہیں آنسو نہ بہاؤ (انیس)

۲۔ غمگساری، دل سوزی کرنا، تعزیت کے طور پر رونا۔ ع:

وہی اب آنسو بہانے آئے لہو جو میرا بہا چکے ہیں (نسیم دہلوی)

-بہنا (ف ل) آنکھوں سے پانی نکلنا، آنسوؤں کا تار بندھنا

-بھرآنا (ف ل) ا۔ آنکھیں پرآب ہونا۔ م: پیاز چھیلنے میں بھی آنسو بھرآتے ہیں۔

ع: آنو بھرآئیں گھورے اگر آفتاب کو

۲۔ آبدیدہ ہونا، رقت آنا۔

دل میں اک درد ہوا آنکھوں میں آنسو بھرآئے

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا (صبا)

-بھرلانا (ف ل) ا۔ ہمدردی ظاہرہ کرنا، متاثر ہونا۔

ع: سوزش دل جب کہتے ہیں آنسو وہ بھرلاتے ہیں (مومن)

۲۔رنکھا ہونا، بسورنا۔

آنسو بھر لائے جو ہم دیکھ انہیں تو یہ کہا

آپ اس شکل پہ ہیں میرے مقرر عاشق (انشاء)

-پچھنا (ف ل) ا۔قدرے تسکین یا تسلی ہونا، صبر آنا۔

وہ روئے دیکھ کر میت کو میری

پچھے آنسو ذرا اھل عزا کے (داغ)

۲۔تلافی ہونا، مکافات ہونا۔م: سو میں سے پچاس ہی ملتے تو کچھ آنسو پچھتے۔

-پوچھنا (ف ل) تسلی تشفی دینا، ہمدردی کرنا۔

کوئی نہ رہا کہ پوچھے آنسو

کیا رووں میں اپنی بے کسی کو (مومن)

۲۔فی الجملہ تلافی کرنا۔اشک شوئی کرنا۔م:

سب تو نہیں دیا اتنا دے دیا کہ آنسو پوچھ دیے۔

-پینا (ف ل) صبر وضبط کرنا، دل ہی دل میں رونا یا غم جھیلنا، غم ظاہر نہ ہونے دینا۔

ع: ہو کے جز بز اپنے دل میں کل میں آنسو پی گیا (معروف)

-توڑ (ص) (ٹھگوں کی اصطلاح) بن رت کی غیر معمولی اتفاقیہ بارش جسے ٹھگ بدشگونی سمجھتے ہیں اور گھر سے نہیں نکلتے، رستے میں ہوں تو واپس آ جاتے ہیں۔

-ٹپک پڑنا (ف ل) ضبط نہ ہوسکنا، بے اختیار رونا آ جانا۔

وہ گریہ دوست ہیں بلبل ٹپک پڑے آنسو

ہماری آنکھوں نے دیکھا جو خواب خندۂ گل (اسیر)

-ڈالنا (ف م) (عو) آنسو گرانا، رونا۔م: کیسا سنگدل ہے چار آنسو بھی نہ ڈالے۔

-ڈبڈبا (ڈب ڈبا) آنا (ف ل) آنکھوں میں آنسو بھر آنا، غم وصدمہ محسوس ہونا۔م: یہ سن کر میرے بھی آنسو ڈبڈبا آئے۔

-ڈبڈبالانا (ف ل) آنکھوں میں آنسو بھر لانا، چشم تر ہونا۔

م: رویا تو نہیں مگر آنسو ڈبڈبالایا۔

-ڈبڈبانا　　(ف ل) آنسو چھلکنا، آنسو بھر آنا۔ م: آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

-ڈھال　　(مذ) مرض سیلان چشم جس میں آنکھ سے پانی بہتا رہتا ہے۔ خصوصاً گھوڑوں کی آنکھ کا ڈھلکا۔

-ڈھلکنا　　(ف ل) آنسو پھسلنا، پھسل کر گرنا۔

وہ میری آنکھ سے ڈھلکے ہوئے آنسو دیکھے
جس نے بچوں کو نہ ہوضد میں مچلتے دیکھا　　(قدر)

-ڈھلنا　　(ف ل) آنسو پھسل کر بہنا، رخسار تک آنا۔

ع: تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے۔

-گرانا　　(ف ل) اشک ریزی کرنا، رونا، اظہار غم کرنا۔

نجل تو دیکھو میری تربت پر
ایک آنسو بھی وہ گرا نہ سکا　　(نسیم دہلوی)

-گرنا　　(ف ل) آنسو ٹپکنا، اشک بار ہونا، رونا۔

-نکل آنا　　(ف ل) ا۔ آنکھیں ڈبڈبا جانا، آنسو بہنے لگنا۔

م: سورج کی طرف دیکھو تو آنسو نکل آتے ہیں۔

۲۔ تکلیف سے بے اختیار رو پڑنا۔ م: ایسا ہاتھ مروڑا کہ آنسو نکل آئے۔

-نکلنا　　(ف ل) آنسو جاری ہونا، غم ظاہر ہونا۔ م: سب روئے مگر اس کا بھی کوئی آنسو نکلا۔''　(۴۵)

اُردو لغت:

''آنسو (مذ، و مع) اند: آنجھو (قدیم)۔

پانی کا وہ قطرہ جو غم تکلیف یا خوشی کی شدت میں یا شدید کھانسی یا قہقہے کے وقت آنکھوں سے نکلے، اشک، ٹسوے۔

آنسوؤں کی جھڑ لاگ رہی سب چھائے رہے بادریا
مورو بولے پپیہا بولے امواپہ بولے کویلیا　　مشہور ٹھمری

نوشیرواں کے یہ بات سنتے ہی بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔

۱۸۰۳ گنجِ خوبی، ۱۰۶

وہ صبح کو اٹھ اٹھ کے روتی اور یوں ٹپ ٹپ آنسو گراتی ہیں جیسے پتیوں پر سے شبنم کی بوندیں گرتی ہوں۔

۱۹۲۳ مضامینِ شرر، ۱، ۲: ۴۱۰

[س: اکشو+ک: +]''

-اُبلنا محاورہ: دل بھر آنے پر یکا یک آنسو نکل پڑنا، بے اختیار رو پڑنا۔

لاچی کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے۔

۱۹۶۲ ایک عورت ہزار دیوانے، ۴۹

-اُمڈنا/اُمنڈنا محاورہ: کثرت سے آنسو بہنا۔

اشک اڈے ہجر میں جب آہ کی برق چمکی اور بادل گھر گیا

۱۸۷۳ کلیاتِ قدر، ۱۲۱

تھرا کے بس کھڑے کے یونہیں رہ گئے کھڑے

منہ سے نہ کچھ کہا مگر آنسو امڈ پڑے

۱۹۷۲ مرثیہء یاورِ اعظمی، ۱۱

-ایک نہیں کلیجہ ٹوک ٹوک کہاوت۔

مکاری کی ہائے ہائے ہے، دردمندی نہیں محض بناوٹ ہے (امیر اللغات، ۱: ۱۹۲)۔

-آنا محاورہ۔ کلیجہ اڈکر آنسوؤں کا پلکوں پر آجانا، آنکھوں سے آنسوؤں کا گرنا، آبدیدہ ہونا۔

کس کے دانتوں کی چمک کا دھیان ہے جو رات دن

متصل آتے ہیں آنسو سبحہ بلور سے

۱۸۱۶ دیوان ناسخ، ۱: ۱۰۰

خدا جانے کیا بات یاد آئی کہ ان کی آنکھوں سے آنسو آنے لگے۔

۱۹۲۴ نور اللغات، ۱: ۱۴۷

-بہانا محاورہ۔ رونا

نہ اس کی بزم میں آنسو بہائیو اے چشم

نگاہ رکھیو ذرا میری آبرو کی طرف

۱۸۴۹ کلیات ظفر، ۲: ۵۲

سدا نام رہے اللہ کا، دیکھ لو سب کچھ فنا ہو گیا اور ٹوٹی پھوٹی دیواریں کھڑی آنسو بہا رہی ہیں۔

۱۹۱۷ رہنمائے سیر دہلی، حسن نظامی، ۲۴

-بہنا محاورہ۔

آنسو بہانا (رک) کا لازم، آنسو جاری ہونا۔

فردوس میں رولوں گا شرف اتنے ہی موتی

بہتے ہیں جو میرے غم شبیر میں آنسو

۱۸۹۶ دیوان شرف، ۲۰۵

حادثے کی خبر سنتے ہی گھر بھر کے بہنے لگے۔

۱۹۲۲ نور اللغات، ۱: ۱۴۷

-بھر آنا محاورہ۔

آبدیدہ ہونا، ایسا محسوس ہونا کہ اب روئے۔

آہ کیوں کھینچ کے آنکھوں میں بھر آئے آنسو

کیا قفس میں تجھے اے مرغ چمن یاد آیا

۱۸۵۸ امانت، د، ۷

بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

۱۹۰۸ بانگ درا، ۱۱۷

-بھر بھر کے رونا۔ محاورہ۔

زار و قطار گریہ کرنا، پھوٹ پھوٹ کے رونا۔

کیا کیا نہ جدا دوست ہوئے پل کے جھپکتے

بھر بھر کے میں آنسو غم احباب میں رویا

۱۷۸۴ میر حسن، د، ۳۲

-بھر لانا محاورہ۔

آبدیدہ ہو جانا، رونے کے قریب ہونا۔

ایک بارگی وہ جوان آنسو بھر لایا۔

۱۸۰۲ باغ و بہار، ۳۳

جب لکھنؤ کا ذکر آتا تھا تو ٹھنڈی سانس بھرتے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے۔

۱۹۰۰ امیر، مکاتیب امیر، ۱۷

-بھرے ہونا ف مر۔

رونے کے قریب ہونا، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہونا (عموماً آنکھوں کے ساتھ)۔

آنسو بھرے ہو آنکھوں میں دل کو الم ہے کیا

کس بات پر ملول ہو میں بھی سنوں ذرا

۱۹۱۲ شمیم، مرثیہ، ۷

--پاک کرنا ف فر۔

آنسوؤں کو رُومال وغیرہ سے خشک کرنا یا پوچھنا۔

یہ کہہ کر اور آنسو پاک کر کے کہا کہ بیٹی چل۔

۱۹۰۳ آفتاب شجاعت، ۲: ۲۳

-پُچھنا محاورہ۔ تسکین ہونا، تسلی ہونا، نقصان کا تدارک ہو جانا (اکثر، کچھ تو، کے ساتھ مستعمل)۔

شہر سے ہم نے قدیم اپنے نکالے شکر ہے

کچھ تو آنسو پچھ گئے دامان صحرا دیکھ کر

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۹۳

آنسو پونچھنے کے لیے یہ لکھ دیا گیا تھا کہ اس سے ایسے دینی علوم کے مدارس کا بند کرنا مقصود نہیں ہے۔

۱۹۳۳ مرحوم دہلی کالج، ۱۹

-پینا	محاورہ۔ (غم تکلیف یا صدمے کی حالت میں) آنسو آنکھ سے باہر نہ نکلنے دینا، ضبط کرنا، صبر و تحمل سے کام لینا۔

تشنگی اور بھی بھڑکتی گئی	جوں جوں میں آنسوؤں کو اپنے پیا

۱۷۸۴	درد، د، ۲۶

کیا قہر ہے کب تک کوئی رہ جائے آنسو پی کے یوں

ہنس ہنس کے میرے آگے تم دست عدو سے جام لو

۱۸۵۱	مومن، ک، ۱۲۵

آنکھوں ہی آنکھوں میں خانم نے کس طرح آنسو پی لیے میں ہی جانتا ہوں۔

۱۹۳۵	خانم، ۲۸۴

-پھُوٹ نِکلنا	محاورہ۔ آنسو نکل پڑنا، آنسو بہہ نکلنا۔

آنکھوں سے اپنی آنسو کچھ ایسے پھوٹ نکلے

فوارے کے کسی نے جیسے ہونٹ کو توڑا

۱۸۱۸	انشا، کلام انشا، ۴۹

-توڑ	امذ۔ (ٹھگوں کی اصطلاح) ایسے موسم کی بارش جسے ٹھگ بدشگونی سمجھ کر گھر سے نہیں نکلتے (امیر اللغات، ا:۱۹۳)۔

[آنسو+ ا: توڑ، توڑنا (رک) سے]

-تھمنا	محاورہ۔ گریہ موقوف ہو جانا۔

صبر و شکیب کرنے لگے سینہ میں خروش

آنسو تھمے، گئے ہوئے پھر آئے سب کے ہوش

۱۸۹۷	دیوان ڈاکٹر مائل، ۳۰۶

-ٹپ ٹپ ٹپکنا / گرنا	ف مر

رک: آنسو ٹپکنا۔

نوشیرواں کے یہ بات سنتے ہی ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔

۱۸۰۲ گنج خوبی، ۱۰۶

نورالدین کا دل بیٹھ گیا اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

۱۹۲۵ الف لیلہ، ۶، ۳۵۵

-ٹپکنا ف مر۔

بے اختیار آنسو گرنا۔

بے یار جام میں مرے آنسو ٹپک پڑے

پیتے ہیں جیسے پانی ملا کر شراب میں

۱۸۱۶ دیوانِ ناسخ، ۱: ۵۸

خوں کے قطرے جو مصلے پہ ہر اک سو ٹپکے

یہ ستم دیکھ کے شبنم کے بھی آنسو ٹپکے

۱۹۱۲ شمیم، مرثیہ، ۶

-جاری ہونا ف مر۔

رک: آنسو بہنا (نوراللغات، ۱: ۱۴۸)

-جوش پر آنا محاورہ۔

رک: آنسو اُمنڈنا۔

آنسو آئیں جوش پر تو روکنے والا ہے کون

آنکھیں ہیں گنگ وجمن عالم خس وخاشاک ہے

۱۸۶۷ رشک، د(ق) ۱۹۱

-جھڑنا محاورہ۔

رک: آنسو بہنا۔

غم کا دریا امڈا سب کی آنکھوں سے آنسو جھڑنے لاگے ساری پلکوں سے

۱۷۳۲ کربل کتھا، ۱۴۲

-چلنا محاورہ۔

رک: آنسو بہنا

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے

برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی

۱۸۱۰ میر، ک، ۲۸۲

بے اختیار آنکھوں سے آنسو چلنے لگے۔

۱۹۲۴ نوراللغات، ۱: ۱۲۸

-خشک ہونا ف مر، محاورہ۔

رونا نہ آنا، انتہائی رنج وغم یا صدمے میں بھی ڈر یا حیرت وغیرہ سے آنسو نہ نکلنا۔

اٹھانا بار منت شاق تھا پیراہن تن کا

ہوئے خشک آنکھ میں آنسو لیا احساں نہ دامن کا

۱۸۲۵ نسیم دہلوی، ۵، ۵۴

ہوئے خشک کم بخت شبنم کے آنسو

نہ کچھ اوس اس نے بھی گلچیں پہ ڈالی

۱۹۱۸ فردوس تخیل، ۱۷۸

-دینا محاورہ (عموماً شمع وغیرہ کے ساتھ)۔

(کنایۃً) شمع کی پگھلی ہوئی چربی کا بوند بوند ہو کر گرنا۔

منظور روح کو نہیں افشائے راز عشق

آنسو ہماری شمع لحد کیا مجال دے

۱۸۵۷ سحر (امان علی)، ریاض سحر، ۸۰۲

-دھار امث۔

رک: آنسو ڈھال معنی نمبر ۲ (اپ و، ۵: ۹۳)۔

[آنسو + دھار (رک)]

-ڈالنا محاورہ (قدیم)۔

رک: آنسو گرانا۔

اس شادی کا ایسا سمیا بن آیا ہے کہ جہاں تائیں کہ دیوتا بمعہ برمھا آئے ہیں سو حسد کے آنسو ڈالتے ہیں۔

۱۷۶۴ قصہء مہر افروز دلبر، ۱۷۴

-ڈَبڈَبانا محاورہ۔

رک: آنسو بھر آنا (نور اللغات، ۱: ۱۴۸)۔

-ڈَبڈَبانا محاورہ۔

رک: آنسو بھر آنا۔

نہ پوچھو کس لیے آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے
کسی جگہ سے ہم آئے ہیں چوٹ کھائے ہوئے

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۲۷۸

لڑکی کے آنسو ڈبڈبا آئے۔

۱۹۲۵ الف لیلہ ولیلہ، ۶: ۴۳

-ڈھال

(الف) امث۔

ا۔ وہ بھونری جو گھوڑے کی آنکھ کے کوئے کے قریب ہو اور جب کان جھکایا جائے تو اس کے نیچے نہ آئے۔

نہ آوے کان کے نیچے تو ہے اور اسے کہتے ہیں آنسو ڈھال کر غور

۱۷۹۵ فرسنامہء رنگین، ۴

آنسو ڈھال / اربل / سنگھن تینوں بھونری ایک جگہ ہیں۔

۱۸۴۱ زینت الخیل، ۵۸

چودھری بول پڑا اور استاد آنسو ڈھال بھی دھری ہوئی ہے۔

۱۹۶۳ سہ ماہی، اردو نامہ، چڑھتا سورج، ۱۲: ۱۰

۲۔گھوڑوں کی ایک بیماری جس میں آنکھ سے پانی آنسو کی طرح بہا کرتا ہے

(نور اللغات، ۱: ۱۴۸)۔

(ب) صف۔

آنسوڈھال کے مرض میں مبتلا (آنکھ)۔

بدن کا عیب تو یہ ہے کہ کسی کو یوں کہو کہ۔۔۔آنکھیں چندھی یا آنسوڈھال یا بھنگی ہیں۔

۱۸۶۴ مذاق العارفین، ۳: ۱۵۶

[آنسو+ا: ڈھال، ڈھالنا (رک) سے]

-ڈَھبڈَبانا محاورہ۔

رک: آنسو ڈَبڈَبانا۔

پانچ درجن عورتیں منہ بنائے آنکھوں میں آنسو ڈھبڈبائے

لمبی سانسیں بھرتیں داخل دفتر ہوئیں۔

۱۹۱۵ سجاد حسین، احمق الذین، ۱۶

-ڈھلکنا ف مر۔

پلکوں سے آنسو کا ٹپک پڑنا۔

تھا رات سوز دل کا مرے بزم میں بیاں

بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

۱۷۹۵ قائم، مختار اشعار، ۱۹

وہ مری آنکھ سے ڈھلکے ہوئے آنسو دیکھے

جس نے لڑکوں کو نہ ہو ضد میں مچلتے دیکھا

۱۸۷۳ کلیاتِ قدر، ۱۲۱

قطرے عرق کے ان کی جبیں سے ٹپک پڑے

وہ دل پکڑ کے رہ گئیں آنسو ڈھلک پڑے

۱۹۱۲ شمیم، مرثیہ، ۸

-ڈھلنا		محاورہ۔

لگا تار آنسو بہنا۔

چک لال کرلا لا کیا، آنسوں ڈھلا، بغلا کیا

تن گال کر جالا کیا، تس پر اگن پھایا فراق

۱۶۷۹؟		دیوان شاہ سلطان ثانی، الف، ۶۰

مناجاتی کا آنسو ڈھل کے اس کے آستانے سے

ہوا ہے درۃ التاج سعادت فرق فرقد کا

۱۸۵۷		کلیات نعت، محسن، ۶۱

درے جو کھائے چار قدم بھی نہ چل سکے

منکا ڈھلا پہ خوف سے آنسو نہ ڈھل سکے

۱۹۲۴		مرثیۂ فیض بھرتپوری، ۶۱

-روکنا		ف مر۔

رونے کو ضبط کرنا (امیر اللغات، ۱:۱۹۳)

-سُوکھ جانا		ف مر، محاورہ۔

رک: آنسو خشک ہونا۔

زمیں میں سمایا تحیر سے آپ   گئے سوکھ آنسو کنویں کے شتاب

۱۷۸۴		میر حسن (امیر اللغات، ۱:۱۹۳)

شدت غم کا تقاضا تھا کہ روائے گلرو

ظلم کے ڈر سے مگر سوکھ گئے تھے آنسو

۱۹۱۲		شمیم، مرثیہ، ۹

-کا آبلہ / چھالا		امذ

وہ آبلہ جو آنسوؤں کی حدت اور کثرت سے پڑ جائے (امیر اللغات، ۱:۱۹۳)۔

یہاں تک زخم ہے دل میں کہ پہروں میں لہو رویا

کوئی آنسو کا بھی چھالا جو دیکھا تیغ مژگاں میں

۱۸۵۴ دیوان اسیر، گلستان سخن، ۲۵۲

-گرانا محاورہ۔

رک: آنسو بہانا

بخل دیکھو تو میری تربت پر ایک آنسو بھی وہ گرا نہ سکا

۱۸۲۵ نسیم دہلوی، د، ۶۰

دل چاہتا تھا کہ وہ ایک دفعہ شوہر کی قبر پر بیوگی کے آنسو گرائے۔

۱۹۱۵ گرداب حیات، ۳۰

-گرنا محاورہ۔

رک: آنسو بہنا۔

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں

جذب صادق کے اثر سے سب در شبنم بنیں

۱۹۲۹ مطلع انوار، ۵۵

-لمبے لمبے بہانا محاورہ (طنزیہ)۔

اڑے اڑے آنسو نکالنا، شدت سے رونا ٹسوے بہانا، تصنع سے رونا۔

بولی وہ لمبے لمبے آنسو بہا نخرے سے ٹھن ٹھنا پکڑنا تھا

۱۸۱۰ ہشت گلزار (مہذب اللغات، ۲: ۹۵)

-نکل آنا محاورہ۔

آنکھوں میں آنسو آ جانا، آنسو بھر آنا۔

عجب روداد ہے اپنی بیاں کرتے ہیں ہم جس سے

نکل آتے ہیں آنسو اوس کو رقت آ ہی جاتی ہے

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۲۵۱

ہمشکل نبی کھا کے جو برچھی کا پھل آئے

دل لاکھ سنبھالا مگر آنسو نکل آئے

۱۹۶۲ مرثیہ منظور رائے پوری، ۱۲

-نکل پڑنا محاورہ۔

یکا یک (بے حد خوشی یا غم سے) آنکھوں میں آنسو آ جانا۔

مانند شمع بس مرے آنسو نکل پڑے دیکھا جو بے چراغ کسی کے مزار کو

۱۸۵۳ دفتر فصاحت، وزیر، ۱۴۱

-نکلنا محاورہ۔

رونا، آنسو بہنا، آنسو ٹپکنا (رک)۔

آنکھیں پتھرا گئیں جوں سنگ سلیمانی آہ

نکلے آنسو تو یہ الفت نے نچوڑے پتھر

۱۸۰۹ جرأت، ک، ۲۳۸

فوج اعدا سے وہ غازی صفت جو نکلے

صف مژگاں کو الٹتے ہوئے آنسو نکلے

۱۹۷۵ مرثیہ ہلال نقوی، ۹ (۴۶)

امیر اللغات:

''آنسو۔ ھ۔ اَشُر یں۔ (شُر کے معنی بہنا ہیں) مذکر۔ نمبر (۱) اشک۔ وہ پانی جو زیادہ غم و تکلیف یا بے حد خوشی سے آنکھومیں پیدا ہو۔ یا ٹپک پڑے۔

آغا جو شرف۔ بہتے ہیں سرِ زلفِ گرہگیر میں آنسو۔ کیا مجھ کو جکڑوائیں گے زنجیر میں آنسو۔

صفات

آتشیں۔ آتش۔ جوش اشک آتشیں کا باعث آہ سرد ہے۔ گرم کرتی ہے ہوا جاڑے کی پانی چاہ کا۔

اشک شادی (وہ آنسو جو زیادہ مسرت کیحالت میں نکل آتے ہیں) مومن۔

آبرو رہگئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ۔ اشک شادی ہی سے گو چشم کو نم کرتے ہیں۔

برباد۔ مومن۔ اشک برباد دیدۂ نم میں۔ خاک اثر آتش تب نم میں۔

بے تاثیر۔ پُر تاثیر۔ ناسخ۔ اشک بے تاثیر کو نادم کیا برسات نے۔ ہنہ کے باعث رات میرے گھر میں جانان رہگیا۔
مومن۔ گرائے اشک پُر تاثیر کیوں خلوت میں اے آنکھو۔ کوئی یوں خاک میں ایسے گُہر کو بھی ملاتا ہے۔
تر۔ میر۔ اشک تر قطرۂ خون لخت جگر پارۂ دل۔ ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہتر نکلا۔
تیز و تند۔ مثال کے لیے دیکھو آہو (تشبیہات میں)
جگر سوز۔ میر۔ یہ اتصال اشک جگر سوز کا کہاں۔ روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب۔
جگر گوں۔ ناسخ۔ دل کو ہجر یار میں اشک جگر گون کیجیئے۔ گوہر نایاب کو اک قطرۂ خون کیجیئے۔
حنائی۔ میر۔ اب اشک حنائی سے جو تر نہ کرے مژگان۔ وہ تجہ کف رنگین کا مارانہ ہوا ہوگا۔
خونین۔ خون آلود۔ ذوق اُس پائے نگارین کا جو ہے وصف نگار۔ اشک خونین سے ہے کاغذ کو حنائی کرتا۔ اسیر۔
عجب کیا ہے جو نکلیں اشک خون آلود ماتم میں۔ کہ گلگوں دانہ تسبیح ہوتے ہیں محرم میں۔
رنگین۔ گلرنگ۔ لالہ گون۔ گلگون۔ اسیر۔ تفوق ہے گل شاداب پر ہر اشک رنگین کو۔ گریبان داغ دیتا ہے مرا دامان گلچیں کو۔ وزیر۔ اشک گلرنگ پروتی ہے مژہ میں کیا خوب۔ کیا بناتی ہے یہ پھولون کی چھڑی میری آنکھ۔ ذوق۔ زیبا ہے روے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں۔ اپنی خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں۔ ناسخ۔ بھر لیے انگارے میں نے عشق کے اعجاز سے۔ داغہائے اشک گلگوں میرے دامن میں نہیں۔
رواں۔ ناسخ۔ حسن یار آلودگی سے پاک ہے تو کیا خطر۔ ہے گواہ اشک رواں اپنی نگہ بھی پاک ہے۔
سُرخ۔ ناسخ۔ فصل گل ہے کیوں نہو ہمپر بہار۔ سُرخ آنسو ہیں تو چہرہ زرد ہے۔
سوختہ۔ ذوق۔ عیاں ہے عشق کی گرمی ہویدا سوزش دل ہے۔ کہ آتا اپنا اشک سوختہ مانند فلفل ہے۔
غمّاز۔ مومن۔ دیکھ کر بان مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے۔ اشک غماز ہی کیا آنکھوں میں گھر کرتا ہے۔
کُلفت آلود۔ مومن۔ آئے ہیں سر شک کلفت آلود۔ تعمیر مکان کی آب و گل کو۔
گرم۔ ایک اشک گرم ناسخ گر خزانے میں گرے۔ طعنہ زن فوارہ ہو منقار موسیقار پر۔
مُسلسل۔ آتش۔ جو عالم حُسن رکھتا ہے تو حالتِ عشق غارتگر۔ کہیں زلف مسلسل ہے کہیں اشک مسلسل ہے۔
میگوں۔ مومن۔ کہ خیال چشم میں حال خراب۔ اشک میگوں سے سیہ مست شراب۔
یتیم۔ مومن۔ ہم بہا اُسکی دُرفشانی سے۔ تار اشکِ یتیم و سلکِ گہر۔

تشبیہات و استعارات

آبجو۔ ناسخ۔ ہو چلا ہے خشک ہر گل شک روئے یار سے۔ آبجو اشکوں کی گلشن میں بہائے عندلیب۔

آبلہ۔ پھپھولا۔ وزیر۔ چشم کی گردش میں ہے اب دشت پیمائی کا رنج۔ اشک گویا آبلے ہیں ہر مژہ کے خار میں۔ برق۔
کیا سوزِ غم نے میرے جلائے دل وجگر۔ آنسو پھپھولے بن گئے پائے نگاہ کے۔

آنکھوں کا تارا۔ اسیر۔ صفائے دل نے کھویا یہ نشان گردِ تکدّر کا۔ کہ ہر آنسو مرا تارا ہے چشم روزن دُر کا۔

آہو۔ اسیر۔ ہماری آنکھ سے یوں تیز وتند آنسو نکلتے ہیں۔ کہ جیسے چوکڑی بھرتے ہوئے آہو نکلتے ہیں۔

ابر۔ مومن۔ دیکھکر مجمع یہ امڈا کیا ہی ابر اشک آہ۔ حلقۂ اغیار اُسکے گرد مہ کا ہالہ تھا۔

اخترِ شفق آلود۔ ناصر۔ لعل تر ناسفتہ گوہر اشک ہے۔ باشفق آلود اختر اشک ہے۔

بادام دو مغز۔ شیرۂ بادا۔ وزیر۔ دونوں آنکھیں تری یاد آئیں تو ہم رونے لگے۔ صاف بدام دو مغز اپنا ہوا ہر آنسو۔
ولہ۔ آ گئی یاد دم گریہ یہ کن آنکھوں کی۔ وگئے شیرۂ بادام سے بہتر آنسو۔

بحر۔ دریا۔ قلزم۔ رشک۔ میرے بحر اشک کی روئے زمیں پر دھاک ہے۔ آہ آتشبار برق خرمن افلاک ہے۔ ناسخ۔
شعبدہ عشق کا دیکھو کہ میں جہاں نکا جسدم۔ بہ چلا آنسوؤں کا روزن دریں دریا۔ مومن۔ قلزم اشک نے طغیانی کی۔ دست مژگاں نے دُر افشانی کی۔

برشکال۔ منہ۔ ناسخ۔ کی ہے یاں شدت سے شدت برشکال اشک نے۔ کیوں نہ داں آ جائے موسم سبز کے آغاز کا۔
ولہ۔ اشک آتے ہیں دودِ آہ کے ساتھ۔ مِنہ نہ برسے نہوا گر بدلی۔

پھلجھڑی۔ ناسخ۔ کیوں ہیں اشک اپنے پھلجھڑی کیطرح۔ شب فرقت شب برات نہیں۔

پیکان۔ اسیر۔ اشک کے باعث سے ہے موئے مژہ کا مرتبہ۔ دیکھ لو بیکار ہے پیکان نہو جس تیر میں۔

تخم۔ برق۔ میں تخم اشک ہوں مری نشو ونما کہاں۔ میں ہوں نہال آہ امید ثمر نہیں۔

چراغ طور۔ برق۔ تصور میں جو اُسکے عارض تاباں کے روتا ہوں۔ چراغ طور ہے اے برق آنسو چشم گریاں میں۔

چنگاری۔ میر۔ دل کو آگ اکدم میں دیدی اشک ہوئے چنگاری سے۔ کیا ہی شریر ہے شوخی برق ملائی اُس نے شرارت میں۔

دانہ۔ رشک۔ گوہر بے جا سے بہتر ہے۔ دانۂ اشک دیدۂ تر کا۔

رال کا گولا۔ اسیر۔ گرم آنسو سے بنستانِ مژہ جل جائے گا۔ آگ جنگل میں لگا دیتا ہے گولا رال کا۔

ساغر۔ وزیر۔ ہجر میں آتی ہے قلقل کی صدا نالوں سے۔ ہیں جو شیشے دلِ بیتاب تو ساغر آنسو۔

ستارہ۔ ناسخ۔ شام سے اُس ماہ تاباں کا ہے ہمکو انتظار۔ کیوں نہوں آنسو ستارے دیدۂ بیدار کے۔

شرارہ۔ ذوق۔ میرے نالوں سے جو پانی سنگ خارا ہوگیا۔ کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہوگیا۔

شیشہ۔ میر۔ شیشہ بازی تو تنک دیکھنے آ آنکھو نکی۔ ہر پلک پر مرے اشکوں سے رواں ہے شیشہ۔

طفل۔ فرزند۔ ناسخ۔ پیش غیر آتا نہیں باہر رواق چشم سے۔ طفل اشک اپنا جو ناداں تھا بڑا دانا ہوا۔ اسیر۔ کسقدر اشک کو رکھتی ہے مری آنکھ عزیز۔ سچ ہے دنیا میں کسے الفت فرزند نہیں۔

طوفان۔ اسیر۔ طوفان اشک وہ لب ساحل اُٹھایئے۔ اُڑ جائے بادبان کیطرح ناخدا کا رنگ۔

عطر۔ ناسخ۔ ہے تصور اُس گل تر کا دل غمناک میں۔ عطر ہے اشکوں کے بدلے دیدۂ نمناک میں۔

عِقدِ ثُریا۔ مومن۔ ہے شبک بسکہ روتے روتے چشم اے ماہرو۔ شب جو اشک آیا سو اک عقد ثریا ہوگیا۔

عقیق۔ میر۔ اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو۔ ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا۔

قاصد۔ میر۔ غم سے فرصت اُسکو کہاں ہے۔ قاصدِ اشک ہمیشہ رواں ہے۔

قافلہ۔ کاررواں۔ ناسخ۔ چشم تر سے عشق ابرو میں چلے آتے ہیں اشک۔ قافلہ گویا سمندر میں رواں ہے حاج کا۔ اسیر۔ اشک جاری ہیں مگر راہ اثر ملتی نہیں۔ کارواں میں ہمکو یوسف کی خبر ملتی نہیں۔

گلاب۔ اسیر۔ دوڑ کر قیس نے چھڑکا وہیں اشکوں کا گلاب۔ غش ضو لیلیٰ کو پس پردۂ محمل آیا۔

گل تر۔ وزیر۔ یار پوچھے جو مرے اشک نہ رسوا ہو کبھی۔ دست گلرنگ میں بنجائیں گل تر آنسو۔

گولی۔ وزیر۔ عشق خال و مژۂ یار نے لی جان آخر۔ نیر ہے آہ تو گولی ہے مرا ہر آنسو۔

گھنگرو۔ اسیر۔ وقت رونے کے تصور تھا جو اُس خلخال کا۔ جو گرا آنسو ہماری آنکھ سے گھنگرو ہوا۔

لعل تر۔ مثال کے لیے دیکھو اختر شفق آلود۔

مرجان۔ میر۔ لعل سے جب دل تھے ہمارے مرجان سے تھے اشک چشم۔ کیا کیا کچھ پاس اپنے ہم بھی عشق کی دولت رکھتے تھے۔

موتی موتیوں کا مالا۔ ناسخ۔ بزم غم شبیر میں گرتے ہیں جو آنسو۔ زیبا ہے کہیں ہم اُنہیں ایمان کے موتی۔ ولہ۔ اشک مالا موتیونکا دود کلگی شعلہ تاج۔ رکھتی ہے تخت لگن میں شوکت شاہانہ شمع۔

موج۔ وزیر۔ ثابت ہوئی ہے کونسی تقصیر ہائے شمع۔ جو موج اشک بنگئی زنجیر پائے شمع۔

ناسفتہ گوہر۔ مثال کے لیے دیکھو اختر شفق آلود۔

ہرکارہ۔اسیر ؎ صاف اشکوں سے ہے ظاہر کہ ہوا دل پانی۔گرم ہرکارے ہیں سچی یہ خبر دیتے ہیں۔

ہیرے کی کنی۔میر ؎ لیتا ہی نکلتا ہے مرا لخت جگر اشک۔آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے۔

یوسف۔ اسیر ؎ دیدۂ گریاں کو طفل اشک نے چمکا دیا۔خانداں یعقوب کا یوسف سے روشن ہو گیا۔

آنسو آنا۔آنسوؤں کا آنکھ سے ٹپکنا۔ناسخ ؎ کسکے دانتوں کی چمک کا دھیان ہے جو رات دن۔متصل آتے ہیں آنسو سبحہ بلور سے۔

آنسو ایک نہیں کلیجا ٹوک ٹوک۔یہ مثل اس شخص کی نسبت بولتے ہیں جو کسی رنج و غم کو زبان سے بہت کچھ ظاہر کرے مگر کسی قسم کا اثر نہ پایا جائے۔

آنسو بہانا۔رونا۔وزیر ؎ ہوں وہ غمدیدہ ہنسے کوئی تو میں رونے لگوں۔کچھ بھانہ چاہیے آنسو بہانے کے لیے۔نسیم ؎ پھر میں بھی کچھ کہوں گا دیکھو زبان روکو۔پھر منہ چھپاے مجسے آنسو بہایئے گا۔کیف ؎ بہا دینا کوئی آنسو بھی اتنا خون بہا دینا۔لہو میرا جب اپنی تیغ سے اے تیغزن دھونا۔

آنسو بھر آنا۔آبدیدہ ہو جانا۔صبا ؎ دل میں اک درد اُٹھا آنکھونمیں آنسو بھر آئے۔بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا۔ کیف ؎ لاکھ ہنستا ہوں میں آنسو سے بھرے آتے ہیں۔کبھی چھپتی ہی نہیں رنج و محن کیصورت۔

آنسو بھر لانا۔مستعدی۔اسیر ؎ کھل گیا راز محبت نہ رہا کچھ پردہ۔اشک بہر لا کے ان آنکھوں نے ڈبویا مجکو۔مومن ؎ سوزش دل جب کہتے ہیں تب آنسو وہ بھر لاتے ہیں۔موم کی مانند آتش غم سے پتھر کو پگھلاتے ہیں۔

آنسو بہنا۔آنسو جاری ہونا۔آغا حجو شرف ؎ فردوس میں رولونگا شرف اتنے ہی موتی۔بہتے ہیں جو میرے غم شبیر میں آنسو۔

آنسو پاک کرنا۔آنسو پوچھنا۔(حقیقی معنونمیں)اختر شاہ اودہ ؎ صورت جان لیا بغل میں اسے۔چہرے سے آنسو اس کے پاک کیئے۔

آنسو پچھنا۔تسکین ہونا۔بحر ؎ شہر سے ہمنے قدم اپنے نکالے شکر ہے۔کچھ تو آنسو پچھگئے دامان صحرا دیکھکر۔نسیم ؎ قدر کہتا ہے نہایت گریہ بیچارگی۔زخم کے پچھگئے ہیں آنسو دامن شمشیر سے۔

آنسو پوچھنا۔(پوچھنا بواو مجہول)حقیقی معنونکی مثال۔اسیر ؎ دامن کو موتیوں سے وہ بھر لیگا روز حشر۔پوچھے گا آستین سے جو آنسو یتیم کے۔مجازاً تسکین اور دلاسا دینا۔گلزار نسیم ؎ روشن کیا دیدۂ پدر کو۔مادر کے بھی چلکے آنسو پوچھو۔ مومن ؎ کوئی نر ہا کہ پوچھے آنسو۔کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو۔

آنسو پھوٹ نکلنا۔آنسو بہ نکلنا۔آنسو نکل پڑنا۔انشا۔ آنکھوں سے اپنی آنسو کچھ ایسے پھوٹ نکلے۔فوارے کسی نے جیسے ہونٹ کو توڑا۔

آنسو ل پی جانا۔ایسا ضبط کرنا کہ بہے ہوئے آنسو آنکھ ہی میں خشک ہو جائیں باہر نہ نکلیں۔قلق۔ آنسو آنکھوں میں گاہ بھر لانا۔خوف کے مارے گاہ پیچانا۔داغ۔آنسو نہ پیئے جائیں گے اے ناصح ناداں۔ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی۔بحر۔ نشتر لگا جگر میں اگر ضبط غم کیا۔آنسو جو پی گیا کوئی تیزاب ہو گیا۔

آنسو توڑ۔(ہندوستانی ٹھگونکی اصطلاح) بے موسم کے مینہ کو کہتے ہیں جو برسات کے سوا اور دنوں میں برسے ٹھگوں کے اعتقاد میں یہ شگون بد ہے گھر سے نکلتے وقت اگر مینہ برسنے لگے تو نجائیں بلکہ دو ایک منزل جا چکے ہیں تو بھی پلٹ آئیں اور ایک دن رات گھرے سفر کے قصد پر نہ نکلیں۔

آنسو تھمنا۔رقت موقوف ہونا۔ناسخ۔ کیا ہی آنکھیں ہجر میں جلنے لگیں۔کوئی دم جو میرے آنسو تھم رہے۔

آنسو ٹپک پڑنا۔بے اختیار رو دینا۔اسیر۔وہ گریہ دوست ہیں بلبل ٹپک پڑے آنسو۔ہماری آنکھوں نے دیکھا جو خواب خندۂ گل۔

آنسو جاری یا رَوان ہونا۔آنسو بہنا۔مصحفی۔رو کے رُکتے نہیں ہیں اب آنسو۔جاری رہتے ہیں روز و شب آنسو۔بحر۔ تری یاد میں مُنھ پہ آنسو رواں ہیں۔تجھے سجدہ کرنے کو ہر دم وضو ہے۔ظفر۔آنسوؤ نکا مری آنکھوں سے رواں ہو جانا۔اور مرا راز نہاں سب پہ عیاں ہو جانا۔

آنسو جوش پر آنا۔بہت رونا۔رشک۔آنسو آئیں جوش پر تو روکنے والا ہے کون۔آنکھیں ہیں گنگ و جمن عالم خس و خاشاک ہے۔

آنسو چلنا۔آنسو بہنا۔آنسو رواں ہونا۔ ۔ کسطرح اُسکو روانہ کروں ناسخ مکتوب۔جائے قاصد مرے آنسو دم تحریر چلے ہی آنے لگے منھ پر متصل۔کیا کیجئے اب کہ راز محبت نہاں رہے۔ظفر۔بارے آنسو ترے اے دیدۂ تر چل نکلے۔پاؤں چل سکتے نہیں لڑ کے یہ پر چل نکلے۔

آنسو دینا۔جب شمع کی چربی پگھلکر بوندیں چمکتی ہیں تو کہتے ہیں کہ شمع آنسو دیتی ہے۔سحر۔منظور روح کو نہیں افشائے راز عشق۔آنسو ہماری شمع اور کیا مجال ہے۔

آنسو ڈالنا۔رونا۔مشہور شعر۔شمع روئے قبر پر گلرو ہمارے واسطے۔حیف تو ڈالے نہ دو آنسو ہمارے واسطے۔

آنسو ڈَبڈَبا آنا۔آنسو بھر آنا۔آبدیدہ ہونا۔بحر۔نہ پوچھو کسلیے آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے۔کسی جگہ سے ہم آتے ہیں

چوٹ کھائے ہوئے۔فقرہ۔اُنکا یہ حال دیکھکر ہر شخص کی آنکھوںمیں آنسو ڈبڈبا آئے۔

آنسو ڈھال۔گھوڑونکی ایک بیماری ہے جسمیں آنکھ سے پانی آنسو کی طرح بہا کرتا ہے۔

آنسو ڈھلنا۔آنسو بہنا۔سوز۔رونا ہی تھم گیا ترے غصے کے خوف سے۔تہی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے۔غافل۔پھر صدمہ ہوا کوئی دل زار کے اوپر۔آنسو جو ڈھلے جاتے ہیں رخسار کے اوپر۔بحر۔چشم تر مثل صدف موتیوں کا سانچا ہے۔موتی بن بن کے یہاں اشک ڈھلا کرتے ہیں۔

آنسُو روکنا۔رونے کو ضبط کرنا۔کیف۔کسطرح اشک رواں عاشق مضطر روکے۔ایسا بہتا ہوا دریا کوئی کیونکر روکے۔

آنسو سوکھ جانا۔بیشتر جوش حیرت اور شدت قلق میں ایسا ہوتا ہے کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔میر حسن۔زمین میں سمایا تحیر سے آب۔گئے سوکھ آنسو کنوئیں کے شتاب۔

آنسو کا چھالا۔(یہ ایک مبالغہ شاعرانہ ہے) وہ آبلہ جو آنسوؤنکی حدت اور گرمی سے پڑ جائے۔اسیر۔یہاں تک زخم ہے دل میں کہ پہروں میں لہو رویا۔کوئی آنسو کا بھی چھالا جو دیکھا تیغ مژگاں میں۔(تلوار آئینے یا شیشے کے بنانے ڈھالنے میں خمیر کی کوئی بوند جمجاتی ہے تو اُسکو چھالا کہتے ہیں)

آنسو گرانا۔رونا۔غافل۔تونے تربت پہ مری دو نہ گرائے آنسو۔غم فرہاد میں شیریں نے بہائے آنسو۔

آنسو گر پڑنا۔بے اختیار رو دینا۔

آنسو رُکنا۔بے اختیار رونا۔ضبط گریہ نہو سکنا۔ظفر۔دل جو امڈے تو رُکیں روکے سے کیونکر آنسو۔کہیں دریا بھی ہے اے دیدۂ نم بند ہوا۔

آنسو نکل پڑنا۔دیکھو آنسو ٹپک پڑنا۔داغ۔ناصح نے میرا حال جو مجسے بیاں کیا۔آنسو نکل پڑے مرے بے اختیار آج۔وزیر۔رو دیا دیکھکے تجکو تو نہو آزردہ۔پیش خورشید نکل آتے ہیں اکثر آنسو۔"(۴۷)

جامع اللغات:

"آنسو۔(ہ۔مذکر) ا۔وہ پانی جو از حد غم تکلیف یا خوشی کی وجہ سے آنکھوں سے نکلے۔اشک۔آنجھو۔ٹسوہ۔۲۔(صفت) رقیق پتلا (س اکش۔آنکھ)۔"

آنسو آنا (لازم) آنسو ٹپکنا یا نکلنا۔آنسوا منڈنا (متعدی) کثرت سے آنسو گرنا۔آنسو بہانا (متعدی) رونا۔آنسو بھر آنا (لازم) آبدیدہ ہونا۔آنسو بھر لانا (لازم) رونے کے قریب ہونا۔آنسو بھرے ہونا

(لازم) رونے کے قریب ہونا۔ آنسو بہنا (لازم) آنسو جاری ہونا۔ **آنسو پاک کرنا** (متعدی) آنسو پوچھنا۔ آنسو پچھنا (لازم) پونچھنا (متعدی) ا۔ اشک پاک کرنا۔ ۲تسکین دینا تسلی دینا۔ مظلوم کی دادرسی کرنا۔ آنسو پُھوٹ نکلنا (متعدی) آنسو بہ نکلنا۔ **آنسو پی جانا۔ پی کے رہ جانا۔** پینا (متعدی) ضبط کرنا۔ رونے کو روکنا۔ آنسو آنکھ سے باہر نہ نکلنے دینا۔ صبر کرنا آنسو تر ہونا (لازم) آنسو بہت نکلنا۔ آنسو توڑ (مذکر) ٹھگوں کی اصطلاح میں وہ بارش جو برسات کے علاوہ اور موسم میں ہو۔ یہ شگون بد سمجھا جاتا ہے۔ آنسو تھمنا (لازم) رونا بند ہونا۔ رقت موقوف ہونا۔ آنسو ٹپ ٹپ گرنا یا ٹپک پڑنا یا ٹپکانا (متعدی) بے اختیار آنسو نکل آنا رنج ہونا۔ صدمہ ہونا۔ کسی کی یاد میں آبدیدہ ہونا آنسو ٹھیرنا (لازم) آنسو رک جانا۔ آنسو جاری ہونا (لازم) آنسو بہنا۔ آنسو جوش پر آنا (لازم) آنسو امنڈنا۔ آنسو چلنا (لازم) آنسو بہنا۔ آنسو خشک ہو جانا (لازم) رونا نہ آنا۔ آنسو نہ نکلنا بیحد رنج وغم میں آنسو نہ نکلنا۔ آنسو دینا (متعدی) شمع کی موم یا چربی کا پگھل کر گرنا۔ آنسو ڈالنا (متعدی) رونا۔ آنسو ڈبڈبا آنا (لازم) آنسو لانا (متعدی) آنکھوں میں آنسو بھر آنا۔ آنسو ڈھال یا ڈھلک (مونث) گھوڑوں کی ایک بیماری جس میں آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔ آنسو ڈھلکنا یا ڈھلنا (لازم) آنسو بہنا۔ آنسو رواں ہونا (لازم) آنسو جاری ہونا۔ رونا۔ آنسو رُکنا (لازم) رونا بند ہونا۔ آنسو روکنا (متعدی) ضبط کرنا۔ آنسو سوکھ جانا (لازم) خشک ہو جانا۔ آنسو کا آبلہ یا چھالا (مذکر) آبلہ جو آنسوؤں کی شدت یا گرمی سے پڑ جائے۔ آنسو گرانا (متعدی) رونا۔ آنسو گر پڑنا (لازم) بے اختیار رو دینا۔ آنسو گرنا (لازم) آنسو ٹپکنا۔ آنسو نہ رُکنا (لازم) بے اختیار رونا۔ آنسو نکل آنا یا نکل پڑنا (لازم) آنسو ٹپک پڑنا۔ آنسو نکلنا (لازم) رونا۔ آنسو نہیں تھمتے ادل سے رنج نہیں جاتا۔ ۲گریہ ہے۔ (۴۸)

فرہنگِ آصفیہ:

''آنسُو۔ ہ۔ اِسم مذکّر۔ س (　　شرُو) پراکرت (آنسو) پالی (اسّو) فارسی (اشک) پُرانی ہندی (آنجُو۔

آنجھو۔انجو) مگر پدماوت میں (انسو) آیا ہے جیسا اُس مصرعہ میں ۔ رکت ڈھرا مانسو رگرا ہاڈ بھئے سب سنکھا (۱) اشک۔آنکھ کا پانی۔آبِ دِیدہ۔ٹسوہ۔وُہ پانی جو شِدتِ غم یا افراطِ خوشی خواہ آشوبِ چشم کے سبب آنکھوں سے ٹپکنے لگتا ہے۔

ڈھونڈتی رہتی ہیں کیا کیا مری آنکھیں آنسو   ایک بھی ہوتا ہے دامن سے جو باہر آنسو (نسیم دہلوی)

آنسوؤں کی جھڑ لاگ رہی سب چھائے رہے بادریا   موروا بولے پپیہا بولے امواپہ بولے کویلیا (ٹھمری)

(مثل) آنسوا ایک نہیں کلیجہ ٹوک ٹوک (۲) صفت پتلا۔رقیق۔پانی سا۔

صدفِ چشم میں دیکھے جو مری اشک کی آب   پانی پانی گُہر ایسا ہو کہ آنسو ہو جائے (امانت)

(فقرہ) ایسا شُروا بہا دیا جیسے آنسو۔آنسو سا شروا تھا (عو)+

آنسو آنا۔ہ۔فعِل لازِم۔(۱) آنسو بھر آنا۔آنسو ٹپک پڑنا۔آنسو نِکل آنا۔آنکھ میں پانی بھر آنا (فقرہ) ایسی تیز مرچیں تھیں کہ آنسوں آ گئے۔

(۲) رانا آنا۔رُنکھا ہونا۔رُوانسا ہونا۔مثل) پر کے مُوی سا ئسوا بکے آئے آنسو۔

آنسو بہانا۔ہ۔فعل لازم۔(۱) رونا ٹسوے بہانا۔گریہ وزاری کرنا۔اشک رواں کرنا + جان بُوجھ کر رونا۔رونے کا بہانا کرنا۔ماتم کرنا۔

(۲) پرسا دینا۔منہ ڈھانکنا۔جیسے دادی کے مرنے پر چار آنسو نہ بہائے گئے ساس کو پیٹنے بیٹھ گئیں۔

ہمارے آگے نہ آنسو تُو اے سحاب بہا   وگر بہادے تو یُونہیں دُرِخوش آب بہا (ظفر)

ہم پیٹھکے اُس در پر کب آنسو بہاتے ہیں   ناحق یہ عدُو ہم پر طُوفان اُٹھاتے ہیں (۔)

ابرِتر آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے   برقِ مضطر طلملا نا کوئی ہمسے سیکھ جائے (ذوق)

بلا ٹلتی ہے بخشش سے بہا اے چشم تر آنسو   ملے کچھ دامِ خالی کو صدقہ رُوحِ غمگیں کا (نسیم دہلوی)

اِسقدر آنسو بہائے ہمنے جل تھل بھر گئے   لوگ کہتے ہیں مہینا تو نہ تھا برسات کا (۔)

پھر میں بھی کچھ کہونگا دیکھو زبان روکو   پھر منہہ چُھپا کے مُجھ سے آنسو بہائیگا (۔)

کسی سے کوئی نہ دل لگائے نسیم کیا یہ کیفیت بتائے وُہی اب آنسو بہائے آئے لہو جو میرا بہا چکے تھی (۔)

سُن لیا سُرمہ لگاتے میں جو حالِ مرگِ غیر   کیا اُسے آنسو بہانے کا بہانہ ہو گیا (حیدر)

ڈر ہے اٹھا ندے کہیں وہ بزمِ عیش سے   کیا تاب ہے کہ شیفتہ آنسو بہائے شمع (شیفتہ)

خدا جانے کہ دلبر آج حالت کیا گزرتی ہے کبھی بیتاب ہوتا ہے کبھی آنسو بہاتا ہے (جرأت)

دمِ آخر مری بالیں پہ آؤ گے تو کیا ہوگا میاں صاحب جو دو آنسو بہاؤ گے تو کیا ہوگا (۔)

جلتا تھا میرا سینہ اے شمع تسپہ تُو نے دُونی لگائی آتش آنسو بہا بلا کر (۔)

محفلِ محبوب میں ہیں یار بھی اغیار بھی اک ذرا آنسو بہا اے دیدۂ تر دیکھ کر (اسیر)

ہوں وہ غمدیدہ ہنسے کوئی تو میں رونے لگوں کچھ بہانا چاہئے آنسو بہانے کے لئے (وزیر)

مجھے شمع کہتی ہے محفل میں اُس کی میاں بحر آنسو بہانے سے حاصل؟ (بحر)

(فقرہ) کیا برا کہا تھا جو آنسو بہانے بیٹھ گئے (عو)+

آنسو بھر آنا۔ ہ۔ فعل لازِم۔ آنکھوں میں پانی بھرنا۔ آبدیدہ ہونا۔ صدمہ یا رحم کی حالت میں آنکھوں کا ڈَبڈَبا آنا۔ رونا آجانا۔ آنکھیں ڈَبڈَبا جانا۔

برا ہو جوشِ رقت کا تحمل ہو نہیں سکتا میں کتنا ضبط کرتا ہوں مگر آنسو بھر آتے ہیں (بیخود)

مری آنکھو نمیں بزمِ خوباں بنیں جو بھر آئے گمانِ بد سے وہ رکنے لگا کیا بدگمانی ہے (جرأت)

آنسو بھرلانا۔ ہ۔ فعل لازم، رونے کی شکل بنانا۔ آبدیدہ ہونا۔ دکھ جتانے کے لئے آنکھوں سے پانی بہانا۔ رُکھّنا ہونا۔ آنکھیں ڈَبڈَبانا اپنا صدمہ ظاہر کرنے کے واسطے بسُورنا، قریب بگریہ ہونا۔ کسی کی مصیبت پر رحم کھا کر رونے کے قریب ہو جانا۔

سوزشِ دل جب کہتے ہیں آنسو وہ بھر لاتے ہیں موم کی مانند آتشِ غم سے پتھر کو پگلاتے ہیں (مومن)

آنسو بھر لائے جو ہم دیکھ اُنہیں تو یہ کہا آپ اس شکل پہ ہیں میرے مقرر عاشق (انشا)

آنسُو بَہنا۔ ہ۔ فعل لازم (۱) آنکھوں سے پانی جانا۔ ڈھلکا لگانا (۲) اشک رواں ہونا۔ اشک ریزی ہونا۔ رونا۔

آنسو ہے تو رشتہ بپا مُرغِ دل ہوا دانہ نے کی جو نشو نما دام ہو گیا (میر)

بتیاں لکھت سوری چھتیاں پھٹت ہیں آنسوا بہیں جیسے ندیاں ساون کی (ٹھمری)

آنسُو پُچھنا۔ فعل لازم۔ (۱) آنکھوں کا پانی پچھ جانا۔ رونا تھمنا

(۲) تسلی اور تشفّی ہونا۔ ڈھارس بندھنا۔ تسکین ہونا۔ آس بندھنا۔ تلافی ہونا۔

یوں کب ہمارے آنسو پچھیں ہیں کہ تو نے شوخ دیکھا کبھو ادھر نگہِ نیم باز ہے (رنگین)

قدر رکھتا ہے نہایت گریہ بیچارگی زخم کے پچھتے ہیں آنسو دامنِ شمشیر سے (نسیم دہلوی)

دیکھکر رونے کو رویابتِ ناداں میرے   کچھ تو آنسو پُچھے اے دیدۂ گریاں تیرے (نکہت)

(فقرے) چلو سو ۱۰۰ روپے میں سے دس بھی ملگئے تو بھی کچھ نہ کچھ آنسو پُچھ گئے۔

اب بھی مینہ برس جائے تو آنسو پُچھ جائیں +

آنسُو پوچھنا۔ ہ۔ فعلِ متعدی۔ (۱) آنکھوں کا پانی خشک کرنا۔ کپڑے یا ہاتھ سے کسی کے آنسو پوچھنا۔

مرا وہ گریۂ غم خندۂ عشرت سے بہتر ہے   اگر آنسو میرے پونچھے وہ گل رخسارِ دامن سے (ذوق)

میرے آنسو نہ پونچھ اے ہمدم   اشکباری زیادہ ہوتی ہے (معروف)

(۲) تسلی دینا۔ تسکین بخشنا۔ ڈھارس بندھانا۔ دلاسا دینا۔ چمکارنا۔ پُچکارنا۔ تشفّی دینا۔ پیار کرنا + رحم کرنا + آس بندھانا + ہمدردی کرنا۔ تلافی مافات کرنا۔

اس دستِ حنائی نے آنسو جو مرے پونچھے   حسرت سے لہو ٹپکا دو چار کی آنکھوں سے (ممنون)

اُمنڈ آتا ہے دل جسوقت کب روکے سے رکتا ہے   مجھے رونے دو یارو میرے آنسو پونچھتے کیوں ہو (ظفر)

ظفر ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے   رہا کون اپنے آنسو پوچھنے والا ہے رونے میں (ظفر)

اے حنائی پنجہ تُو آنسو نہ پوچھیگا کبھی   روتے روتے گر مرے اشکوں میں خوں آجائیگا (ظفر)

کوئی نہ رہا کہ پونچھے آنسو ++   کیا روؤں میں اپنی بے کسی کو (مومن)

آنسو مرے جوانہوں نے پونچھے   کل دیکھ رقیب جل گیا تھا (درد)

مسند سے شہ اُٹھ کے بیٹھایا   بولا بیٹے سے جانِ بابا (گلزار نسیم)

روشن کیا دیدۂ پدر کو   مادر کے بھی چل کے آنسو پوچھو (۔)

ارمان نکل جائیں کچھ عاشقِ مضطر کے   آنسو نہ میری پوچھو رو لینے دو جی بھر کے (نسیم دہلوی)

آنسو پوچھیں گے کب تلک احباب   ٹپکا نہ رُکے گا چشمِ تر کا (نسیم دہلوی)

غیر کی ایسی ہنسی کی تمنے وہ رونے لگا   آج آنسو میرے پوچھے ہیں ذرا سرکار نے (معروف)

آنسُو پی جانا۔ و۔ فعل متعدی۔ چپکے چپکے رونا۔ آنکھ سے آنسو کا باہر نہ نکلنے دینا۔ رونے کو روکنا۔ غم کھانا۔ صدمہ سہارنا۔ آنسو نگل جانا۔ صدمہ جھیلنا۔

کھل نہ جاوے عشق کا پردہ کہیں   آنسوؤں کو اپنے پی جاتے ہیں ہم (شیریں)

تُو نے ڈھکا کے ہمیں غیر کو ساغر جو دیا   ساقیا پی گئے ہم آنکھ میں بھر کر آنسو (وزیر)

آنسو پینا ۔ ہ۔ فعل متعدی ۔ چپکے چپکے رونا۔ آنکھوں سے پانی نگرنے دینا + دل ہی دل میں غم کھا کر چپ ہو رہنا۔ صبر کرنا۔ رونے کو ظاہر نہ ہونے دینا۔ دل پر صدمہ انگیز نا۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں　　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں (میر حسن)

(فقرے) وہی سار کا تھا جو آنسو پی کر چپکا ہو رہا۔ جب بس چلا تو آنسو پی کر بیٹھ رہا۔

آنسو توڑ ۔ ہ۔ اسمِ مذکر۔ (ٹھگ) غیر موسم کی بارش۔ بن رُت کا مینہ۔

آنسو تھمنا۔ ہ۔ فعل لازم۔ آنسو رکنا۔ اشک ریزی بند ہونا۔ رونا۔ موقوف ہونا۔ رونا بند ہونا۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو　　　رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے (میر)

(فقرہ) کیا مقدور جو ذرا آنسو تھمے +

آنسو ٹپکانا ۔ ہ۔ فعل متعدی۔ آنو ڈھلکانا۔ رونا۔ گریہ کرنا۔ آنسو ڈالنا۔ آنکھوں سے پانی گرانا +

حسرت انجامِ سکندر کی اگر مجھسے سنے　　　چشم جوہر سے ابھی ٹپکائے آنسو آئینہ (ناسخ)

(فقرہ) اللہ ری کٹر اماں کے مرنے پہ بھی دو آنسو نہ ٹپکائے +

آنسو ٹپک پڑنا۔ ہ۔ فعل لازِم۔ آنسو گر پڑنا۔ آنکھوں سے پانی نکل پڑنا۔ کسی صدمہ کے اثر سے رو پڑنا ۔

بے یار جام میں مرے آنسو ٹپک پڑے　　　پیتے ہیں جیسے پانی ملا کر شراب میں (ناسخ)

(فقرہ) اس صدمے کے سنتے ہی آنسو ٹپک پڑے +

آنسو چلنا ۔ ہ۔ فعل لازِم۔ آنسو بہنا۔ اشک رواں ہونا۔ آنکھوں سے پانی جاری ہونا۔ (لکھنوء) ۔

کس طرح اس کو روانہ کروں ناسخ مکتوب　　　جائے قاصد مرے آنسو دمِ تحریر چلے (ناسخ)

آنسو خشک ہونا۔ ا۔ فعل لازم آنسو سوکھنا۔ آنسو جذب ہونا۔ آنکھوں میں پانی جاری رہنا۔

اٹھانا بارِ منت شاق تھا پیراہنِ تن کا　　　ہوئے خشک آنکھ میں آنسو لیا احساں نہ دامن کا (نسیم دہلوی)

آنسو ڈالنا ۔ ہ۔ فعلِ لازم (عو) آنسو گرانا۔ آنسو ٹپکانا۔ رونا۔ گریہ کرنا

(فقرے) یہ آنسو ڈالنے کا کیا وقت ہے۔ چار آنسو بھی نہ ڈالے +

آنسو ڈبڈبانا۔ ہ۔ فعل لازم۔ آنکھوں میں پانی بھر آنا۔ رونے کے آثار نمایاں ہونا۔ آنسو بھر آنا۔ آثارِ گریہ نمودار ہونا +

آنسو ڈھال ۔ ہ۔ اسم مونث ۔ گھوڑوں کی ایک بیماری ہے جس سے ان کی آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے۔ جیسے

ڈھلکا+

آنسو کی دھار۔ ہ۔ اسم مونث۔ آنسوؤں کی قطار۔ آنسوؤں کا تار۔ پے در پے آنسو نکلنے۔

آنسو کی لڑی۔ ہ۔ اسم مونث۔ دیکھو۔ (آنسو کی دھار)

سلکِ مروارید دِنداں دیکھکر آنسوؤں کی میری لڑیاں بندھ گئیں (مؤلف)

آنسو گرانا۔ ہ۔ فعل لازم۔ (۱) دیکھو (آنسو ڈالنا) (۲) ماتم کرنا۔ پُرسا دینا۔ تعزیت ادا کرنا۔

تُو نے تُربت پہ مری دو نہ گرائے آنسو غمِ فرہاد میں شیریں نے بہائے آنسو (غافل)

بخل دیکھو تو مری تُربت پر ایک آنسو بھی وہ گرا نہ سکا (نسیم دہلوی)

آنسو گر پڑنا۔ ہ۔ فعل لازم۔ دیکھو (آنسو ٹپک پڑنا)۔

گر پڑے آنکھ سے اس کے بھی یکا یک آنسو ذکر محفل میں جو کچھ میرا ہوا میرے بعد (غافل)

آنسو گرنا۔ ہ۔ فعل لازم۔ دیکھو (آنسو بہنا۔ آنسو ٹپکنا) +

آنسو نِکل آنا۔ ہ۔ فعل لازم۔ آنسو ٹپک پڑنا۔ آنسو ظاہر ہونا۔ کسی صدمہ یا چوٹ سے آنکھ میں پانی بھر آنا۔ جوشِ رحم یا غصہ سے آنکھ سے پانی بھر آنا۔ جوشِ رحم یا غصہ سے آنکھ سے پانی ٹپک پڑنا۔ کسی تیز چیز مثل مولی مرچ وغیرہ کے کھا لینے سے آنکھ میں پانی آ جانا۔

نہ سمجھو دیدۂ نرگس پہ کوئی قطرۂ شبنم کسی کی آنکھ دکھلائے سے یہ آنسو نکل آئے (جرأت)

نہ دیکھے آنکھ اٹھا کر آہ وہ بیدرد ایسا ہے جو روتے روتے آنکھوں سے مری آنسو نکل آئیں (جرأت)

(فقرہ) ایسی چٹکی لی کہ اس کے آنسو نکل آئے +

آنسو نِکل پڑنا۔ ہ۔ فعل لازم۔ بے اختیار رونا آنا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگنا۔ آنسو ٹپک پڑنا۔ صدمہ یا رحم یا خوشی کے باعث آنسو گر پڑنا۔

اگر جہاں میں رہوے شریکِ راحت و رنج ہنسی میں آنکھ سے آنسو نکل پڑے کیونکر (ظفر)

مانندِ شمع بس مری آنسو نکل پڑے دیکھا جو بے چراغ کسی کے مزار کو (وزیر)

آنسو نِکلنا۔ ہ۔ فعل لازم۔ دیکھو (آنسو بہنا اور ٹپکنا)۔

آنکھیں پتھرا گئیں جوں سنگِ سلیمانی آج نکلے آنسو تو یہ الفت نے نچوڑے پتھر (جرأت)'' (۴۹)

نور اللغات:

''آنسو۔(ع۔س۔اُشر۔)مذکر۔ا۔وہ پانی جو زیادہ غم و تکلیف بیحد خوشی سے آنکھوں میں پیدا ہو۔۲۔(مجازآ) بہت رقیق۔ پانی سا(فقرہ) آنسو سا شوربا پکا کے رکھدیا۔دیکھو اشک۔

آنسو آنا۔آنسوؤں کا آنکھ سے ٹپکنا۔ نکلنا (فقرہ) خدا جانے کیا بات یاد آئی کہ ان کی آنکھوں سے آنسو آنے لگے۔آنسو امنڈنا۔کثرت سے آنسو گرنا(قدر)اشک امنڈے ہجر میں جب آہ کی۔برق چمکی اور بادل گھر گیا۔آنسو ایک نہیں کلیجہ ٹوک ٹوک۔مثل اس شخص کی نسبت بولتے ہیں جو رنج وغم بہت کچھ ظاہر کرے لیکن کسی قسم کا اثر نہ پایا جائے۔یعنی دلی دردمندی نہیں ہے صرف مکاری سے اظہارِ دردمندی کرتا ہے۔آنسو بہانا۔رونا۔(ناسخ) رازپوشی کاش ہمکو بھی سکھائے عندلیب۔نام شبنم کا ہو اور آنسو بہائے عندلیب۔آنسو بھرآنا۔لازم۔آبدیدہ ہو جانا۔(صبا) دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا۔آنسو بھرلانا۔رونے کے قریب ہونا(رشک) ناتوانی یہ گلوگیر ہوئی ہے میری۔آنسو بھرلا کے پی جاؤں تو اُچھو ہو جائے۔آنسو بہانا۔آنسو جاری ہونا۔(فقرہ) اس حادثے کی خبر سنتے ہی گھر بھر آنسو بہنے لگے۔آنسو پاک کرنا۔متعدی۔آنسو پُوچھنا۔(اختر شاہ اودہ) صورتِ جان لیا بغل میں اُسے۔چہرے سے آنسو اُسکے پاک کیے۔آنسو پُچھنا۔تسکین ہونا۔تشفی ہونا۔صبر ہونا۔بہت نقصان یا تکلیف کے بعد کچھ فائدہ یا آرام ملنے سے خفیف سی تسکین ہونا۔مصیبت یا آفت یا پریشانی کے بعد کوئی بات ایسی ہونا جس سے کسی قدر تسلی ہو۔اپنے سے زیادہ کسی کا خراب حال دیکھکر تسلی ہونا۔آنسو پوچھنا۔ا۔اشک پاک کرنا۔(فقرہ) دامن سے آنسو پوچھ ڈالو۔۲۔تسکین دینا۔دلاسا دینا۔مصیبت زدہ یا مظلوم کی دادرسی کرنا۔(گلزارِ نسیم) روشن کیا دیدۂ پدر کو۔مادر کے بھی چل کے آنسو پوچھو۔آنسو پھوٹ نکلنا۔آنسو نکل پڑنا۔آنسو بہہ نکلنا۔(انشا) آنکھوں سے اپنی آنسو کچھ ایسے پھوٹ نکلے۔فوارے کے کسی نے جیسے ہونٹ کو توڑا۔آنسو پینا۔آنسو پیجانا۔آنسو پیکے رہجانا۔آنسو آنکھ سے باہر نہ نکلنے دینا۔آبدیدہ ہو کر ضبط کر جانا۔رونیکو روکنا۔ضبط کرنا۔صبر کرنا۔غم کھا کے چپ ہو رہنا۔(گلزارِ نسیم) کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں۔آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں۔(ناسخ) مئے پائی نہ پینے کو تو ہم پی گئے آنسو۔اشکوں سے بھی ساقی نہ بھرا جام ہمارا(وزیر) تو نے ڈھکا کے ہمیں غیر کو ساغر جو دیا۔ساقیا رہگئے ہم آنکھ میں پی کر آنسو۔آنسو توڑ۔ٹھگوں کی اصطلاح۔اُس مینہ کو کہتے ہیں جو برسات کے سوا اور دنوں میں برسے۔ٹھگوں کے اعتقاد میں یہ شگونِ بد ہے۔آنسو تھمنا۔رقت موقوف ہونا(قلق) آنسو تھم لیں تو کیجئے کچھ بات۔آنہیں دم لیں تو کیجئے کچھ بات۔آنسو ٹپک پڑنا۔ا۔دفعتاً آنسو گرنا۔بے اختیار آنسو گرنا۔رنج ہونا۔صدمہ ہونا۔کسی کے خیال سے آبدیدہ ہونا(اسیر) وہ گریہ دوست ہیں بلبل ٹپک پڑے آنسو۔ہماری آنکھوں نے دیکھا جو خوابِ خندۂ

گل۔(ناسخ) بے یار جام میں مرے آنسو ٹپک پڑے۔ پیتے ہیں جیسے پانی ملا کر شراب میں۔ آنسو ٹھہرنا۔آنسو تھمنا۔(ظفر) چشم میں دو قطرے آنسو کے نہ ٹھہرے ورنہ کیا۔ایک ڈبیا میں درِشہوار دو رہتے نہیں۔آنسو جاری ہونا۔آنسو بہانا۔آنسو جوش پر آنا۔آنسو امنڈنا۔(رشک) آنسو آئیں جوش پر تو روکنے والا ہے کون۔آنکھیں ہیں گنگ و جمن عالمِ خس و خاشاک ہے۔آنسو چلنا۔آنسو بہنا۔(فقرہ) بے اختیار آنکھوں سے آنسو چلنے لگے۔آنسو خشک ہونا۔رونا نہ آنا۔انتہائی رنج و غم بے حد تکلیف یا مصیبت میں آنسو نہیں نکلتے ہیں۔(نسیم) اٹھانا بارِ منت شاق تھا پیراہن تن کو۔ہوئے خشک آنکھ میں آنسو لیا احساں نہ داماں کا۔آنسو دینا۔جلتی ہوئی شمع کی چربی پگھل کر جب بوندیں ٹپکتی ہے تو کہتے ہیں کہ شمع آنسو دیتی ہے۔(سحر) منظور روح کو نہیں افشائے رازِ عشق۔آنسو ہماری شمع لحد کیا مجال دے۔آنسو ڈالنا۔رونا۔ شمع روئے قبر پر گلرو ہمارے واسطے۔حیف تو ڈالے نہ وہ آنسو ہمارے واسطے۔ آنسو ڈبڈبا آنا۔آنسو بھر آنا۔آبدیدہ ہونا۔(فقرہ) اُنکا یہ حال دیکھکر ہر شخص کے آنکھونمیں آنسو ڈبڈبا آئے۔آنسو ڈبڈبالانا۔آنکھوں میں آنسو بھر لانا۔آنسو ڈھال۔گھوڑونکی ایک بیماری جسمیں آنکھ سے پانی آنسو کیطرح بہا کرتا ہے۔ آنسو ڈھلکنا۔آنسو ڈھلنا۔(قدر) وہ مری آنکھ سے ڈھلکے ہوئے آنسو دیکھے۔جس نے لڑکوں کو نہوضد میں مچلتے دیکھا۔ آنسو ڈھلنا۔آنسو بہنا۔آنسو کا آنکھ سے نکل کر آہستہ آہستہ رخسار تک آنا۔(سوز) رونا ہی تھم گیا ترے غصے کے خوف سے۔تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے۔آنسو رواں ہونا۔آنسو جاری ہونا۔آنسو رکنا۔رونا بند ہونا۔آنسو روکنا۔ رونیکو ضبط کرنا۔(کیف) کس طرح اشک رواں عاشق مضطر روکے۔ایسا بہتا ہوا دریا کوئی کیونکر روکے۔آنسو سوکھ جانا۔آنسو خشک ہو جانا۔یہ حالت اکثر حیرت اور قلق کی شدت میں ہوتی ہے۔(میر حسن) زمین میں سمایا تحیّر سے آب ۔گئے سوکھ آنسو کنوئیں کے شتاب۔آنسو کا چھالا۔وہ آبلہ جو آنسووں کی حدت اور گرمی سے پڑ جائے۔(اسیر) یہانتک زخم ہے دل میں کہ پہروں میں لہو رویا۔کوئی آنسو کا بھی چھالا جو دیکھا تیغ مژگاں میں۔آنسو گرانا۔رونا۔(غافل) تو نے تربت پہ مری دو نہ گرائے آنسو۔غم فرہاد میں شیریں نے گرائے آنسو۔آنسو گر پڑنا۔بے اختیار رو دینا۔آنسو گرنا۔آنسو ٹپکنا۔(فقرہ) یہ حال سنکر کوئی ایسا نہ تھا جسکی آنکھ سے دو چار آنسو نہ گرے ہوں۔آنسو نہ رُکنا۔بے اختیار رونا۔آنسو بہے جانا۔ضبط گریہ نہو سکنا۔آنسو نکل آنا۔آنسو نکل پڑنا۔آنسو ٹپک پڑنا۔(وزیر) رو دیا دیکھکے تجھکو تو نہو آزردہ۔پیشِ خورشید نکل آتے ہیں اکثر آنسو۔(داغ) ناصح نے میرا حال جو مجھسے بیاں کیا۔آنسو نکل پڑے مرے بے اختیار آج آنسو نکلنا۔رونا۔(جیب) بخار دل بھی نکلا ساتھ ہی آنسو نکلنے کے۔بڑی راحت ملی احساں ہے ہم پر چشم گریاں کا۔"(۵۰)

اس طرح مختلف لغات کے اندراجات کا جائزہ لینے سے جو بات سامنے آتی ہے اس کے مطابق مولوی عبدالحق کی 'لغتِ کبیر' کو بعض حوالوں سے دیگر لغات پر فوقیت حاصل ہے جبکہ اس میں چند کمزوریاں بھی موجود ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور جامع اللغات میں ہر لفظ پر ضروری اعراب لگائے گئے ہیں۔ نور اللغات میں قدیم طریقہ کے مطابق الفاظ کے ہر حرف کو علیحدہ کر کے اعراب کی تفصیل درج کی گئی ہے جبکہ 'اردو لغت' میں دونوں طریقوں کا امتزاج کیا گیا ہے۔ ہر لفظ پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں اور ساتھ ہی اس کو حروف میں تقسیم کر کے اعراب کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ جبکہ مولوی عبدالحق نے اعراب کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ خصوصاً جو بات لغتِ کبیر اور اردو لغت کے موازنے سے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ 'اردو لغت' میں الفاظ کے تلفظ کی نشاندہی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور ہر لفظ کا تلفظ اعراب کی صورت میں حروف پر درج کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ہر لفظ کے حروف کو علیحدہ کر کے تلفظ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مولوی عبدالحق نے الفاظ کے تلفظ کے حوالے سے مقدمے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تلفظ کے اندراج کا قدیم طریقہ اچھا تھا جس میں تلفظ کو عبارت میں ظاہر کر دیا جاتا تھا اور اس طرح غلطی کا امکان نہیں رہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی رائے دی کہ اس طریقِ کار میں طوالت کی وجہ سے پڑھنے میں الجھن ہوتی تھی اس لیے اب یہ متروک ہے اور ضروری ہے کہ لغت میں اعراب کا استعمال کیا جائے اور لغت میں احتیاط کے ساتھ الفاظ کے حروف پر اعراب لگا دیے جائیں لیکن لغتِ کبیر میں انہوں نے تلفظ کے حوالے سے زیادہ تردد نہیں کیا اور صرف الفاظ کے حروف کو علیحدہ علیحدہ لکھ دیا گیا ہے جبکہ نہ ان پر اعراب لگائے گئے ہیں اور نہ ہی ان کے بیان کردہ قدیم طریقے کے مطابق حرکات و سکنات کا اندراج کیا گیا ہے۔ چند الفاظ کی مثالیں یہ ہیں: آب زن (آ ب ز ن)، آبشار (آ ب ش ا ر)، آبکار (آ ب ک ا ر)، آبکاری (آ ب ک ا ر ی)، آبکش (آ ب ک ش)، آبگیر (آ ب گ ی ر)۔ البتہ اس سلسلہ میں انہوں نے الفاظ کی ظاہری آواز کی وضاحت کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اس طرح الفاظ کے تلفظ کو واضح کیا ہے مثلاً آبگینہ کا تلفظ (آ ب گ ی ن ا)، آبلہ (آ ب ل ا) آبشورہ (آ ب ش و را)۔

ڈاکٹر مسعود ہاشمی مولوی عبدالحق کی لغت کبیر میں تلفظ کے طریقہ کار کی کمزوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صورت یہ ہے کہ اس لغت میں الفاظ اور اندراجات کا بالعموم تلفظ نہیں دیا گیا البتہ

کہیں کہیں اختلافِ تلفظ کی نشاندہی کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔مگر اس سلسلے میں بھی یکسانیت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''آتش'' کے بارے میں قوسین میں یہ رائے ملتی ہے (ت کے زیر وزبر دونوں سے صحیح ،اردو میں اکثر زبر سے بولتے ہیں مگر قافیہ میں زیادہ تر زیر لاتے ہیں۔۔۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لغت میں تلفظ کی نشاندہی پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے ورنہ تمام اندراجات کے تلفظ کی ہر حال میں نشاندہی کی گئی ہوتی۔ چنانچہ اندراج ''آرائش'' کا تلفظ (آ را۔اِش) تو دیا گیا ہے مگر بعد کے اندراجات آزادگی، آسیب، آصف، آصفہ اور آصفی وغیرہ کا تلفظ اس لغت میں نہیں ملتا۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس لغت میں تلفظ کے سلسلے میں اختیار کردہ طریقہ کار اس کا سب سے کمزور حصہ ہے۔'' (۵۱)

لغتِ کبیر میں جو اہم بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ مولوی عبدالحق نے کسی بھی لفظ کا اندراج کرتے ہوئے اس کے دیگر زبانوں میں مترادفات درج کیے ہیں اور ساتھ ہی قدیم اردو اور پراکرت میں اس لفظ کی مختلف صورتوں کی بھی وضاحت کی ہے جس سے کسی لفظ کے اصل اور بنیاد کا پتہ لگانے میں کافی آسانی ہوتی ہے اور اس طرح اس کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔جبکہ دیگر لغات میں 'اردو لغت' میں اس بات کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا گیا ہے اور الفاظ کی اصل کا کھوج لگا کر ان کی مختلف ابتدائی شکلوں کو بیان کیا گیا ہے۔دراصل اردو لغت کا آغاز مولوی عبدالحق کی زیرِ نگرانی ہی ہوا اور وہ اس لغت کے مدیرِ اعلیٰ مقرر کیے گئے چنانچہ اس لغت کی تیاری کے اصول وضوابط ان کی نگرانی میں مقرر کیے گئے۔اس کے علاوہ مولوی عبدالحق نے لغتِ کبیر کے سلسلہ میں جمع شدہ مواد بھی اس لغت کے استفادہ کے لیے فراہم کیا۔اس طرح اردو لغت کے اندراجات کو لغتِ کبیر کی توسیعی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ایک اور بات جو لغتِ کبیر کے مقابلے میں 'اردو لغت' میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس میں ہر لفظ کی سند تین مختلف ادوار سے دی گئی ہے اور پھر یہ کہ ہر سند کے سلسلے میں مصنف کا سالِ وفات یا تصنیف کا سال بھی ساتھ درج کیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے الفاظ کی سند کے طور پر الفاظ کا نثری فقروں میں استعمال درج کیا ہے اور پھر بعض اوقات مختلف اساتذہ کے اشعار بھی سند کے طور پر پیش کیے ہیں۔جس سے الفاظ کا صحیح مفہوم واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔جب ہم دیگر لغات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے بھی اکثر میں لغت نویسوں نے یہ التزام کیا ہے۔خصوصاً فرہنگِ آصفیہ میں شعری اسناد کی کثرت ملتی ہے۔اسی طرح اردو لغت، امیر اللغات اور نور اللغات میں بھی زیادہ تر الفاظ کی سند میں اساتذہ کے اشعار درج کیے گئے ہیں۔البتہ جامع اللغات میں اشعار کی مثالیں بہت ہی کم ہیں اور یہاں

پر زیادہ سے زیادہ ذخیرۂ الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے الفاظ کی وضاحت کم رکھی گئی ہے تا کہ لغت کی ضخامت نہ بڑھے۔

مولوی عبدالحق نے لغتِ کبیر میں نہ صرف الفاظ کا مفہوم واضح کیا ہے بلکہ الفاظ کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی درجہ بندی بھی کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ کس لفظ کا استعمال کس ماحول اور کن طبقات میں مستعمل ہے۔مثلاً انہوں نے عورتوں کی زبان سے متعلقہ الفاظ کی بھی خاص طور پر نشاندہی کی ہے دراصل وہ اردو زبان کے فروغ اور ارتقاء میں عورتوں کی زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس طبقہ سے متعلقہ الفاظ کو ایک خاص مزاج اور انداز رکھنے کے باعث دوسرے الفاظ سے ممیّز کرتے ہیں۔اگرچہ دیگر لغات میں بھی اس قسم کی وضاحت ملتی ہے لیکن بہت کم اور سوائے لغتِ اردو کے دوسری لغات میں الفاظ کے اس مزاج کی وضاحت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

لغتِ کبیر میں مختلف الفاظ کی قواعدی حیثیتوں پر بھی خاص طور پر بحث کی گئی ہے اور ان کے عملی اطلاق کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔اس موقع پر امیر اللغات کے اندراجات کا حوالہ دینا کافی اہم ہے جس میں الفاظ کی معنوی خوبیوں اور ان کے حسنِ بیان کو واضح کرنے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے اور اس لغت کا یہ انداز لغتِ کبیر سے جداگانہ صورت رکھتا ہے۔امیر مینائی نے مختلف الفاظ کے صفاتی تشبیہاتی اور استعاراتی استعمال کو تفصیلاً درج کیا ہے اور اساتذہ کے اشعار کے ذریعے کثرت کے ساتھ اسناد پیش کی ہیں۔

مولوی عبدالحق کی لغتِ کبیر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس لغت میں دیگر لغات کے مقابلے میں الفاظ کے معانی توضیحی شکل میں دیے گئے ہیں اور ان کا وضاحت انداز اپنے اندر جدید سائنسی طرز رکھتا ہے۔انہوں نے کسی لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے قریب المعانی اور ہم معانی الفاظ کو بطور مترادف درج کرتے ہوئے بے حد احتیاط سے کام لیا ہے کیونکہ وہ ہر لفظ کے اندر اس کے مفہوم کی منفرد حیثیت کو جانتے تھے اور ان کی رائے ہمیشہ یہی رہی کہ کوئی لفظ دوسرے لفظ کے مفہوم کو مکمل طور پر ادا نہیں کرسکتا۔اس لیے انہوں نے کسی لفظ کے مترادفات کے اندراج کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے معانی کی وضاحت اور تشریح کو لغت میں خاص طور پر لازمی سمجھا ہے۔مولوی عبدالحق کے اسی انداز کو سامنے رکھتے ہوئے اردو لغت میں بھی معانی کی وضاحت کے طریقہ کار کو انہی خطوط پر اپنایا گیا ہے۔

دراصل مولوی عبدالحق اردو لغت کی تالیف کے وقت یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ ایک لغتِ نویس

لغت کو مرتب کرتے ہوئے انتہائی غیر جانبدارانہ انداز اختیار کرے وہ تنقید لغت کی بجائے تالیف لغت کو ضروری سمجھتے تھے اور لغت نگار کو یہ حق نہیں دیتے تھے کہ وہ الفاظ کے استعمال میں قباحتوں اور خامیوں کا جائزہ لینے بیٹھ جائے بلکہ اساتذہ اور اہلِ زبان نے ایک لفظ کو جس طرح لکھا اور ادا کیا وہی اس لفظ کے استعمال کی ان کے نزدیک سند ہے۔

مولوی عبدالحق نے لغت کبیر کو جدید سائنسی انداز میں ترتیب دیا اور اس سلسلہ میں وہ اندراجات کو ایک باقاعدہ اور واضح شکل دیتے ہیں۔ان کا انداز یہ ہے کہ ہر بنیادی اندراج کے بعد اس کے ذیلی اندراجات درج کیے گئے ہیں۔ذیلی اندراجات میں بنیادی اندراج کی تکرار کی بجائے اس بنیادی اندراج کی جگہ ایک خط کھینچ کر ذیلی اندراج دیا گیا ہے۔مثلاً الف ممدودہ (آ) کے بنیادی اندراج کے بعد اس کے تحت جو ذیلی اندراجات دیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: --کر، --کے، -بلا گلے لگ، -بننا، -بیٹا آ، - بیٹھنا، -بیل مجھے مار، - پڑنا، - پکڑنا، - پہنچنا، - پھنسنا، - پھنسنے کی بات، -تو سہی، -ٹھہرنا، - جا، - جاری چڑیا، -جاری نندیا تو آ کیوں نہ جا ننھے کی آنکھوں میں گھل مِل جا، - جانا، - چلنا، - دبانا، - دبوچنا، - دھمکنا، - دیکھنا، - ڈٹنا، - رہنا، - سمانا، - کر، -موجود ہونا، - نکلنا۔

ترقی اردو بورڈ کراچی کی اردو لغت میں بھی اسی انداز کو اپنایا گیا ہے لیکن اس میں الفاظ کا ذخیرہ لغتِ کبیر سے کہیں زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ذیلی عنوانات کی تعداد لغت کبیر سے کافی زیادہ ہے۔مثلاً آ کے تحت ذیلی عنوانات جو اردو لغت میں موجود ہیں وہ یہ ہیں: - آ کرنا، - آ جانا، - آ کر / کے، - براجنا، - بسنا، - بلا گلے پڑ (نہیں پڑتی تو بھی پڑ)، - بلا گلے لگ، - بلا مجھے مار، - بندھنا، - بننا، - بنی سر پر اپنے، - (-اپنے) چھوڑ پرائی آس، - بوا لڑے، - بے لونڈے جا بے لونڈے کرنا، - بیٹھنا، - بیل (تو) مجھے مار، - بیل مجھے بھکوس نہیں تو میں تجھے بھکوسوں، - بھڑنا، - پڑنا، - پڑوسن گھر کا بھی لے جا، - پڑوسن لڑ، - پڑوسن مجھ سی ہو، - پکارنا، - پہنچنا، - بھٹکنا، - پھرنا، - پھنسنا، - پھنسنے کی بات، - تیری ایسی تیسی، - ٹپکنا، - ٹکنا، - ٹوٹنا، - ٹھسنا، - ٹھہرنا، - جمنا، - جھانکنا، - جھپکنا، - چڑھنا، - چک / چکو، - چکا / چکے، - چکنا، - چلنا، - چھپنا، - دلدر کاندھے چڑھ بیٹھ، - دیکھ / دیکھو، - دیکھے، - دھرنا، - دھمکنا، - دھسنا، - ڈٹنا، - رہنا، - رے، - سمانا، - کر، - کودنا، - کے، - کھڑا ہونا، - گرنا، - گئے براتی نہ خشکا نہ چپاتی، - گھرنا، - گھسنا، - گھیرنا، - لپٹنا، - لگنا، - لینا، - مرنا، - ملنا، - موجود ہونا، - نکلنا۔ (۵۲)

لیکن اس طریقہ کار میں ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جب کسی بنیادی اندراج کے تحت کافی تعداد میں ذیلی اندراجات کیے جاتے ہیں تو بنیادی اور ذیلی اندراج کے درمیان کئی صفحے کی دوری کے باعث کافی پیچیدگی

پیدا ہوتی ہے اور الفاظ کی تلاش کے وقت الجھن رہتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے اندراجات کے اس طریقہ کار پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود ہاشمی لکھتے ہیں:

''اس ہجائی ترتیب اور ذیلی اندراجات کو مکمل شکل کی بجائے جزوی شکل [-ریز-(آب ریز)] میں درجِ لغت کرنے کے نتیجے میں عجیب سی تکرار کی صورت بھی سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ''آب جوش'' ''آب چین'' آب چیک' آب خانہ، آب خور، آب دار، آب داری، آب شورہ، آب گینہ، وغیرہ دسیوں اندراجات کو پہلے آب (بمعنی۔ پانی عرق) کے تحت درج کیا گیا ہے پھر یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ دیکھو ''آبجوش'' آبچیں، آبگینہ وغیرہ۔ اس کے بعد ان اندراجات کو آب (بمعنی چمک دمک) اور آب (بمعنی باڑھ، دھار، کاٹ) کے تحت بھی درج کیا گیا ہے۔ اور پھر آگے چل کر ان اندراجات کو مفرد اندراج کی شکل میں بھی درج کیا گیا ہے اور اس چوتھے اندراج کے تحت ہی ان کے معنی وغیرہ دیے گئے۔ اس طرح آب دار آب داری وغیرہ اس لغت میں چار بار درج کیے گئے ہیں۔'' (۵۳)

اردو کی دیگر لغات میں اس قدر تفصیل سے کام نہیں لیا گیا اور ذیلی اندراجات بھی مقابلتاً کم درج کیے گئے ہیں۔ پھر یہ کہ ان کا اندراج بھی کسی باقاعدہ صورت میں نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ان کو پڑھنے یا تلاش کرنے میں کسی قدر دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً فرہنگِ آصفیہ میں الف ممدودہ کے ذیلی اندراجات کے تحت صرف ۱۳ اندراجات لکھے گئے ہیں اور کافی اہم اندراجات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

لغتِ کبیر میں اندراجات کی ترتیب کے حوالے سے ایک اور پیچیدگی جو پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مفرد الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے مرکبات اور محاورات کو بھی ہجائی ترتیب سے درج کیا گیا ہے جس سے بعض اوقات مطلوبہ لفظ تک پہنچنے میں کافی مشکل پیش آتی ہے ۔لغتِ کبیر کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود ہاشمی نے لغتِ کبیر کی ہجائی ترتیب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دشواری یہ پیش آتی ہے کہ بعض مرکبات، اپنے مفردات سے اتنے دور چلے جاتے ہیں کہ کبھی کبھی ان کے گم ہو جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ شاید اسی دشواری کے پیشِ نظر پاکستان ترقی اردو بورڈ کی ''اردو لغت'' میں ''لغت کبیر اردو'' سے کسی قدر مختلف اور آسان

طریقہ اختیار کیا گیا ہے؛ اور وہ اس طرح کہ پہلے مفردات سے بننے والے تمام مرکبات، محاورات اور فقرے وغیرہ درج لغت کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مفردات کے لحاظ سے ہی ہجائی ترتیب قائم کر کے، دوسرے مفردات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ البتہ مفردات کے ذیلی اندراجات کے سلسلے میں مکمل ہجائی ترتیب کا التزام رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے ''جگر'' اور پھر اس کے تمام مرکبات اور محاورات دیے گئے ہیں اور یہ سلسلہ ص ۶۶۰ سے ص ۶۷۲ تک جاری رہتا ہے۔ ص ۶۷۲ پر اگلا مفرد اندراج ''جگرا'' ملتا ہے۔ اس کے بعد ''جگرہ'' اور پھر ''جگری'' کا یہ طریقہ کار ''لغت کبیر اردو'] میں اختیار کردہ طریقہ کار کے لحاظ سے لغت بین کے لیے آسان ثابت ہو سکتا ہے۔'' (۵۴)

لغتِ کبیر کا جب ہم مجموعی طور پر جائزہ لیتے ہیں تو اس میں ہمیں ایک معیاری لغت کی بہترین خصوصیات جمع نظر آتی ہیں۔ چنانچہ اس لغت کی خصوصیات کو مختصراً اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ لغتِ کبیر اردو لغات میں ایک قابلِ تقلید حیثیت رکھتی ہے اس لغت میں اردو زبان و ادب کے تمام الفاظ کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں مفرد الفاظ، ان کے مرکبات، محاورات اور اصطلاحات کو شامل کیا گیا ہے۔ اردو زبان کو اس کے مزاج کے مطابق پیش کیا گیا ہے اور نہ صرف دہلی کے نواح کی مقامی پراکرت کو پیشِ نظر رکھ کر الفاظ کی تشریح و توضیح کی گئی ہے بلکہ ان دیگر زبانوں کو بھی مدِ نظر رکھا گیا ہے جنہوں نے اردو کی آبیاری کی اور ان کے الفاظ اردو زبان کا حصہ بنے۔ ہر اندراج کو مستند بنانے کے لیے ایسی اسناد اردو زبان و ادب سے پیش کی گئی ہیں جن کا اعتبار آج بھی قائم ہے۔ الفاظ کی بنیادوں تک رسائی حاصل کی گئی ہے اور اُن قدیم روپوں کو بھی درج کیا گیا ہے جو اُن کے ارتقائی مراحل میں موجود رہے۔ اگر چہ اس لغت کا اعرابی حصہ کمزور ہے لیکن جہاں تک اعراب لگائے گئے ہیں یا دیگر طریقوں سے تلفظ کا اندراج کیا گیا ہے اس میں کافی تحقیق اور جستجو سے کام لیا گیا ہے اور پھر یہ کہ لغتِ کبیر کا قواعدی پہلو کافی جاندار ہے اور مولوی عبدالحق نے الفاظ کے استعمال اور ان کی قواعدی حیثیتوں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ لفظوں کے صرف مترادفات ہی نہیں دیے گئے بلکہ ان کی تشریح اور وضاحت بھی کی گئی ہے اور ان کے اصلی معانی کے ساتھ ساتھ ان کا مجازاً استعمال تک واضح کیا گیا ہے۔ لسانی نقطہ نظر سے لغتِ کبیر کی اہمیت یہ کہ انہوں نے اردو الفاظ کا دوسری زبانوں کے الفاظ کے ساتھ رشتہ بیان کیا ہے اور پھر یہ کہ زمانے کے ساتھ ساتھ لفظ کی ہیئت اور اس کی معنوی صورتوں میں کس طرح تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اس کی بھی وضاحت کی ہے جو اس سے پہلے کی اردو لغات میں موجود نہیں۔ اس طرح

لغتِ کبیر مولوی عبدالحق کا ایک عظیم کارنامہ قرار دی جاسکتی ہے جو اگر مکمل ہو جاتی تو اردو زبان کی تفہیم کا ایک بہت بڑا ذریعہ قرار پاتی۔

مولوی عبدالحق نے لغتِ کبیر کے علاوہ بھی اردو زبان کے حوالے سے لغات مرتب کیں۔ خصوصاً انہوں نے اس سلسلہ میں انگریزی اور اردو کے تعلق پر نظر رکھی اور اس حوالے سے انگریزی اردو اور اردو انگریزی لغات کی تالیف کی۔ اس سلسلہ میں ان کی ایک اہم لغت:

"THE STANDARD ENGLISH-URDU DICTIONARY"

اپنے اندراجات کے حوالے سے کافی اہمیت رکھتی ہے جس میں انگلش الفاظ کے اردو مترادفات اور ان کے معانی درج کیے گئے ہیں۔ یہ لغت پہلی بار ۱۹۳۷ء میں چھپی۔ اس لغت کی تالیف کا مقصد اردو دان طبقے کے لیے انگریزی زبان کی تفہیم اور انگریزی زبان کی وضاحت تھا۔ اس لغت کے دیباچے میں مولوی عبدالحق نے اس سے قبل لکھی گئی انگریزی اردو کی لغات کی تاریخ مختصراً بیان کی ہے جس کا ذکر وہ لغتِ کبیر کے مقدمے میں بھی کر چکے ہیں۔ اس لغت کے مقدمے میں انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ایک انگریزی اردو لغت لکھنا انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ کسی بھی انگریزی لفظ یا محاورے کا مکمل ترجمہ اردو زبان میں ممکن نہیں۔ اسی لیے یہ کام کافی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لغت کی تالیف میں مولوی عبدالحق کے ساتھ کئی قابل لوگوں نے حصہ لیا۔ جن میں انہوں نے خاص طور پر سید وہاج الدین، مولوی محمد حسین محوی، مولوی وحید الدین سلیم، مولوی غلام یزدانی، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد خورشید اور ڈاکٹر یوسف حسین کے نام لیے ہیں۔ مولوی عبدالحق اس تمام کام کی خود نگرانی کرتے اور پروف خوانی اور نظر ثانی میں کافی احتیاط سے کام لیتے رہے۔ اس لغت کی تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کہنے کو تو یہ نظر ثانی تھی لیکن حقیقت میں از سرِ نو ترجمہ کرنا پڑا۔ شاید ہی کوئی لفظ ہوگا جو حک و اصلاح سے بچا ہو۔ بڑی احتیاط یہ کی گئی ہے کہ انگریزی لفظ کے لیے اردو لفظ، انگریزی محاورہ یا روزمرہ کے لیے اردو محاورہ روزمرہ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح بٹھائی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔ لفظ کی تشریح تو آسان ہے لیکن لفظ کے لیے ویسا ہی لفظ اور محاورے کے لیے ویسا ہی محاورہ لانا مشکل کام ہے۔ بعض اوقات ایک ایک لفظ کے لیے بیسیوں کتابوں کے ورق الٹنے پڑتے تھے، بول چال یا عامیانہ الفاظ کے لیے اردو میں بھی اسی قسم کے لفظ تلاش کرنے پڑتے تھے۔ علمی اصطلاحوں کے لیے علمی اصطلاحیں اور پیشہ

وروں کی اصطلاحوں کے لیے پیشہ وروں کی اصطلاحیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانی پڑتی تھیں۔ایسی صورتوں میں اکثر اوقات کتابیں اور لغات کام نہیں دیتی تھیں۔'' (۵۵)

مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں کہ سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی جب کسی لفظ کا مترادف اردو میں موجود نہ ہوتا تو اس وقت نئے الفاظ بنانا پڑتے۔اس طرح بہت سے جدید الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے۔اس لغت کی تیاری میں کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کے اصولوں کی پابندی کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزی کی دیگر لغات سے بھی مدد لی گئی ہے۔اس کی ترتیب انگریزی حروفِ تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے۔ ہر انگریزی لفظ کے سامنے اس کے اردو مترادفات اور معانی درج کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی اس لفظ کی قواعدی حیثیت کو بھی مخففات کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔انگریزی الفاظ کے معانی کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ تفصیل دی گئی ہے اور مختلف اصطلاحات اور محاروں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور ان کے مقابل میں اردو میں مستعمل محاورے اور اصطلاحات درج کی گئی ہیں۔اس طرح یہ ڈکشنری انگریزی اردو کی سب سے مکمل اور جامع ڈکشنری قرار پاتی ہے اور اس کی مانگ اس کی تالیف کے بعد ہر وقت موجود رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی اردو پر مولوی عبدالحق کی اس ڈکشنری کے بعد اس قدر جامع ڈکشنری پھر نہیں لکھی گئی۔

اردو زبان کی خدمات کے حوالے سے مولوی عبدالحق کا ایک اور اہم کام اردو انگریزی لغت ہے۔ یہ لغت مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد ۱۹۷۷ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔اس لغت کی تالیف بھی مولوی عبدالحق کی زیرِ نگرانی شروع ہوئی اور معاونین کی ایک جماعت کے ساتھ مولوی عبدالحق نے اس کے لیے ضروری مواد کی فراہمی کا کام شروع کیا اور اس لغت کو انہوں نے اپنی زیرِ نگرانی ایک باقاعدہ صورت دی۔لیکن افسوس کہ یہ لغت ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی اور اس کے بعد دیگر فضلاء کے ساتھ جلیل قدوائی کی
زیرِ نگرانی اس کام کی تکمیل ہوئی۔اس لغت میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ اردو الفاظ درج کیے گئے ہیں۔سب سے پہلے الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ کا اندراج ہے۔ ہر لفظ کے بعد انگریزی حروف میں اس کا تلفظ واضح کیا گیا ہے اور اس کے بعد اس لفظ کے انگریزی میں مترادفات اور مفہوم کو ظاہر کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ہر لفظ کے بعد اس لفظ کی قواعد کے لحاظ سے قسم یا اقسام کو مخففات کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔معانی کے سلسلے میں اس بات کا بھی التزام کیا گیا ہے کہ لفظ کے حقیقی معانی کے ساتھ ساتھ اس کے مجازی یا اصطلاحی معانی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔اس طرح

معانی کی مختلف نوعیتوں کو بھی واضح کیا گیا ہے اور الگ الگ نمبر دے کر مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ بنیادی الفاظ کے بعد ان کے حوالے سے ذیلی اندراجات کیے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں ان الفاظ کے مرکبات، مشتقات، محاورات، ضرب المثال وغیرہ کا اندراج کیا گیا ہے۔ اس طرح مولوی عبدالحق کی یہ لغت نہ صرف انگریزوں کی اردو سمجھنے میں معاون ہوسکتی ہے بلکہ اردو زبان کی تفہیم کے سلسلہ میں بھی اس کی اپنی اہمیت ہے۔

بحیثیتِ مجموعی مولوی عبدالحق کی لغت نگاری کڑے اصولوں کی پابند ہے انہوں نے نہ صرف لغت نگاری کے حوالے سے اصول وضوابط قائم کیے بلکہ ان کی اپنی لغات میں سختی کے ساتھ پابندی بھی کی اور پھر یہ کہ اردو زبان کی دیگر لغات کو بھی ان اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا اور ان کے معیار کا تعین کیا۔ مولوی عبدالحق اردو زبان کا فروغ اور تحفظ چاہتے تھے اور ان کی یہ لغات اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور عملی کوشش ہیں۔

حوالہ جات

(۱) قدرت نقوی، سید، مطالعہ عبدالحق، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۹۲

(۲) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اردو لغت، کراچی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۷ء، (مقدمہ)

(۳) ــــــ ایضاً ــــــ،

(۴) مولوی عبدالحق، لغتِ کبیر (جلد اول)، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲

(۵) وارث سرہندی، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد سوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۹

(۶) وارث سرہندی، کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد ہفتم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، ص ۷

(۷) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ایضاً، (مقدمہ)

(۸) مولوی عبدالحق، لغتِ کبیر (جلد اول)، ایضاً، ص ۲۷۔۲۸

(۹) شان الحق حقی، کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء ص ۴

(۱۰) وارث سرہندی، کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد دوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء ص ۱۴

(۱۱) جابر علی سید، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد اول)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء ص ۱۳

(۱۲) سید عبداللہ، ڈاکٹر (مرتبہ)، نوادر الالفاظ، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء ص ۵

(۱۳) ــــــ ایضاً ــــــ، ص ۱۷

(۱۴) مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو ۱۹۹۲ء ص ۴۳

(۱۵) جابر علی سید، کتب لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد اول)، ایضاً، ص ۱۰۹

(۱۶) امیر مینائی، امیر اللغات (اول۔دوم)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۴

(۱۷) نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء ص ۴

(۱۸) مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ایضاً، ص ۱۱۸۔۱۱۹

(۱۹) وارث سرہندی، کتب لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد ششم)،
اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء ص ۱۱

(۲۰) وارث سرہندی، کتب لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد دوم)، ایضاً، ص ۳۳۵

(۲۱) مولوی عبد الحق، لغتِ کبیر (جلد اول)، ایضاً، ص ۴۶۔۴۷

(۲۲) ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، اردو لغت (جلد اول)، ایضاً، (مقدمہ ق)

(۲۳) مولوی عبد الحق، لغتِ کبیر (جلد اول)، ایضاً، ص ۵۴۔۵۵

(۲۴) شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبد الحق حیات اور علمی خدمات، کراچی،
انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۶۴۔۶۵

(۲۵) معراج نیر، ڈاکٹر سید، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق فن اور شخصیت،
لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۹۸

(۲۶) ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخِ انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی،
انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۵۳

(۲۷) مولوی عبد الحق، مکاتیبِ عبد الحق (مرتبہ جلیل قدوائی)،
، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء، ص ۴۸۳

(۲۸) ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخِ انجمن ترقیِ اردو، ایضاً، ص ۵۴۔۵۵

(۲۹) مولوی عبد الحق، مکاتیبِ عبد الحق (مرتبہ جلیل قدوائی)، ، ایضاً، ص ۲۴۶

(۳۰) جمیل الدین عالی، لغت کبیر (جلد اول)، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۳ء ص ۴

(۳۱) شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبد الحق حیات اور علمی خدمات، ، ایضاً، ص ۷۷

(۳۲) قدرت نقوی، سید، مطالعہ عبد الحق، ایضاً، ص ۹۲

(۳۳) قائم رضا نسیم امروہوی، سید، نسیم اللغات، لاہور، شیخ غلام علی سنز، ۱۹۹۶ء، ص ۹

(۳۴) ترقی اردو بورڈ (مرتبہ)، اردو لغت (جلد اول)، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ا،

(۳۵) ترقی اردو بورڈ (مرتبہ)، اردو لغت (جلد دوم)، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ا،

(۳۶) نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول)، ایضاً، ص ۱۷،

(۳۷) ـــــ ایضاً ـــــ، ص ۱۸

(۳۸) قدرت نقوی سید، مطالعہ عبد الحق، ایضاً، ص ۹۱ ـ ۹۲

(۳۹) مسعود ہاشمی، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ایضاً، ص ۱۸۱ ـ ۱۸۲

(۴۰) احمد دہلوی، مولوی سید، فرہنگِ آصفیہ (جلد اول)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۵ء، ص ۷۵

(۴۱) نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول)، ایضاً، ص ۱۸

(۴۲) مولوی عبد الحق، لغتِ کبیر (جلد اول)، ایضاً،

(۴۳) نسیم امروہوی، اردو لغت (جلد اول)، ایضاً، ص اج ـ اد

(۴۴) مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت کا تنقیدی جائزہ، ایضاً، ص ۱۸۳

(۴۵) مولوی عبد الحق، لغتِ کبیر (جلد اول، حصہ دوم)، کراچی،
انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۳ء، ص ۵۸۵ ـ ۵۸۹ ـ

(۴۶) ترقی اردو بورڈ (مرتبہ)، اردو لغت (جلد دوم)، ایضاً، ص ۳۳۲ ـ ۳۳۶

(۴۷) امیر مینائی، امیر اللغات (اول ـ دوم)، ایضاً، ص ۱۸۹ ـ ۱۹۲ ـ

(۴۸) عبد المجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد اول)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء، ص ۴۷

(۴۹) فرہنگِ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، جلد اول، ص ۲۴۹ ـ ۲۵۱

(۵۰) نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول)، ایضاً، ص ۱۲۸ ـ ۱۳۰

(۵۱) مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ایضاً، ص ۱۹۰ ـ ۱۹۱

(۵۲) ترقی اردو بورڈ (مرتبہ)، اردو لغت (جلد دوم)، ایضاً، ص ا ـ ۸

(۵۳) مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ایضاً، ص ۱۸۸

(۵۴) ـــــ ایضاً ـــــ، ص ۱۷۸

(۵۵) مولوی عبدالحق، دی اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی،
انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص۱۴

اردولسانیات میں مولوی عبدالحق کا مقام و مرتبہ

اردو لسانیات میں مولوی عبدالحق کا مقام و مرتبہ

مولوی عبدالحق اردو زبان و ادب کی ترقی کے ہمیشہ خواہاں رہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں بھرپور عملی اقدامات کیے اور اپنی تمام زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کیے رکھی۔ اُن کو علی گڑھ کی تعلیمی فضا میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کا موقع ملا۔ لیکن انہوں نے یہاں سے جو اصل تربیت حاصل کی وہ سرسید احمد خان کے زیرِ سایہ ہوئی۔ سرسید احمد خان کی خدمات اردو زبان و ادب کے لیے غیر معروف نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے لیے محبت کا جذبہ مولوی عبدالحق کے دل میں بھی پیدا کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے تعلیمی زمانہ سے ہی اردو کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اسی دور سے انہوں نے ادبی مضامین لکھنے شروع کیے اور ان کا تحریر و تقریر کا سلسلہ جاری ہوا۔ جب تعلیم کے حصول سے فراغت ہوئی تو تدریس کی ذمہ داری اُن کے سپرد ہوئی۔ اس طرح انہیں اردو کے فروغ کی کوششوں کے لیے ایک وسیع میدان میسر آ گیا۔ ساتھ ہی جب انہوں نے انجمن ترقی اردو کی ذمہ داری ملی تو انہوں نے اردو زبان کے فروغ و تحفظ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ چنانچہ محکمہ تعلیم ہو یا ادبی حلقے، سیاسی میدان ہو یا حکومتی اربابِ اختیار کی پالیسیاں ہر شعبے میں ان کے پیشِ نظر جو ترجیح رہی وہ اردو زبان کو ایک معتبر مقام دلانا اور اس کو مضبوط تر کرنا تھا۔ انہوں نے اردو زبان کے لیے ہر میدان میں جہاد کیا اور یہ پیغام ہر ایک تک پہنچایا کہ اردو زبان ہی برصغیر کے ہر طبقے کے اتحاد کی علامت ہے۔ اور اس کی بقا میں سب کی بقا ہے۔

مولوی عبدالحق نے جہاں اردو زبان کے فروغ و تحفظ کے لیے ملک کے طول و عرض کے دورے کیے۔ انجمن ترقی اردو کی مختلف شاخیں قائم کیں۔ اردو زبان کے لیے مختلف لوگوں کی خدمات حاصل کیں اور ہر طبقے سے اردو زبان کے جانثار تیار کیے۔ وہاں پر انہوں نے اردو کے فروغ کے لیے اپنی تحریری کاوشوں کے بھی بے مثال نقش چھوڑے۔ مولوی عبدالحق ایک بہترین مقرر اور خطیب تھے۔ انہوں نے مختلف تقریبات اور کانفرنسوں میں اپنے یادگار خطبات پیش کیے۔ یہ خطبات نہ صرف اپنے اندر خطبہ نگاری کی بہترین خصوصیات رکھتے ہیں بلکہ اردو لسانیات میں بھی ان خطبات کی بے حد اہمیت ہے۔ یہ خطبات زیادہ تر تعلیمی اداروں کی مختلف تقریبات میں پیش کیے گئے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے طلبہ کو اردو زبان کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور اس کے

مفاہیم کی مختلف جہتوں سے متعارف کرایا۔ پھر یہ کہ انہوں نے اپنے خطبات میں اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء کی مکمل تاریخ بیان کردی ہے۔ان کے تقریباً ہر خطبے میں اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء پر بحث ملتی ہے اور ہر دفعہ اس حوالے سے نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔اس طرح مولوی عبدالحق کے خطبات اردو زبان کو اس کے تاریخی پس منظر میں سمجھنے میں بہترین معاون ثابت ہوتے ہیں۔دراصل وہ اپنے خطبات میں اردو زبان کی تاریخ بیان کر کے یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ یہ کسی ایک قوم کی محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ نہیں بلکہ ہندو، مسلمان اور برصغیر کی دیگر اقوام نے مل کر اس زبان کی آبیاری کی ہے۔چنانچہ یہ ان سب کی ساختہ و پرداختہ زبان ہے اس لیے اس کے فروغ اور تحفظ کے لیے سب اقوام اور مذاہب کے لوگوں کو مل کر کوشش کرنی چاہیے۔اس کے ساتھ ہی یہ مختلف اقوام اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے اتحاد کا ذریعہ اور رابطے کا وسیلہ ثابت ہوسکتی ہے۔چنانچہ ان کے ان خطبات کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ اس میں انہوں نے اردو زبان سے دلچسپی کی فضاء قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ان خطبات کا زیادہ تر موضوع زبان اور لسانیات ہی ہے اور ان خطبات میں انہوں نے اردو زبان کی تاریخ اور ارتقاء کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کی کیفیت اور پھر یہ کہ دیگر عظیم زبانوں کے مقابل اس کی اہمیت اور منفرد خصوصیات اور اس طرح کے اردو زبان کے لسانی پہلوؤں سے متعلق بے شمار مسائل پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ان خطبات میں مولوی عبدالحق نے ایک مقرر کی جذباتیت سے کام نہیں لیا بلکہ وہ ایک پختہ سوچ رکھنے والے مفکر اور ایک تحقیقی نگاہ رکھنے والے محقق کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کے خطبات میں اردو زبان کے حوالے سے تمام مباحث کی بنیادیں عقل وشعور پر استوار نظر آتی ہیں اور اپنے لسانی افکار و نظریات کو وہ ٹھوس دلائل اور اسناد سے مستحکم کرتے ہیں اور ان کے اندر ایک منطقی انداز نظر آتا ہے۔ان کے ہر خیال اور رائے میں وزن ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات نہ صرف اس وقت کے حاضرین کے دلوں میں اتر جاتے بلکہ آج بھی وہ اپنی اہمیت قائم رکھے ہوئے ہیں۔اور ان کی لسانی خدمات میں بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔خطباتِ عبدالحق کی لسانی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

> ''خالص ادبی اور لسانی نقطہ نظر سے یہ خطبات مولوی صاحب کے مقدمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ان کے خطاب یہ لب ولہجہ میں جو حلاوت، اثر اور دلکشی ہے وہ ان کی دوسری تحریروں میں مشکل سے ملے گی۔مولوی صاحب کو ایک صاحبِ طرز نثر نگار بنانے میں ان کے مقدمات، قواعد اور لغت کو کم خطبات کو زیادہ دخل ہے۔ان خطبوں میں ایسی سادگی، سلاست

صفائی، روانی، صداقت اور اثر انگیزی پائی جاتی ہے جو کسی دوسرے کے خطبوں میں نظر نہیں آتی۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے قطع نظر ان کے سے موضوعات کی ادبی اہمیت بھی مسلم ہے۔ ان میں تحقیق و تنقید اور اسلوب کے اہم مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ زبان کی ساخت و پیدائش، سوسائٹی اور زبان کے تعلق، زبان و معاشرے کی ہم آہنگی، قومی عروج و زوال کی تاریخ میں زبان کی حیثیت، زبان اور ہمارا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ، زبان اور قومی کردار اور اسی قسم کے بڑے مفید اور اہم موضوعات پر مولوی صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ زبان کے متعلق عموماً اور اردو زبان کے متعلق خصوصاً ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ اردو کی پیدائش اس کے ارتقاء اسکے ماخذ و مبداء اس کے اصول و قواعد، اس کے عروج و زوال کے اسباب اس کے مزاج کی ساخت اور خصوصیات سے کما حقہ و واقفیت کے لیے خطبات عبدالحق کا مطالعہ ضروری ہے۔ بعض اہل قلم نے مذکورہ مسائل پر پوری پوری کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے اپنے خطبات میں ان اہم مسائل پر جس اختصار و جامعیت کے ساتھ گفتگو کی ہے وہ مولوی صاحب کی قادر الکلامی، ان کی وسیع النظری اور تبحرِ علمی پر دلالت کرتی ہے۔''(۱)

مولوی عبدالحق کا ایک اور لسانی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم اردو کے ایک وسیع ذخیرے کا کھوج لگایا اور اردو کی قدیم تصانیف کو منظرِ عام پر لے آئے۔ اس حوالے سے ان کی دکنی ادب پر خدمات انتہائی قابلِ قدر ہیں۔ انہوں نے بے شمار قدیم دکنی کتابوں کو دریافت کر کے اپنے بیش قیمت مقدمات کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح ایک تو اردو زبان کی تاریخ کو بہت پیچھے تک لے گئے اور دوسرا یہ کہ انہوں نے اردو زبان پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بنیاد فراہم کر دی اور انہیں ایک قدیم ادب کی صورت میں ایک ایسا بے مثال تحفہ دیا جس پر اردو لسانیات پر تحقیق کرنے والے اکثر محققین نے اپنی تحقیق کی عمارتیں کھڑی کیں۔ ان قدیم کتابوں سے نہ صرف اردو ادب کی ارتقائی منازل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ان کے ذریعے اردو زبان کی ابتداء اور اس کی ارتقاء کو بھی با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے نہ صرف ان کتابوں کو دریافت کیا بلکہ اُن کا لسانیاتی جائزہ بھی پیش کیا جس کے ذریعے ان کی اردو لسانیات کے حوالے سے خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کتب پر مولوی عبدالحق کے مقدمات اپنے اندر ایک تحقیقی اور تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمات میں اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مولوی عبدالحق نے جن کتابوں پر مقدمات لکھے ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور وہ

زبان وادب کے تقریباً ہر شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اگر چہ ان کے اکثر مقدمات میں لسانی افکار موجود ہیں لیکن اس حوالہ سے ان کے وہ مقدمات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو ایسی کتابوں پر لکھے گئے جن کی اردو لسانیات میں قدر و قیمت مسلمہ ہے۔چنانچہ اس حوالے سے ان کے 'دریائے لطافت'، قواعدِ اردو، لغتِ کبیر، فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں، اسٹنڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری، سب رس، کتب مشتری وغیرہ پر لکھے گئے مقدمات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔انہوں نے ان مقدمات میں اردو قواعد نویسی، اردو الفاظ کے مزاج اور ان کے اندر مفاہیم کی مختلف جہتوں، اردو زبان کے اصول وضوابط، اردو زبان کی نشو و نما، اردو زبان کے فروغ میں مختلف شعراء اور مصنفین کی خدمات، اردو زبان پر مختلف معاشروں اور تہذیبوں کے اثرات، اردو زبان کے نفسیاتی پہلوؤں اور اس کے مستقبل کے امکانات پر سیر حاصل بحث کی۔ان مقدمات میں مولوی عبدالحق نے اس قدیم پس منظر کو بہت ہی خوبی، مہارت اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ واضح کیا ہے جو اردو کی ساخت و برداخت میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اس حوالے سے انہوں نے صوفیائے کرام کی خدمات اور ان کی اردو زبان کو رواج دینے میں اہمیت کو خاص طور پر اپنے مقدمات میں موضوعِ بحث بنایا ہے۔اسی طرح مسلمانوں کی برصغیر میں آمد اور یہاں کی اقوام کی قدیم تاریخ کو بھی اپنے مقدمات میں تحریر کیا ہے۔پھر یہ کہ قدیم تہذیب وثقافت، رہن سہن، رسم ورواج اور لوگوں کے عادات واطوار کو پیش کر کے انہوں نے اس فضاء اور ماحول کی تصویر کشی کی ہے جو ایک اردو زبان کے لیے بنیادیں فراہم کر رہا تھا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی مقدماتِ عبدالحق میں لسانی مباحث کو جس دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بابائے اردو کو اس زبان سے محبت تھی، اور ان کی یہ محبت عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی چنانچہ ان کے مقدمات میں جگہ جگہ اردو زبان سے والہانہ وابستگی کا اظہار نظر آتا ہے اسی لیے ان کی تحقیق محض تحقیق نہیں رہ جاتی، بلکہ اس میں زبان کی یہ محبت رس پیدا کر دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ لسانی تحقیق کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور خشک سے خشک موضوع کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ دلوں میں جگہ بنالیتا ہے۔'' (۲)

مولوی عبدالحق کے لسانی افکار ان کے مکتوبات میں بھی بکھرے پڑے ہیں۔خطوط انہوں نے مختلف علمی وادبی شخصیات کو لکھے جو ان کے ساتھ اردو کی ترویج وترقی میں معاون رہیں۔چنانچہ ان کے ساتھ علمی اور لسانی مسائل پر خطوط میں تبادلہِ خیال رہتا۔مولوی عبدالحق ان سے مختلف امور میں مشورے طلب کرتے اور ان کو اپنی آراء سے آگاہ کرتے۔ان خطوط میں لغت کی تالیف، قواعد کے مسائل، اردو ٹائپ اور رسم الخط کے مسائل، مختلف مخطوطوں

کی تدوین میں تصحیح، اردو کے فروغ وتحفظ کے لیے مختلف تحریکوں اور تنظیموں کی کارکردگی وغیرہ کے حوالے سے کافی بحثیں ملتی ہیں۔ان کے یہ خطوط اردو لسانیات کے حوالے سے ان کی عملی کوششوں سے آگاہی میں کافی معاونت کرتے ہیں۔جلیل قدوائی مولوی عبدالحق کے خطوط کی لسانی وتحقیقی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ تمام داستان آپ کو ان خطوط میں لکھی ہوئی نظر آئے گی۔اسی کے ساتھ بابائے اردو کی بعض بیش قیمت ذاتی علمی وتحقیقی کوششوں کے بارے میں جن کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ کم وبیش ڈھائی تین سو برس پیچھے جا پڑی ہے۔نیز انجمن ترقی اردو کے مطبوعاتی اور اشاعتی پروگرام، موصوف کی مرتب کردہ اردو لغت، انگریزی اردو ڈکشنری، درسی کتب، اصطلاحاتِ علمیہ، اردو ٹائپ وغیرہ جیسے اہم کاموں کے متعلق معلومات ملیں گی۔'' (۳)

مولوی عبدالحق نے اردو اصطلاحات کے حوالے سے بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔اس حوالے سے انہوں نے اپنے خطبات، مقدمات، مکتوبات، لغات، قواعد کی کتابوں، تبصروں وغیرہ میں کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی اور اردو اصطلاحات وضع کرنے کے لیے اصول وضوابط تجویز کیے۔اردو زبان میں پہلے سے رائج اصطلاحات کو تنقیدی زاویہ نگاہ سے دیکھا۔اُن میں ترمیم واضافے تجویز کیے اور دیگر زبانوں سے اردو کے لیے اصطلاحات وضع کرنے میں مدد کے حصول کی طرف بھی توجہ دی۔اس حوالے سے ان کی کتاب 'اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ' کافی اہمیت کی حامل ہے۔اس میں وہ اردو اصطلاحات کے سلسلے میں مختلف اوقات میں وضع کیے جانے والے اصول وضوابط کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنی طرف سے اردو اصطلاحات بنانے کے لیے معیاری اصول وضوابط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کے مطابق اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں زمانہ دراز سے علمی اصطلاحات پر غور وفکر کیا گیا اور مختلف اوقات میں اس کے اصول وضع کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔خصوصاً دہلی کالج کی اس سلسلہ میں خدمات گراں قدر ہیں۔چنانچہ انہوں نے ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جو دہلی کالج میں وضعِ اصطلاحات کے لیے تجویز کیے گئے۔اس کالج کے ان اصولوں پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ اصول اس زمانے کے اعتبار سے بہت مناسب اور معقول تھے۔جب جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی تو وہاں پر دارالترجمہ کے لیے مولوی عبدالحق کو ناظم مقرر کیا گیا۔چنانچہ مولوی عبدالحق کی زیرِ نگرانی دیگر زبانوں کی اہم کتب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور اس طرح اردو زبان و ادب کے علمی و ادبی ذخیرے میں قیمتی اضافہ کیا گیا۔اس وقت مختلف علوم کی کتابوں کے ترجمے کے لیے مختلف اصطلاحوں کی ضرورت پڑی۔چنانچہ یہاں پر اصطلاحات سازی کے لیے اصول وضع کیے گئے اور مولوی عبدالحق کی

زیرِ نگرانی ان اصولوں کے ذریعے اصطلاحات پر کام کیا گیا۔ مولوی عبدالحق نے نہ صرف خود اردو اصطلاحات سازی پر کام کیا بلکہ انہوں نے دیگر علمی و ادبی شخصیات کو بھی اس طرف مائل کیا اور اس طرح اردو لسانیات کے اس اہم شعبے کو ایک تحریک کی شکل دی۔ مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اردو کا ایک موثر پلیٹ فارم میسر تھا جس کے ذریعے وہ اپنے کسی بھی منصوبے کو ایک تحریک کی صورت میں آگے بڑھانے میں بھرپور مدد حاصل کرتے تھے اور اس طرح وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کی صورت میں اردو لسانیات پر ہمہ گیر اثرات چھوڑتے تھے۔ وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں بھی انجمن ترقی اردو کی خدمات انتہائی قابلِ قدر ہیں۔ نہ صرف انجمن نے مولوی عبدالحق کی زیرِ سرپرستی وضع اصطلاحات کی ذمہ داری بخوبی نبھائی بلکہ اس سلسلہ میں کافی گراں قدر تصانیف شائع بھی کی گئیں۔ مولوی عبدالحق اردو زبان کے مزاج سے بخوبی آشنا تھے اور وہ اردو زبان میں نئے الفاظ و اصطلاحات کی شمولیت کی رمزوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انہیں اس بات کا ادراک حاصل تھا کہ اردو زبان میں کس قسم کے الفاظ آسانی سے سموئے جاسکتے ہیں۔ کون سی زبانوں سے اس زبان کی مزید آبیاری کی جاسکتی ہے۔ کون سے الفاظ میں تغیر وتبدل سے جدید علمی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح مولوی عبدالحق اردو اصطلاحات سازی کے حوالے سے خدمات اپنے اندر ایک منفرد انداز رکھتی ہیں اور ان کے مقرر کردہ رہنما اصولوں کو سامنے رکھ کر بعد میں بھی اردو اصطلاحات سازی کا عمل جاری نظر آتا ہے۔ شہاب الدین ثاقب مولوی عبدالحق کی اردو اصطلاحات سازی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اردو میں علمی اصطلاحات کے مسئلہ پر مولوی صاحب نے خصوصی توجہ دی۔ تاکہ یہ زبان تمام علوم وفنون کے اظہار کا وسیلہ بن سکے اور اس میں دوسری زبانوں کے علمی تراجم کے لیے آسانیاں پیدا ہوں۔ دارالترجمہ کے ناظم اول کی حیثیت سے انہوں نے اصطلاحات سازی کے کام کو آگے بڑھایا اور فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ مرتب کرائی۔'' (۴)

اس طرح جب ہم مولوی عبدالحق کے اردو میں لسانی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اردو لسانیات میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سے پہلے کی اردو لسانیات کے بکھرے ہوئے ذخیرے کو ایک لڑی میں پرویا اور اس کو ایک باقاعدہ شکل دے کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور پھر آئندہ کے لیے اردو لسانیات کو ایک منظم اور باقاعدہ صورت دی۔ مولوی عبدالحق کے بعد ماہرینِ لسانیات کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان کے لسانی افکار سے صرفِ نظر کرسکیں۔

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کے آغاز وارتقاء کے مسئلہ کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ان

کے نظریات کے ذریعے اردو زبان کے بارے میں پہلے سے موجود نظریات کی الجھنیں اور پیچیدگیاں دور ہوئی ہیں اور آئندہ کے لیے اردو زبان کی بنیادوں کا کھوج لگانے والوں کے لیے ایک بہترین راہ متعین ہوئی ہے۔ اگر چہ مولوی عبدالحق کے اس حوالے سے نظریات کو بھی کافی بحث طلب سمجھا جاتا ہے لیکن اکثر ماہرینِ لسانیات اپنے نظریات میں کسی نہ کسی طور مولوی عبدالحق کے تحقیقی نتائج کو ضرور دہراتے ہیں۔

اسی طرح اردو زبان کے الفاظ کی اصل اور ان کی بنیادوں کے کھوج لگانے میں بھی مولوی عبدالحق کے تحقیقی نتائج ماہرینِ لسانیات کے لیے مشعلِ راہ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو کھنگالا اور ان کی تفہیم کو ممکن بنایا۔ اردو لغت نویسی کے حوالے سے مولوی عبدالحق انتہائی معتبر حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے اردو لغات کا ایک قابلِ ذکر ذخیرہ موجود تھا جس کو انہوں تحقیقی وتنقیدی نظر سے دیکھا اور ان لغات کی درجہ بندی کی۔ اس حوالے سے ان کے اردو لغت نویسی کی تاریخ مرتب کرنے میں خدمات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اردو لغت کی تاریخ پر ان کے بعد اس قدر جامع اور مستند کام نہیں ہوا۔ انہوں نے نہ صرف گزشتہ لغات کو پرکھا بلکہ آئندہ اردو لغت نویسی کے لیے بھی رہنما اصول متعین کیے اور پھر ان اصولوں کی عملی مثال کے لیے لغتِ کبیر کی تالیف کی۔ اگر چہ یہ لغت نامکمل رہ گئی لیکن آئندہ لغت نویسی کے لیے یہ ایک بہترین مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر یہ کہ ان کی زیرِ نگرانی اردو لغت بورڈ کے تحت اردو لغت مرتب کرنے کا کام بھی شروع ہوا۔ جس کے لیے مولوی عبدالحق نے الفاظ کا ایک گران قدر ذخیرہ فراہم کیا اور اس اردو لغت کے عظیم منصوبے کے لیے مولوی عبدالحق کے متعین کردہ اصول وضوابط کو بنیاد بنایا گیا اور انہی کی زیرِ نگرانی ان کو مزید سائنسی بنیادوں پر استوار کر کے اردو لغت کی تالیف کا آغاز کیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد اردو لغت نویسی کے حوالے سے آج تک جو بھی کام ہوا ہے وہ مولوی عبدالحق کی لغت نویسی کے اثرات لیے ہوئے ہے۔

اردو لغت نویسی کے علاوہ انہوں نے اردو قواعد نگاری کی تاریخ اور تالیف میں بھی اہم خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے اپنے سے پہلے کی اردو قواعد کا مکمل جائزہ لیا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح کیا اور پھر اردو قواعد نگاری کے لیے اردو زبان کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ایک راہ متعین کی۔ اگر چہ بعد میں مولوی عبدالحق کی قواعد نگاری سے بھی اختلاف کیا جاتا رہا لیکن کوئی اردو قواعد لکھنے والا اُس سے پہلو تہی نہ کر سکا اور بعد میں لکھی جانے والی اکثر قواعد کی کتابوں پر مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔

چنانچہ اردو کے آغاز وارتقاء کی تاریخ، اردو کے قواعد وضوابط کی تالیف، اردو لغت نویسی، اردو

اصطلاحات سازی، اردو ترجمہ نگاری، اردو کے معیاری اسلوب کا تعین یا اردو زبان کے مزاج کا بیان الغرض اردو لسانیات کا کوئی بھی شعبہ ہو مولوی عبدالحق نے اس پر ضرور قلم اٹھایا۔ اپنے سے پہلے کے زبان وادب کو پرکھا اور آئندہ کے لیے ایک بے مثال نمونہ چھوڑ گئے۔

حوالہ جات

(۱) فرمان فتحپوری، پروفیسر، بابائے اردو مولوی عبدالحق (مرتبہ لطیف اعظمی)، لکھنوء، ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء، ۲۱۳۔۲۱۴

(۲) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مقدماتِ عبدالحق، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۴ء، (مقدمہ مرتب)

(۳) جلیل قدوائی، مکتوباتِ عبدالحق (مرتبہ جلیل قدوائی)، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔۲۴

(۴) شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی خدمات، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۹۴۔۹۵

کتابیات

کتابیات

آلِ احمد سرور (مرتبہ)، خطوطِ عبدالحق بنام آلِ احمد سرور، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۸ء

آمنہ صدیقی (مرتبہ)، افکارِ عبدالحق، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۲ء

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ صرف)، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، اردو اصطلاحات سازی (کتابیات)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، کتابیاتِ اردو املا اور دوسرے مسائل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، کتابیاتِ قواعدِ اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر، کتابیاتِ لغاتِ اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

ابوسلمان شاہجہانپوری (مرتبہ)، ہندسوں کی ایجاد اوران کا ارتقا، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء

اثر لکھنوی، کتبِ لُغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد چہارم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

اثر لکھنوی، کتبِ لُغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد پنجم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

احسان دانش، تذکیر وتانیث، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۰ء

اسلم فرخی، ڈاکٹر، بابائے اردو مولوی عبدالحق (بچوں کے لیے)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۳ء

اعجاز راہی (مرتبہ)، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء
اعجاز راہی (مرتبہ)، املا ورموزِ اوقاف کے مسائل (رودادِ سیمینار)، عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۵ء
المنجد (عربی، اردو)، کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۹۴ء
الٰہی بخش اختر اعوان، ڈاکٹر، کشافِ اصطلاحاتِ لسانیات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء
امیر مینائی، امیر اللغات، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
انشا اللہ خاں انشا، دریائے لطافت، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء
انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، بیرونی ممالک میں اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، س ن زبان، ۱۹۹۷ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۹۸ء
ایوب صابر، پروفیسر، اردو کی ابتدا کے بارے میں محققین کے نظریات، ایبٹ آباد، سرحد اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء
برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، لاہور، مکتبہ معین الادب اردو بازار، ۱۹۵۰ء
بشیر احمد قریشی ہاپوڑی، بابائے اُردو کی کہانی ان کے معتمد کی زبانی، کراچی، لیاقت آباد، ۱۹۸۳ء
بشیر احمد، میاں، اردو پاکستان کی قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء
پریشان خٹک، پروفیسر (مرتبہ)، لسانی رابطہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
تاج سعید، پشتو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء
تصدق حسین رضوی، مولوی سید، لغاتِ کشوری (اردو)، کراچی، دارالاشاعت، س ن
جابر علی سید، کتبِ لُغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد اول)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء
جابر علی سید، لسانی وعروضی مقالات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء
جلیل قدوائی (مرتبہ)، مکاتیبِ عبدالحق، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء
جلیل قدوائی (مرتبہ)، مکتوباتِ عبدالحق، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۳ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اول)، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم)، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۴ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۸ء

جمیل نقوی، اردو نثر کا ارتقا، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۶ء

جیلانی کامران، انگریزی زبان و ادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

حامد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ترجے کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

حید رسندھی، پروفیسر ڈاکٹر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۹ء

خلیق انجم (مرتبہ)، مولوی عبدالحق _ ادبی و لسانی خدمات (جلد اول)، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۲ء

خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا، کوئٹہ، قلات پبلشرز، ۱۹۷۷ء

خلیل صدیقی، لسانی مباحث، کوئٹہ، زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

خیال بخاری، سید، ہمارے لسانی مسائل، لاہور، بساطِ ادب، ۱۹۹۵ء

رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، لاہور، علمی کتاب خانہ، ۱۹۸۸ء

رشید حسن خان، اردو کیسے لکھیں؟ (صحیح املا)، لاہور، رابعہ بک ہاوس، س ن

رشید حسن خان، زبان اور قواعد، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء

رفیق خاور (مرتبہ)، اردو تھیسارس، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء

ڈیوڈ کرسٹل (ترجمہ: ڈاکٹر نصیر احمد خان)، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۷ء

ذوالفقار احمد تابش، اعجاز اللغات، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

سراج الدین علی خان آرزو، نوادر الالفاظ، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء

سرسید احمد خان، قواعدِ صرف و نحو زبانِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو اور دکنی کا تقابلی مطالعہ، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۸۹ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی زبان، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، لاہور، مکتبہ عالیہ، س ن
سہیل بخاری، ڈاکٹر، تشریح لسانیات، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۸ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر، سب رس پر ایک نظر، سرگودھا، آزاد بک ڈپو، ۱۹۸۶ء
سہیل بخاری (مرتبہ)، لسانی مقالات (حصہ سوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر، معنویات، سرگودھا، آزاد بک ڈپو، ۱۹۸۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کیا ہے؟، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء
سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر، اردو ہندی کے جدید مشترک اوزان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء
سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ (جلد اول، دوم)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۵ء
سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ (جلد سوم، چہارم)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۵ء
سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء
سید عبداللہ، ڈاکٹر سید، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۷ء
شان الحق حقی (مرتبہ)، فرہنگِ تلفظ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء
شان الحق حقی، لسانی مسائل و لطائف، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء
شاہ حسین حقیقت، خزینۃ الامثال، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقا، ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۷ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، کراچی، مکتبہ تخلیقِ ادب، ۱۹۶۶ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر، داستانِ زبانِ اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر، لسانی مسائل، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء

شوکت علی شاہ، سید (مرتبہ)، اردو زبان _ مسائل اور امکانات، ملتان، مجلسِ زبانِ دفتری، ۱۹۹۲ء
شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو ہند کی علمی و ادبی خدمات، ۱۹۹۰ء
شہاب الدین ثاقب، بابائے اردو مولوی عبدالحق _ حیات اور علمی خدمات، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء
شیما مجید (مرتبہ)، اردو رسم الخط، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء
صدیق شبلی، ڈاکٹر، ڈاکٹر محمد ریاض، فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء
طارق رحمان، ڈاکٹر، پاکستان میں انگریزی اردو تنازع کی تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء
طاہر فاروقی، پروفیسر، ہماری زبان _ مباحث و مسائل، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء
عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۶ء
عابد علی عابد، سید، البدیع، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۵ء
عابد علی عابد، سید، البیان، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۹ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتبہ)، خطباتِ عبدالحق، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۲ء
عبادت بریلوی (مرتبہ)، مقدماتِ عبدالحق، لاہور، اردو مرکز، س ن
عبدالحمید سندھی، ڈاکٹر میمن، لسانیاتِ پاکستان، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء
عبدالرحمٰن براہوئی، ڈاکٹر، انگریزی پر اردو کا اثر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء
عبدالسلام، ڈاکٹر، عمومی لسانیات _ ایک تعارف، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء
عبدالقوی دسنوی (مرتبہ)، مکاتیبِ عبدالحق بنام محوی، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۰ء
عبداللطیف اعظمی (مرتبہ)، بابائے اردو مولوی عبدالحق، امین آباد لکھنو، ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء
عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد اول)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء
عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد دوم)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، س ن
عصمت جاوید، نئی اردو قواعد، لاہور، ٹریڈ سنٹر، ۱۹۸۸ء
عطش درانی، اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

عطش درانی (مرتبہ)، پاکستانی اردو کے خدوخال، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء

عین الحق فریدکوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور، اورینٹ ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۸ء

غلام حسنین قدر بلگرامی، قواعد العروض، لاہور، مقبول اکیڈمی، س ن

غلام عباس ماہو، لسانیات، لاہور، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، ۱۹۹۸ء

غلام مصطفٰے، ڈاکٹر، جامع القواعد (حصہ نحو)، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء

غوث بخش صابر، بلوچ زبان وادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء

فتح محمد خان، مولوی، مصباح القواعد (اول)، علی گڑھ، پی سی دوارش شرینی اینڈ کمپنی، ۱۹۳۸ء

فتح محمد خان، مولوی، مصباح القواعد (دوم)، رام پور، اشاعت خانہ، ۱۹۴۵ء

فخرالحق نوری، منتخب ادبی اصطلاحیں، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو املا و قواعد (مسائل ومباحث)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء

فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات (اردو)، لاہور، فیروز سنز، س ن

قائم رضا نسیم امروہوی، سید / سید مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، نسیم اللغات (اردو)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء

قدرت نقوی، سید (مرتبہ)، لسانی مقالات (حصہ اول)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

قدرت نقوی، سید (مرتبہ)، لسانی مقالات (حصہ دوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

قدرت نقوی، سید، مطالعہ عبدالحق، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء

گوہر نوشاہی، ڈاکٹر (مرتبہ)، اردو املا و رموزِ اوقاف (منتخب مقالات)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

محمد تراب علی خان باز (مرتبہ)، تنقیداتِ عبدالحق، حیدرآباد (دکن)، س ن

مولوی عبدالحق، اُردو انگریزی لغت، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

مولوی عبدالحق، اردو بحیثیتِ ذریعہ تعلیم سائنس، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۱ء

مولوی عبدالحق، اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۹ء

مولوی عبدالحق، اردو صرف ونحو، اورنگ آباد (دکن)، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۴ء

مولوی عبدالحق ، اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام ؟ ، کراچی ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۹۳ء
مولوی عبدالحق ، اردو یونیورسٹی ، وقت کا اہم تقاضا ، کراچی ، اردو یونیورسٹی ، س ن
مولوی عبدالحق ، ادبی تبصرے ، لکھنو ، دانش محل ، ۱۹۴۷ء
مولوی عبدالحق ، افکارِ حالی ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۷۶ء
مولوی عبدالحق ، انتخابِ کلامِ میر ، لاہور ، لاہور اکیڈمی ، س ن
مولوی عبدالحق ، انجمن ترقی اردو کا المیہ ، س ن
مولوی عبدالحق (مرتبہ) ، باغ و بہار ، دہلی ، انجمن ترقی اردو ہند ، ۱۹۴۴ء
مولوی عبدالحق ، چند ہم عصر ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۹۷ء
مولوی عبدالحق ، پاکستان کی قومی وسرکاری زبان کا مسئلہ ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۵۲ء
مولوی عبدالحق ، پاکستان میں اردو کا المیہ ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، س ن
مولوی عبدالحق ، پانی کی دنیا ، لاہور ، لاہور اکیڈمی ، ۱۹۵۸ء
مولوی عبدالحق ، چند تنقیداتِ عبدالحق ، دہلی ، انجمن ترقی اردو ہند ، ۱۹۳۹ء
مولوی عبدالحق ، رقعاتِ اردو (حصہ اول) ، س ن
مولوی عبدالحق ، دی اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۸۵ء
مولوی عبدالحق ، سر آغا خان کی اردو نوازی ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۵۱ء
مولوی عبدالحق ، سرسید احمد خان _ حالات وافکار ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۹۸ء
مولوی عبدالحق (مرتبہ) ، قطب مشتری ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۵۳ء
مولوی عبدالحق ، قواعدِ اردو ، اورنگ آباد دکن ، انجمن اردو پریس ، ۱۹۲۶ء
مولوی عبدالحق ، قواعدِ اردو ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۸۵۱ء
مولوی عبدالحق ، قواعدِ اردو ، لاہور ، لاہور اکیڈمی ، ۱۹۵۸ء
مولوی عبدالحق ، لغتِ کبیر (جلد اول) ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۷۳ء
مولوی عبدالحق ، لُغتِ کبیر اُردو (جلد اول ، حصہ دوم) ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۷۵ء
مولوی عبدالحق ، لُغتِ کبیر اُردو (جلد دوم ، حصہ اول) ، کراچی ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۷۷ء

مولوی عبدالحق، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، اورنگ آباد دکن، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء

مولوی عبدالحق، مکتوباتِ بابائے اردو (بنام حکیم محمد امام امامی)، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء

مولوی عبدالحق (مرتبہ)، نصرتی، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۱ء

ماہ لقا رفیق، اردو قواعد وانشاء پردازی (حصہ دوم)، لاہور، فیروزسنز، س ن

محبوب عالم خان، ڈاکٹر، اردو کا صوتی نظام، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء

محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ انگریزی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء

محمد اسلم ضیا، ڈاکٹر، علمِ عروض اور شاعری، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء

محمد انصار اللہ، ڈاکٹر، سنسکرت اردو لغت، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء

محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء

محمد ریاض، ڈاکٹر، ایران میں قومی زبان کے نفاذ کا مسئلہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

محمد سلیم، پروفیسر سید، اردو رسم الخط، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۱ء

محمد عبداللہ خان خویشگی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء

محمد یٰسین قصوری، اسرار البلاغہ، لاہور، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، س ن

محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء

محی الدین قادری زور، سید، ہندوستانی لسانیات، لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۹۳ء

مختار الدین احمد، عبدالحق، دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۲ء

مسعود ہاشمی، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، دہلی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

معراج نیّر، ڈاکٹر سید، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فن اور شخصیت، لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۵ء

معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید، نقدِ عبدالحق، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، اردو لغت، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

مقبول الٰہی، اردو میں مستعمل عربی و فارسی ضرب الامثال، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء

میر محمد عترت اکبر آبادی، اردو فارسی کا ایک قدیم لغت _ کمال عترت، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۹ء

نجم الغنی رامپوری، مولوی، بحر الفصاحت (حصہ اول)، لاہور، مجلسِ ترقی اردو، ۱۹۹۹ء
نجم الغنی رامپوری، مولوی، بحر الفصاحت (جلد دوم)، لاہور، مجلسِ ترقی اردو، ۱۹۸۹ء
نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء
نصیر حسین خان خیال، داستانِ اردو، حیدر آباد (دکن)، ادارۂ اشاعتِ اردو، س ن
نور الحسن نیّر، مولوی، نور اللغات (جلد اول)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
نور الحسن نیّر، مولوی، نور اللغات (جلد دوم)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
وارث سرہندی، زبان و بیان (لسانی مقالات)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء
وارث سرہندی، علمی اردو لغت، لاہور، علمی کتاب خانہ، ۱۹۹۶ء
وارث سرہندی، کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد دوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء
وارث سرہندی، کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد سوم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
وارث سرہندی، کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد ششم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
وارث سرہندی، کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (جلد ہفتم)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء
وحید الدین سلیم، مولوی، وضع اصطلاحات، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۴ء
ہاشمی فرید آبادی، سید (مرتبہ)، پنجاہ سالہ تاریخِ انجمنِ ترقی اردو، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء
ہاشمی فرید آبادی، سید، تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اول)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء
ہاشمی فرید آبادی، سید، تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد دوم)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء

☆☆☆